URDU NOVELON MEIN ASRI MASAIL 1960 KE BAD
(1960-1980)

THE CONTEMPORARY ISSUES IN URDU NOVELS AFTER 1960

(1960-80)

THESIS

SUBITTED TO THE UNIVERSITY OF HYDERBAD IN PARTIAL FULFILMENT OF THE REQUIREMENT FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY IN URDU

SUBMITTED BY

TAHSEEN UNNISA

M.A.M.Phill

Supervisor By

MOHD BAIG EHSAS

Prof.,Head, Dept. of Urdu

University of Hyderbad

.ork2011\Un.
,nyderabad-unive
not found.

DEPARTMENT OF URDU

SCHOOL OF HUMANITIES.

UNIVERSITY OF HYDERABAD

2011

اردو ناولوں میں عصری مسائل 1960 کے بعد
(1960ء تا 1980ء)

مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

۲۰۱۱ء

نگران

پروفیسر محمد بیگ احساس

صدر شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد

مقالہ نگار

تحسین النساء

ایم اے، ایم فل

.ork2011\Un.
.nyderabad-unive
not found.

شعبہ اردو اسکول آف ہیومانٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۴۶

CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled ***"URDU NOVELON MEIN ASRI MASAIL 1960 KE BAD, (1960-1980),(THE CONTEMPORARY ISSUES IN ,URDU NOVELS AFTER 1960***,(1960-80)". Submitted by ***TAHSEEN UNNISA*** bearing **Reg.No. 06HUPH06** in partial fulfillment of the requirements of the award of Doctor of Philosophy in Urdu is a bonafide work carried out by her under my supervison and guidance.

The thesis has not been submitted previously in part or in part of in full to this or any other University or Institution for the award of any degree or diploma.

Date:

Signature of the Supervisor

Countersigned

Head of the Department

Dean of the School

DECLARATION

I ***TAHSEEN UNNISA*** here by declare that this thesis entitled ***"URDU NOVELON MEIN ASRI MASAIL 1960 KE BAD, (1960-1980),(THE CONTEMPORARY ISSUES IN ,URDU NOVELS AFTER 1960,(1960-80)"***. Submitted by me under the gurdance and supervision of ***Professor Mohd. Baig Ehsas*** is a Bonafide research work. I also declare that it has not been submitted preveiously in part or in full this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma.

Name: ***TAHSEEN UNNISA***

Date:

Signature of the Student
Regd.No.06HUPH06.

فہرست ابواب

پیش لفظ

باب اول:

سماجی وسیاسی پس منظر

باب دوم:

اردو ناول 1960ء سے قبل

i) ابتداء سے 1900ء تک کی ناول نگاری

ii) 1900ء سے 1936ء تک کی ناول نگاری

پریم چند اور دوسرے ناول نگار

iii) ترقی پسند تحریک اور اردو ناول نگاری

اہم ناول نگار اور ان کے نمائندہ ناول

iv) تقسیم ہند سے 1960ء تک کے چند اہم ناول نگار اور ان کے ناول

باب سوم:

اردو ناولوں میں عصری مسائل 1960ء کے بعد

(1960-80ء)

i) جاگیردارانہ طبقہ کے مسائل

ii) تحریک آزادی کا مسئلہ

(iii تقسیم ہند

(iv فسادات

(v ہجرت کے مسائل

(vi کسانوں کے مسائل

(Vii عورتوں کی سماجی حیثیت اوران کے مسائل

(Viii عصمت فروشی کا مسئلہ

(ix نفسیات اور جنس

(X نسلی مسائل

(xi غریبی ومفلسی

(xii مادیت پرستی وبے اعتنائی کا مسئلہ

باب چہارم:

اختتامیہ

☆☆☆

پیش لفظ

کہانی سننے کا شوق انسان کو ازل سے ہی رہا ہے۔ جس کی تسکین وہ کبھی داستانوں کبھی مثنویوں کبھی حکایات کے ذریعہ کرتا رہا، علمی اور تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کا یہ ذوق بھی نکھرتا گیا اور وہ کہانی کو حقیقی زندگی اور انسانی مسائل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مربوط دیکھنے کا خواہشمند ہوتا گیا۔ جس کے نتیجے میں قدیم داستانوں اور حکایتوں کا چلن ختم ہوگیا۔ عصر حاضر کے انسان کا علم وعقیدہ داستانوں اور حکایتوں کے مافوق الفطرت کرداروں کے چمتکار کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ وہ چاہتا ہے کہ ادب ہو یا آرٹ، مسائل حیات کا اور انسانی زندگی کا آئنہ ہو اس کی اس امنگ کی تکمیل ناول پھر مختصر افسانہ نے کی جس میں بیک وقت کہانی بھی ہوتی ہے اور انفرادی واجتماعی زندگی کے مسائل بھی۔

ناول اردو ادب کی ایک مقبول صنف ہے۔ اردو میں ناول نگاری کی روایت انگریزی زبان سے آئی۔ 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کی سیاسی وسماجی زندگی میں انقلاب آیا۔ جن مختلف اسباب کی بنیاد پر ہندوستانیوں کو اس جدوجہد میں شکست اور انگریزوں کو کامرانی حاصل ہوئی تھی۔ ان میں سب سے اہم وجہ ہندوستانیوں کی علم وتمدن کی نئی روشنی سے محرومی اور انگریزوں کا نئے علوم سے آراستہ ہونا تھا۔ ایجادات انکشافات اور صنعت وحرفت کے میدانوں میں یوروپ کی قوم کی ترقی دیکھ کر ہندوستان کے بعض باشعور افراد کے دلوں میں بھی ترقی کی تمنا کروٹیں لینے لگی۔ کچھ سماجی مصلحین جیسے ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے اور مسلمانوں میں سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کی

کوششوں سے ہندوستانی قوم میں مغربی علوم وفنون کی تحصیل کا جذبہ بیدار ہوا۔ چنانچہ ہندوستانی معاشرے کے مغربی علوم سے ہمکنار ہونے کے نتیجہ میں یہاں کی سماجی وتہذیبی زندگی کے علاوہ ادب میں بھی تبدیلیاں آئیں اردو ادب نے مغربی ادب،مغربی اصناف ادب سے نہ صرف اثر قبول کیا بلکہ خوشہ چینی بھی کی۔ اسی دور میں اردو ناول نگاری کا آغاز ہوا۔

ناول سے قبل ہمارے ادب میں داستانوں کا رواج تھا لیکن پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریز ہندوستان کی تقدیر کے مالک بن گئے۔ یہاں کی سیاسی بساط سے مقامی بادشاہوں،نوابوں اور راجاؤں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ ہندوستانی سماج و معاشرے کو بدلے ہوئے سیاسی وتہذیبی حالات میں زندگی کے نئے مسائل اور نئی کش مکش کا سامنا تھا جس کا اظہار داستانوں میں ناممکن تھا۔ چناچنہ ناول کی شکل میں زندگی کے مسائل کی ترجمانی کا نیا وسیلہ اور نیا قرینہ ادیبوں کے ہاتھ آیا۔ اردو کے ابتدائی دور کے ناولوں کا مزاج اور مذاق انگریزی کے ناولوں کی طرح اصلاحی اور تاریخی رہا۔ مابعد اس کی روایت میں کافی توسیع ہوئی اور اس میں بہت سے تجربات کیے گئے۔ الغرض ناول صنعتی دور کی پیداوار ہے اور اس کا سماج اور سماجی مسائل سے بڑا گہرا رشتہ ہے، بلکہ یہ کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا کہ سماج اور سماجی مسائل کے اظہار کے لیے ہی ناول کی صنف وجود میں آئی ہے۔

پی ایچ ڈی میں داخلہ کے بعد سب سے پہلے مجھے جس مرحلہ سے گذرنا پڑا، وہ موضوع کا انتخاب تھا۔ موضوع کے انتخاب کے لیے جب مجھ سے کہا گیا تو میں نے اپنے نگران، پروفیسر محمد بیگ احساس صدر شعبۂ اردو سے ''اردو ناول نگاری'' میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ دراصل میں اردو ناول نگاری میں کسی ایک عہد کو لے کر کام کرنا چاہتی تھی۔ لہٰذا میرے استاد محترم نگران نے مجھے 1960ء کے بعد اردو

ناول میں عصری مسائل پر کام کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ اس کام کے لیے 60 تا 80 کے عہد کا انتخاب کروں۔ اس سلسلہ میں میں نے شعبۂ کے دیگر اساتذہ سے بھی مشورہ کیا۔ سبھی اساتذہ نے میرے اس موضوع کو سراہا اور مجھے اس موضوع پر کام کرنے کی صلاح دی اور اس طرح سے میرا موضوع ''اردو ناولوں میں عصری مسائل 1960ء کے بعد (80-1960)'' طئے پایا۔

زیرِ نظر مقالے کو میں نے چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول ''سماجی و سیاسی پس منظر کے عنوان کے تحت ہے۔ اس باب میں سماج کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ یعنی سماج کیا ہے؟ سماجی طبقات کیا ہوتے ہیں اور کیسے بنتے ہیں؟ اس سلسلے میں مختلف مکتبہ فکر کے ادیبوں اور نقادوں کے خیالات اور نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے اور انہیں کی روشنی میں ادب ادیب اور سماج کے رشتے کی وضاحت کی گئی ہے اس کے ساتھ ساتھ ان سماجی حالات کو بھی بیان کیا گیا ہے جن سے راست طور پر ادب متاثر ہوا ہے۔ اسی طرح سے اس باب کے دوسرے حصہ میں ''سیاست'' کی تعریف بیان کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سماج میں سیاست کس طرح جنم لیتی ہے اور اس سیاست و سماج سے ادب و فنون لطیفہ کس طرح متاثر ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں کی وضاحت کے لیے مختلف ماہرین کی آرا پیش کی گئی ہیں۔ اس طرح ادب، زندگی اور سیاست کے رشتے پر بالخصوص بحث کرتے ہوئے 1857 کے بعد کے ان تمام سیاسی و سماجی حالات کا ایک اجمالی جائزہ لیا گیا ہے جس سے ادب متاثر ہوا ہے۔

مقالہ کا دوسرا باب ''اردو ناول 1960ء سے قبل'' سے متعلق ہے۔ اس باب کو کل چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جیسے پہلا حصہ ''ابتداء سے 1900ء تک کی ناول نگاری جس میں نذیر احمد، سرشار، شرر، رسوا وغیرہ کے ان نالوں پر بطور خاص تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے جو اپنے زمانے کے عصری

مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ ابتداء کے بیشتر ناولوں کا رجحان خالص اصلاحی رہا لیکن سرشاؔر اور شرؔر نے بعض ایسے ناول لکھے ہیں جن میں خالص عصری مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ اس باب کا دوسرا حصہ 1900 سے 1936ء تک کی ناول نگاری پر مشتمل ہے جس میں پریم چند اور دیگر ناول نگاروں کی اہم ناولوں کو عصری مسائل کے تحت زیر بحث لایا گیا ہے۔

پریم چند بیسویں صدی کے مقبول ناول نگار ہیں۔ وہ ادب برائے زندگی کے علمبردار تھے اور ادب اور سماج کے رشتے ان کی گہری نظر تھی۔ چنانچہ انہوں نے اردو ناول کا رشتہ سماج کے کمزور اور مظلوم طبقوں سے جوڑا اور اپنے تقریباً تمام ناولوں میں اپنے عہد کے گونا گوں مسائل کو سمیٹھا ہے، غرض یہاں پر ان کے ان تمام اہم ناولوں پر اس عہد کے تمام سیاسی و سماجی حالات کے تناظر میں ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ پریم چند کے علاوہ اس عہد کے جن ناول نگاروں کے ناولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ راشد الخیری، مرزا محمد سعید، نیاز فتحپوری، پنڈت کشن پرشاد کول علی عباس حسینی، قاضی عبد الغفار، مجنوں گورکھپوری، عظیم بیگ چغتائی وغیرہ ہیں ان تمام ناول نگاروں کے ان اہم ناولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو اپنے عہد کے سیاسی و سماجی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔

اس باب کے تیسرے حصہ میں ترقی پسند تحریک اور اردو ناول نگاری کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ سب سے پہلے ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی، پھر اس تحریک کے ذریعہ اردو ادب میں جو نظریات و تصورات آئے اس پر نظر ڈالی گئی، جس سے متاثر ہو کر اردو ادب ایک نئے موڑ سے روشناس ہوا۔

یوں تو ترقی پسند تحریک نے کم و بیش اردو ادب کے تمام اصناف کو متاثر کیا ہے، لیکن جن اصناف کو

اس تحریک کے ذریعہ زیادہ فروغ حاصل ہوا وہ، نظم، افسانہ، ناول اور تنقید ہے ناول کا فن چوں کہ زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کے لیے سب سے موزوں فن ہے اور شروع ہی سے اردو ناول کی بنیاد زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی ہی رہی ہے، ترقی پسند تحریک کے بعد اردو ناول زندگی اور اس کے تمام مسائل سے ہمکنار ہوا اور نئے علوم، نظریات وتصورات اور عصری شعور سے اردو ناول نے اپنے دامن کو وسیع کیا۔ چنانچہ یہاں پر ترقی پسند ناول نگاری کے ان اہم ناول نگاروں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اس دور میں اردو ناول نگاری کو ایک نئے موڑ سے روشناس کروایا جیسے سجاد ظہیر، کرشن چندر، عزیز احمد، عصمت چغتائی، صالحہ عابد حسین، اوپیندر ناتھ اشک وغیرہ غرض ان تمام ناول نگاروں کے اہم ناولوں میں اس عہد کے تمام سیاسی، سماجی و معاشرتی مسائل ملتے ہیں، جیسے غلامی کا کرب، آزادی کی آرزو، طبقاتی کش مکش، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی درندگی غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کا استحصال، غربت، افلاس، بیکاری، سماجی و معاشی انتشار، بے اطمنانی، جنسی گھٹن، سماجی بدعنوانیاں، قدروں کی شکست وریخت، قومی اتحاد فرقہ وارانہ ہم آہنگی، انسان دوستی وغیرہ۔

ترقی پسند ناول نگاری کے بعد 1947ء سے 1960ء تک کی ناول نگاری پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ 1947ء کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں کئی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے اس سال نہ صرف ہندوستان کی تاریخ کے صفحات بدل دیئے بلکہ ہندوستانی تہذیب، معاشرہ، دِل و دماغ اور انداز فکر کو نئی جہت عطا کی۔ ملک نے ایک نئے نظام حیات کی طرف قدم بڑھایا۔ جس میں انداز فکر طرز عمل، محسوسات، شعور اور تخیل سب بدلے نظر آئے سالہا سال کی پرانی قدروں نے دم توڑ دیا۔ اور نئی قدروں نے ان کی جگہ لے لی غرض 1947ء کے بعد اردو ناول پھر سے ایک نئے موڑ سے روشناس ہوا۔ جہاں

پر ایک طرف ملک کی آزادی اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل ،قتل و خون فرقہ وارانہ فسادات ، انسانیت سوز مظاہرے ،سرحدی جھگڑے ،رشوت ستانی اور روز بروز بڑھتی ہوئی تہذیبی قدروں کی شکست ،معاشی بدحالی غرض ایسے کئی مسائل اردو ناول کے سامنے آئے۔تقسیم کے بعد لکھنے والے ناول نگاروں نے ان تمام مسائل کی عکاسی اپنے ناولوں میں کی ہے۔اس عہد کے لکھنے والے اہم ناول نگاروں میں رمانند ساگر،قرۃ العین حیدر،احسن فاروقی ،شوکت صدیقی ،حیات اللہ انصاری،عبداللہ حسین ، قاضی عبدالستار،انتظار حسین ، جمیلہ ہاشمی ،رضیہ سجاد ظہیر،کرشن چندر،صالحہ عابد حسین وغیرہ ہیں۔

تیسرا باب ''اردو ناولوں میں عصری مسائل 1960ء کے بعد''(1960ء تا 1980ء) ہے۔ یہ مقالے کا اہم باب ہے جس میں میں نے 60 تا 80 کے درمیان لکھے گئے چند اہم منتخب ناولوں کے ذریعہ اس عہد کے چند نمائندہ عصری مسائل کو پیش کیا ہے۔ جو اس دور میں بیشتر اردو ناولوں کے نمائندہ موضوعات رہے ہیں۔اس سلسلہ میں میں نے جب 60 تا 80 کے درمیان لکھے گئے ناولوں کا مطالعہ کیا تو مجھے ایسا لگا کہ اس بیس (20) برس کے عرصہ میں تین طرح کے ناول لکھے گئے ہیں۔ایک وہ ناول جن کا موضوع صف ملک کی تقسیم اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سیاسی وسماجی حالات رہا۔دوسرے وہ ناول جو خالص سماجی مسئلوں سے متعلق ہیں۔تیسرے وہ ناول ہیں جو تقسیم ہند سے پیدا ہونے والے سیاسی وسماجی مسائل کے علاوہ دیگر عصری مسائل کی بھی عکاسی کرتے ہیں جو اردو ناول نگاری کے ہر دور میں ناول کے خاص موضوع رہے ہیں۔چنانچہ میں نے اس 60 تا 80 کے درمیان لکھے گئے اُن ناولوں کا انتخاب کیا جو تقسیم ہند اور اس سے پیدا شدہ مسائل کے علاوہ دیگر اہم سماجی مسائل کی بھی عکاسی کرتیں ہوں۔ جیسے،''ایک عورت ہزار دیوانے (کرشن چندر)۔''تلاش بہاراں''

(جمیلہ ہاشمی) ''ایک چادر میلی سی'' (بیدی) ''معصومہ'' (عصمت چغتائی) '' آنگن'' (خدیجہ مستور'' '' کالاشہر گورے لوگ'' (احسان الحق) ''بہت دیر کردی'' (علیم مسرور) ''ایوان غزل'' (جیلانی بانو) '' گوری سوئے سیج پر'' (صالحہ عابد حسین) '' آخری شب کے ہمسفر'' (قرۃ العین حیدر)۔ان منتخب ناولوں کے ذریعہ میں نے جن عصری مسائل کو پیش کیا ہے وہ '' جاگیردارانہ طبقہ کے مسائل تحریک آزادی کا مسئلہ، تقسیم ہند، فساد، ہجرت کے مسائل، کسانوں اور مزدوروں کے مسائل، عورتوں کی سماجی حیثیت اور ان کے مسائل، جسم فروشی و فحاشی کا مسئلہ، نفسیات اور جنس، نسلی مسائل، غریبی و مفلسی، مادیت پرستی و بے اعتنائی کا مسئلہ وغیرہ۔

1960ء کے بعد جاگیردارانہ طبقہ کے مسائل کو جیلانی بانو نے ناول ''ایوان غزل'' کے ذریعہ پیش کیا جس میں دوسری جنگ عظیم سے لے کر سقوطِ حیدر آباد تک کے حالات کے ساتھ ساتھ حیدر آباد کے رئیسوں کی عیاشیاں، کمزوروں پر مظالم وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔اس عہد میں تحریک آزادی کے مسئلے کو جمیلہ ہاشمی نے ''تلاش بہاراں'' خدیجہ مستور نے '' آنگن'' اور قرۃ العین حیدر نے '' آخری شب کے ہمسفر'' میں پیش کیا۔تحریک آزادی کی جھلک ہمیں ''ایوانِ غزل میں بھی دکھائی دیتی ہے۔تحریک آزادی کے بعد اس عہد کے نمائندہ ناولوں کا ایک اہم موضوع تقسیم ہند بھی رہا ہے۔ جیسے ناول '' آخر شب کے ہم سفر میں جگہ جگہ ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے تقسیم ہند کے اسباب کا پتہ چلتا ہے۔اس طرح ناول '' آنگن'' بھی تقسیم ہند پر آکر ختم ہوتا ہے۔ تقسیم ہند کے حادثہ کو جمیلہ ہاشمی نے'' تلاش بہاراں'' میں ایک المیہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں پھوٹ پڑے فسادات بھی اس عہد کے ناولوں میں ایک اہم موضوع بن کر ابھرے ہیں، جیسے ناول ''ایوان غزل'' میں ملک بھر میں

پھیلے فسادات کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے، ناول ''تلاش بہاراں'' کا اختتام ہی فسادات کے المناک واقعے پر ہوتا ہے،ناول ''آنگن'' میں بھی تقسیم کے جلو میں آئے فسادات اور خوں ریزی کا ذکر بے حد کرب کے ساتھ کیا گیا ہے۔

تقسیم اور فسادات کا فوری نتیجہ ہجرت کی صورت میں ظاہر ہوا جس سے دونوں ممالک کے لوگوں کئی ایک مسائل کا سامنا کرنا پڑا جس کی عکاسی ناول ''آنگن'' میں کی گئی ہے۔تقسیم ہند کو لے کر پیدا ہونے والے ان حالات وواقعات کے علاوہ اس عہد کے ناولوں میں پیش کردہ دیگر عصری مسائل میں کسانوں اور مزدوروں کے مسائل،عورتوں کی سماجی حیثیت اور ان کے مسائل،جسم فروشی وفحاشی کا مسئلہ نفسیات اور جنس،نسلی مسائل،غریبی ومفلسی مادیت پرستی و بے اعتنائی کا مسئلہ وغیرہ اہم ہیں۔بیدی کا ناول ''ایک چادر میلی سی'' دیہی اور قصباتی زندگی کے مسائل کی عکاسی کرتا ہے،کسانوں اور محنت کشوں کے استحصال کو''ایوان غزل''میں بھی پیش کیا گیا ہے،اسی طرح،عورتوں کی سماجی حقیقت اور ان کے مسائل کو،اس عہد میں''ایوانِ غزل''ایک چادر میلی سی،معصومہ،تلاش بہاراں،آنگن،وغیرہ ناولوں میں ایک اہم موضوع بنایا گیا۔فحاشی وجسم فروشی کے مسئلہ پر اس عہد میں''ایک عورت ہزار دیوانے،معصومہ، بہت دیر کردی،وغیرہ قابل ذکر ناول ہیں۔

اسی طرح نفسیاتی وجنسی مسئلہ پر اس عہد میں''ایک چادر میلی سی،معصومہ، بہت دیر کردی، کالا شہر گورے لوگ،وغیرہ نمائندہ ناول ہیں۔1960ء کے بعد نسلی مسائل کو بھی اردو ناولوں میں موضوع بنایا گیا جیسے عزیز احمد کا ناول ''تیری دلبری کا بھرم'' قرۃ العین حیدر کا ناولٹ چائے کے باغ، حیات اللہ انصاری کا ناول''مدار''اور احسان الحق کا ناول '' کالا شہر گورے لوگ''وغیرہ لیکن اس نسلی مسئلہ کے تحت

یہاں صرف ایک ناول ''کالاشہر گورے لوگ'' کا انتخاب کیا گیا ہے۔غریبی و معاشی پریشانی بھی اس عہد کے ناولوں کا ایک اہم موضوع رہا ہے، جیسے منتخبہ ناولوں میں ''ایوانِ غزل'' تلاش بہاراں، بہت دیر کردی، گوری سوئے سیج پر، وغیرہ غریبی و مفلسی کے مسئلے کی عکاسی کرتے ہیں۔اس عہد کے نمائندہ مسائل میں ایک اہم مسئلہ مادیت پرستی و بے اعتنائی کا بھی ہے۔جس کی نمائندگی اس عہد میں ''ایوان غزل'' گوری سوئے سیج پر،وغیرہ ناول کرتے ہیں۔

چوتھاباب اختتامیہ ہے جس میں گذشتہ ابواب کے مباحث کامختصر خلاصہ کیا گیا ہے۔

اس مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کاشکرادا کرتی ہوں جو بڑا مہربان ہے جس نے مجھ پر علم کی منزلیں کشادہ کیں اور یہ مقالہ لکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔اس کے بعد میں صدر شعبۂ اردو اور استاد محترم و نگران پروفیسر محمد بیگ احساس صاحب کاشکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنھوں نے دوران تحقیق بھر پور وقت اور تعاون دیا اور کتابوں کی فراہمی سے لے کر مقالہ جمع کرانے تک کی دوڑ دھوپ میں میری مدد و رہنمائی کی۔ان کے لیے بس دل سے دعائیں ہی نکلتی ہیں میں شعبہ کے دیگر اساتذہ میں سب سے پہلے پروفیسر محمد انورالدین صاحب کاشکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں، جنھوں نے دوران تحقیق اپنے مفید مشوروں سے نوازا پروفیسر محمد انورالدین صاحب کے اس مخلصانہ تعاون کے لیے میں ان کی ممنون و مشکور ہوں، میں پروفیسر مظفر شہ میری صاحب کی بھی تہہ دل سے شکر گذار ہوں جنھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے مفید مشورے دیئے اور ناقدانہ رہنمائی کی۔میں ڈاکٹر عرشیہ جبیں صاحبہ کی بھی شکر گزار ہوں۔ڈاکٹر رضوانہ معین صاحبہ بھی میرے شکریہ کی مستحق ہیں جنھوں نے وقت پر کام کرنے کا مشورہ دیا اور میری حوصلہ افزائی کی۔میں ڈاکٹر حبیب نثار صاحب کی بھی سپاس گذار ہوں جنھوں نے

مجھ میں پابندی وقت اور تحقیق کے لیے محنت اور مشقت کرنے کا جذبہ پیدا کیا اور میری رہنمائی کی اسی طرح میں شعبۂ کے دیگر تمام اساتذہ کی بھی ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے تحقیق کے ہر موڑ پر میری حوصلہ افزائی کی اور تحقیقی اصولوں سے مجھے آگاہ کیا۔ اسی طرح میرے شعبۂ سے ہٹ کر دیگر اساتذہ میں پروفیسر خالد سعید، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ڈاکٹر حشمت فاتحہ خوانی لکچرر کرناٹک کالج بیدر، ظہیر احمد خان، لکچرر کرناٹک کالج بیدر، ڈاکٹر فاروق احمد پرنسپل گورنمنٹ فرسٹ گریڈ کالج بیدر، ڈاکٹر شمس الدین لکچرر، مشتاق احمد مشتاق لکچرر کی بھی میں تہہ دل سے شکر گذار ہوں جنہوں نے اس تعلیمی سفر میں ہر قدم پر میری رہنمائی کی۔ میں جناب جے راج چتورے صدر نشین راجیو گاندھی کالج بیدر اور پرنسپل ماروتی ڈانگے راجیو گاندھی کالج بیدر اور میری ساتھی اساتذہ سر دیوی میڈیم اور ریکھا میڈم کی بھی شکر گذار ہوں۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے والدین اور تمام افراد خاندان کا شکریہ ادا نہ کروں، اس سلسلے میں سب سے پہلے اپنے والد محترم جناب سید بشیر احمد قادری متولی درگاہ سید داؤدؒ موضع کارامنگی، تعلقہ نارائن کھیڑ ضلع میدک اور والدہ محترمہ سیدہ عظیم النساء کی ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے میری ابتدائی تعلیم و تربیت سے لے کر آج تک اس بات کا خیال رکھا کہ عقائد کے ساتھ ساتھ زبان وادب کی بھی آبیاری ہوتی رہے اس کے لیے الفاظ میں وہ قوت نہیں ہے کہ میں ان کا شکریہ ادا کرسکوں۔ میں میرے چاچا سید مشیر احمد قادری کی بھی شکر گذار ہوں۔ گھر کے دیگر تمام افراد میں بالخصوص میری بڑی بہن سیدہ تسلیم النساء اور بہنوئی وزیر خان کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جن کے تعاون کی وجہ سے میرا یہ تعلیمی سفر نسبتاً آسان ہوگیا۔ میں میری دیگر بہنیں سیدہ تبسم النساء، سیدہ تسکین النساء، سیدہ تنویر، سیدہ تمرین، بھائی،

سید ظہور احمد، سید منظور احمد، سید ضیاء احمد کی بھی ممنون و مشکور ہوں جن کا تعاون ہر وقت میرے ساتھ رہا اور ہر مشکل گھڑی میں میری حوصلہ افزائی کی اور میرے حق میں دعا کی۔ میرے مرحوم چاچا سید نصیر احمد قادری اور میری مرحوم پھوپی زاد بہن مہر النساء کا بھی میں شکر ادا کرتی ہوں جنھوں نے اپنی حیات میں ہمیشہ میرے حق میں دعا کی، میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی مغفرت کے لیے دعا کرتی ہوں۔

میں اپنے ان تمام ساتھیوں کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا اخلاقی فرض سمجھتی ہوں جنہوں نے تحقیق کے دوران میرا ساتھ دیا۔ خصوصاً سید ماجد بگدل لکچرر، اسمٰعیل خان لکچرر، عطیہ بیگم لکچرر، زرینہ، غوثیہ بانو، عائشہ، فضیلت بیگم، فریدہ تبسم، عباس علی محمد معین، جمیل بھائی لکچرر، راشد قادری لکچرر، افتخار قادری لکچرر اور دیگر تمام دوست احباب کی بھی شکر گذار ہوں۔

آخر میں میں اس مقالے کے کمپوزر جناب محمد مخدوم محی الدین صاحب اور ان کے فرزند جناب محمد کلیم محی الدین صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے رات دن اس مقالے کو کمپوز کیا اور وقت پر مقالہ داخل کرنے میں میری مدد کی۔

"شکریہ"

تحسین النساء

☆☆☆

باب اول

سماجی و سیاسی پس منظر

سماجی پس منظر

سماج:

''انسان ایک سماجی جانور ہے بقول ارسطو'' "Man is the social animal" سماج نہ صرف فرد کی بقاء اور نشو ونما کے لیے ضروری ہے بلکہ اس کے بغیر انسانی وجود کا تصور ہی دشوار ہے۔

سماج کے لغوی معنی ''فرہنگ آصفیہ'' میں کچھ اس طرح سے درج ہیں۔

''سبھا، انجمن، مجلس، محفل، سوسائٹی، گروہ، جتھا، ٹولی، منڈلی''۔ 1

اسی طرح سے اردو لغت اور فیروز للغات میں بھی کچھ اس طرح کے معنی ہیں۔

''معاشرہ، سوسائٹی، انجمن، کمیٹی، محفل، گروہ، جتھا، ٹولی، منڈلی'' وغیرہ۔ 2

عبدالقادر عمادی اپنی کتاب ''سماج اور تعلیم میں سماج کو زندگی کا آئینہ اور جینے کا سلیقہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

'' دراصل سماج انسان کو جینے کا سلیقہ سکھاتا ہے اور ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے استفادہ حاصل کر کے زندگی کو بہتر بناتا ہے ہر فرد اپنی زندگی کو سماج کے آئینہ میں دیکھتا ہے۔ اور اسی کے مطابق اپنے برتاؤ اور اعمال کو سنوارتا ہے۔ سماج عملی اعتبار سے کوئی خارجی حقیقت نہیں ہے۔ حقیقت دراصل افراد ہی ہوتے ہیں لیکن مشترک تمدنی ورثہ، زبان برتاؤ اور روایات کی وجہ سے وہ ایک غیر مرئی بندھن میں بندھے ہوتے ہیں۔ جن تعلقات اور رشتوں کے تانے بانے میں افراد منسلک ہوتے ہیں اسی کو سماج کہتے ہیں''۔ 3

مورس گنیز برگ (Morris Ginsberg) نے بھی سماج کو ایک مخصوص افراد کا مجموعہ کہتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

1 ۔ فرہنگ آصفیہ۔ مولوی احمد دہلوی۔ ص: 94

2 ۔ فیروزاللغات ۔ مولوی فیروزالدین۔ ص: 808

3 ۔ سماج اور تعلیم'' عبدالقادر عمادی۔ صفحہ نمبر 35

''سماج افراد کا ایسا مجموعہ ہے جو مخصوص تعلقات اور برتاؤ کے طریقوں میں
بندھے ہوئے ہوتے ہیں اور اسی بنیاد پر وہ ان دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتے
ہیں جو ان تعلقات کو اختیار نہیں کرتے یا جو برتاؤ میں ان سے الگ ہوتے ہیں''

1

مورس گنیز برگ (Morris Ginsberg) کے یہ بیان کردہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سماج انسانوں کا ایک منظّم گروہ ہوتا ہے جن کے اغراض ومقاصد میں مماثلت اور مشابہت پائی جاتی ہے ''گڈنگس'' (Giddings) نے بھی اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سماج کی تعریف یوں بیان کی ہے:

''سماج آپس میں تعاون کرنے والے افراد کے رسمی تعلقات کے مجموعہ کا نام
ہے یہ ایک تنظیم اور اتحاد ہے جس کے تحت افراد ایک دوسرے سے منسلک ہوتے
ہیں''۔ 2

مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج دراصل کوئی مادی حقیقت نہیں بلکہ یہ اجتماعی کوششوں سے پیدا شدہ زندگی کا ایک ایسا نمونہ ہے جس پر افراد عمل کرتے ہیں ہر سماج کی زندگی کا ایک جداگانہ طرز ہوتا ہے کیونکہ ہر سماج کے افکار اعمال اور تجربات کی ایک الگ دنیا ہوتی ہے چنانچہ رائیٹر (Reuter) نے بھی سماج کی تعریف کرتے ہوئے کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''جس طرح زندگی کسی شئے کا نام نہیں بلکہ یہ حیات کا ایک سلسلہ ہے اسی
طرح سماج بھی کسی شئے کا نام نہیں بلکہ اشتراک عمل کا ایک طریق ہے''۔ 3

مذکورہ بالا تعریفات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان سماجی آپسی تعلقات اور تجربات کا ایک مسلسل طریق ہے جس پر افراد نسلاً بعد نسل عمل کرتے رہتے ہیں۔ لیکن سماج کوئی جامد حقیقت نہیں یہ ایک متحرک حقیقت ہے

1۔ مشمولہ: سماج اور تعلیم۔ عبدالقادر عمادی۔ ص: 36

2۔ تعلیم سماج اور کلچر۔ اے، کے، سی، او۔ ص: 36

3۔ مشمولہ: سماج اور تعلیم۔ عبدالقادر عمادی۔ ص: 36

یعنی ہر زمانہ میں مسلسل بدلتا رہتا ہے۔انسانی زندگی جس طرح ترقی کرتی گئی اس طرح سے سماج کی مختلف شکلیں بدلتی گئیں جیسے ابتدائی انسانی سماج،شکار، گاہی سماج، خانہ بدوشی سماج،ابتدائی زرعی سماج، زرعی سماج، شہنشاہی سماج، مذہبی سماج،اور جدید سماج، وغیرہ۔

انسانی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جب دنیا میں آیا تو سب سے پہلے اسے تین مادی ضرورتیں در پیش ہوئیں، پہلی کھانے کی، دوسری سر چھپانے ٹھکانے کی، تیسری تن ڈھانکنے کی۔ابتداء میں اس نے جنگلی پھلوں سے اپنی بھوک مٹائی، درختوں کے پتوں سے اپنے جسم کی حفاظت کی اور جنگلی جانوروں سے بچنے کے لیے درختوں کی شاخوں پر اپنا گھر بنایا۔شروع میں سب بذات خود چھوٹے چھوٹے جانوروں کے شکار سے اپنا پیٹ بھرا اور مختلف موسموں کی سختیوں سے بچنے کے لیے غاروں میں رہنا شروع کیا۔ دھیرے دھیرے انسان نے جب پتھروں کے ذریعہ بڑے جانوروں کا شکار کیا تو اسے شکار کو اپنی رہائش گاہ تک لانے کی فکر ہوئی، اس فکر اور دوسری ضرورتوں کے نتیجے میں سب کو ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت پڑی، دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسے سماج کی ضرورت محسوس ہوئی۔مختلف ضروریات نے انسان کو ایک دوسرے سے قریب کیا اب انسان ایک دوسرے کی مدد کرنے لگا۔جس سے سب کی مادی ضرورتیں پوری ہونے لگیں،اس میں ہمدردی اور ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ پیدا ہوا اس جذبے کے نتیجے میں ایک فرد کے لائے ہوئے ایک ہی شکار سے کئی لوگ اپنی بھوک مٹانے لگے اور گروہ (قبیلے) بنا کر رہنے لگے۔ انسان نے نہ صرف قبیلے کی شکل میں رہنا شروع کیا بلکہ اس نے پتھروں سے آگ پیدا کی،لباس کی شکل میں پہلے درختوں کے پتے پھر چمڑے کا استعمال کیا، پتھروں اور لکڑیوں سے ہتھیار بنائے اور کاشت کاری شروع کی، انسانی تاریخ کی سب سے بڑی دین کاشت کاری کی ابتداء ہے۔

انسانی تہذیب اور سماج کے فروغ کے ساتھ ساتھ سماج میں سماجی نابرابری بڑھتی گئی اور انسانی سماج طبقات میں تقسیم ہوگیا۔اس کا دارومدار مادی دولت کی پیداوار پر منحصر ہوگیا۔سماج کے اعلیٰ اور ادنیٰ درجات

میں منقسم ہوتے ہی سماج کا نظام اپنا توازن کھونے لگا۔سماجی نظام کو برقرار رکھنے اوراس میں نظم وضبط قائم کرنے کے لیے جن طریقوں کو اختیار کیا گیا۔اس طریقہ کار کو ہم سیاست کہہ سکتے ہیں دراصل سیاست کا بنیادی مقصد ملک ومعاشرے میں نظم وضبط برقرار رکھنا ہے۔

سیاست کا وجود سماجی نابرابری یا طبقاتی سماج کے سبب ہوا اور سماج میں استحصال،قتل وغارت گری کا آغاز ہوا۔دولت،طاقت اوراقتدار کی وجہ سے طاقت ور طبقے نے کمزور طبقوں کو دبانا شروع کیا تو سماج میں کمزور طبقے کی حفاظت کو مدِ نظر رکھ کر سماج نے سیاست کا انتظام کیا۔دوسرے لفظوں میں سیاست سماج کی ایک اہم ضرورت بن گئی۔اگر سیاست کا وجود نہ ہوتا تو سماج میں سب کو یکساں رہنے کا حق اور آزادی کا حق نہ مل پاتا،سیاست کے ذریعہ سماج میں ہر شخص کو برابر کے حقوق دیئے گئے۔سیاست کی ابتداء کے متعلق ٹامس ہابس (Thoms Hobbes) اورروسو نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''اسٹیٹ سے پہلے نراج کا دوردورہ تھا جس طرح مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہیں اسی طرح جسمانی اعتبار سے طاقتور اشخاص کمزوروں پر ظلم وستم کرتے رہتے تھے اسی صورت حال سے عاجز آکر لوگوں نے بادشاہ کو مقرر کیا اور اس کی اطاعت قبول کی''۔ [1]

ٹامس ہابس نے اپنی کتاب(The book of levia than)میں لکھا ہے:

''فطری حالت میں انسان ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے تھے اور بھوکے بھیڑیوں کی طرح ایک دوسرے کو ہڑپ کرنے کی کوشش میں رہتے تھے اس میں کمزور کو سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔اس زمانے میں صرف ایک ہی قانون تھا یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا یعنی قوت کے بل پر ہر چیز کا فیصلہ ہوتی تھا۔اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی خواہش نے بالآخر لوگوں کو اس قسم کی زندگی کو خیرباد کہنے اور سیاسی نظام قائم کرنے پر مجبور کیا اور انہیں آپس میں

1۔بحوالہ''اصول سیاست''از:ڈاکٹر محمد ہاشم قدوئی۔ص:64

معاہدہ کرنا پڑا کہ ہر شخص اپنی قوت استعمال نہ کرے گا اور سب لوگوں نے اپنی آزادی غیر مشروط طور پر حکمراں یا بادشاہ کو سپرد کر دیں"۔ 1

"Social Cootract" میں روسو سیاست کے متعلق اس طرح اظہار خیال کرتا ہے:

"جیسے جیسے انسانی تہذیب کا فروغ ہوا انسان تکلفات کا عادی ہونے لگا اور ذاتی ملکیت معرض وجود میں آئی اس نے مساوات کا تقریباً خاتمہ کر دیا۔ امیر اور غریب کی نہ صرف تفریق بلکہ زبردست کشمکش شروع ہوگئی اور اس کی وجہ سے خود غرضی شروع ہوئی۔ اب امن و چین باقی نہ رہا، لوگ آزادی اور مساوات کی برکتوں سے محروم ہوگئے اس صورتِ حال کو ختم کرنے کے لیے ہر شخص نے اپنی آذاری سماج کے حوالے کر دی یہ مرضی عامہ سب لوگوں کے مشترکہ مفاد کی حفاظت کرتی تھی قانون اسی مرضی کے اظہار کا نام ہے"۔ 2

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ سماج نے معاشرے میں امن وسکون کو مدنظر رکھ کے ایک بادشاہ مقرر کیا اور اسے لوگوں کے حقوق میں جان و مال اور آزادی کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی یہیں سے سماج اور سیاست ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے۔ غرض اس سماج اور سیاست کی ترجمانی کبھی شاعری کے حوالے سے گئی تو کبھی نثر کے حوالے سے، ابتداء میں نثر نے کہانیوں اور داستان کی شکل اختیار کی لیکن جیسے جیسیط سماج کے سیاسی حالات تغیر پذیر ہوتے گئے اور زندگی نے بدلتے ہوئے سیاسی ماحول میں اپنی تمام آسائشوں کو کھودیں اور جب وہ محلوں اور خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں داخل ہوئی تو ان بدلتے ہوئے حالات میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی کیونکہ اسے یہ دنیا داستانوں کی خیالی، تصوراتی اور مافوق الفطری دنیا سے مختلف نظر آئی۔ زندگی کے لیے داستان سے حقیقت تک کا یہ سفر بالکل نیا اور طویل سفر تھا اور جب زندگی اس طویل سفر کو طے کر کے حقیقت کی دنیا میں داخل ہوئی تو ادب نے ایک نئی شکل میں اس کا

1۔ بحوالہ "اُصول سیاست" از: محمد ہاشم قدوائی۔ ص: 65

2۔ بحوالہ "اُصول سیاست" از: محمد ہاشم قدوائی۔ ص: 65

استقبال کیا اور اسے حقیقت کی دنیا میں رہنے اور جینے کا سلیقہ سکھایا۔اس طرح زندگی حقیقت کے ساتھ ساتھ سائنسی ایجادات سے بھی روشناس ہوئی۔

ادیب ایک سماجی فرد ہے وہ جس طرح کے سماج میں رہتا ہے اور سماج سے جس طرح کے اثرات قبول کرتا ہے اسی طرح کا ادب کی تخلیق کرتا ہے۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب اور سماج ایک سکہ کے دو پہلو ہیں اور دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں جب کبھی سماج میں برائیاں سر بلند کرتی ہیں اور سماج کا اخلاقی معیار گرتا ہے تو ادب سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح ادب سماج کے اخلاقی معیار کو بلند کرتا ہے۔ادب سماج کا نقاد بھی ہے اس کا کام صرف سماج کے ہو بہو تصویر کشی کرنا ہی نہیں ہے بلکہ ایک روشن مستقبل کی نشان دہی بھی کرنا ہے۔سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

> ادب زندگی کا آئینہ ہے یہی نہیں وہ کاروان حیات کا رہبر بھی ہے اسے محض زندگی کی ہمرکابی نہیں کرنا بلکہ اس کی رہنمائی بھی کرنا ہے''۔ 1

ادب کی طرح سماج بھی ادب کا نقاد ہے۔اس کا کام بھی وقت بے وقت ادب کی تنقید کرنا ہے۔جب ادب اپنے معیار سے نیچے گرنے لگتا ہے یا صحیح معنوں میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتا تو سماج اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے اور وہ ادب کے معیار کو بلند کرتا ہے۔ان دونوں کو جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ہے سیاست کسی بھی ملک کا جیسا سیاسی نظام ہوگا اسی کے مطابق اس ملک کے عوام کی زندگی ہوگی اور جس شکل سے زندگی سماج میں رونما ہوگی اس کا عکس سماج میں بخوبی نظر آئے گا۔سیاست نے ہر لمحہ ادب کو متاثر کیا ہے اور سیاست سے گہرا تعلق ہے ادب کی تصویر سماج اور سیاست کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ اس کی جڑیں سماج اور سیاست میں پیوست ہیں۔

ادب بھی گذرے ہوئے وقت کے ساتھ مختلف روپ اختیار کرتا ہے۔اس طرح فرد اپنے سماج کا نمائندہ ہوتا ہے ادیب یا فنکار بھی اوروں کی طرح سماج کا ایک فرد ہوتا ہے جس طرح ایک عام آدمی اپنے

---

1 ۔روشنائی، از: سجاد ظہیر۔ص، 71

عہد، ماحول اور سیاسی سماجی اور معاشی اتار چڑھاؤ کے دائرے میں گھومتا رہتا ہے، اسی طرح ایک ادیب بھی ان تمام باتوں سے اثرات قبول کرتا ہے، یہ ضرور ہے کہ اشیاء کو دیکھنے اور ان کو پرکھنے کے سلسلے میں اس کا انداز عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے تخلیق کردہ ادب میں زندگی اپنی تمام بوقلمونیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ عزیز احمد اس مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ادب زندگی کا پابند ہے، جو زندگی سے گریز کر ہی نہیں سکتا انقلاب سے ہمیشہ متاثر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ انقلاب کا پیش رو بھی بن جاتا ہے کیونکہ وہ صاحب دماغ آدمیوں کا آلۂ کار ہوتا ہے''۔ 1

ادیب کی کچھ سماجی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ وہ اپنے خاندان میں کچھ اور ہوتا ہے اور جہاں وہ کام کرتا ہے وہاں اس کی حیثیت مختلف ہوتی ہے۔ یعنی بیک وقت ایک فرد باپ یا بھائی بھی ہو سکتا ہے اور کسی دفتر کا کلرک یا افسر بھی۔ ایک ادیب کی دوہری ذمہ داری ہوتی ہے وہ ان رشتوں کو نبھاتے ہوئے اپنے فن کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے۔ ادیب کے اظہار کی دنیا اس کے گرد و پیش ہی کی دنیا ہوتی ہے اس کے ادب کا خام مواد وہیں سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنے ادب کا تانا بانا اپنے گرد و پیش سے الگ رہ کر تیار ہی نہیں کر سکتا۔

ادب میں ہر دور کے سماجی حالت کسی نہ کسی شکل میں منعکس ہوتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ادیب اپنے عہد کے سماجی عوامل سے متاثر نہ ہو۔ اس کے تمام تجربات اور مشاہدات شعوری یا غیر شعوری طور پر انہیں عوامل کے آئینہ دار یا پروردہ ہوتے ہیں پروفیسر احتشام حسین اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ادب اپنی بنیادی حیثیت میں انفرادی نہیں سماجی ہے جیسے سماج کے بہت سے عمل افراد کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں، لیکن اہم پہلو اس کا سماجی مواد اور موضوع ہے''۔ 1

1۔ اردو ناولوں میں سماجی مسائل کی عکاسی۔ از: ڈاکٹر محمد ایمن انصاری۔ ص۔ 18.19.20

ادیب چونکہ سماج کا ایک رکن ہوتا ہے، اس لیے اس کا مطالعہ ایک سماجی انسان کی حیثیت سے کیا جانا چاہیے۔ بظاہر اس کی زندگی ایک فرد کی زندگی ہوتی ہے، مگر وہ اپنے سماج کا ایک نمائندہ بلکہ ممتاز نمائندہ ہوتا ہے۔

ادیب جس معاشرے میں سانس لیتا ہے، اس کے سماجی عوامل اور معاشی حالات پر اس کی گہری نظر ہوتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ اس کی دور رس نگاہوں سے سماج کو کوئی بھی گوشہ پوشیدہ رہ جائے۔ یہی سماجی شعور اس کی تخلیقات کو اپنے عہد اور ماحول کا ترجمان بناتا ہے۔ اسی سماجی شعور کی بدولت درباروں سے وابستہ رہتے ہوئے بھی وہ عوام کی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج میرؔ، اور غالبؔ کی شاعری، اور میر امن اور رجب علی بیگ سرورؔ کی تخلیقات اپنی معنویت کھو چکی ہوتیں۔

یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی ادب خلا میں نہیں پیدا ہوتا۔ اس کا تخلیق کار سماج ہی کا ایک فرد ہوتا ہے۔ اسی لیے ادب کے پس منظر میں اس کا عہد سانسیں لیتا ہے اور اسی وجہ سے مختلف زبانوں کا ادب ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہوا کرتا ہے۔ جے۔ بی پرسٹیلی نے ادب کو زندگی کا آئینہ کہا ہے۔ میتھیو آرنلڈ کے نزدیک ادب زندگی کی تنقید ہے اور رینے ویلک ادب کو سماجی ادارہ قرار دیتا ہے۔

کسی بھی ادیب کا اپنے سماج سے رشتہ منقطع کرنا ادب کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ کیونکہ ادیب کوئی راہب یا جوگی نہیں، جو اپنے سماج سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرے وہ تمام انسانی زندگی سے تجربے حاصل کرتا ہے۔ اور انہیں انسانوں کی ایک بڑی جماعت کے سامنے پیش کرتا ہے اسی بات کو ہم ان الفاظ میں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ادب انسانوں کے لیے انسانوں ہی کے ذریعہ تخلیق ہوتا ہے۔ بعض اوقات لوگ ایسے ادب کو پروپگنڈے کا نام دیتے ہیں۔ مگر یہ بات صحیح نہیں۔ جان ایڈکنگس نے کہا ہے کہ:

> ''ادیب اچھا ہو یا برا، اپنی تخلیقات کو پروپگنڈے کے لیے استعمال کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، عوام اسے اس وقت تک قبول نہیں کرتے جب تک کہ اس میں فن کے

1۔ سید احتشام حسین، ذوق ادب اور شعور۔ ص: 20

ساتھ ساتھ وہ خود شامل نہ ہوں"۔ 1

اسی طرح صرف ادب کہلانے کے لیے ترتیب دیا ہوا ادب کوئی معنی نہیں رکھتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ قاری اپنی وابستگی کے بغیر کسی بھی ادب میں دلچسپی نہیں لیتا۔ علاوہ ازیں جس ادب میں لطافت کی کمی ہو اس سے بھی قاری کو دلچسپی ہو سکتی۔ اینگلز کا بھی یہی خیال ہے۔

"مصنف کے سماجی خیالات جتنے چھپے ہوئے ہوں گے، فن اتنا ہی لطیف ہوگا"۔ 2

ادیب کی زبان الہامی قرار دی گئی ہے مگر یہ الہامی زبان در پردہ زمانے اور سماج کی زبان ہوتی ہے۔ ادیب جو کچھ بھی کہتا ہے اس میں شک نہیں کہ اپنی اندرونی اپج سے مجبور ہو کر کہتا ہے جو بظاہر انفرادی چیز معلوم ہوتی ہے، لیکن دراصل یہ اپج ان تمام خارجی حالت و اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے، جس کو مجموعی طور پر ہیئت اجتماعی کہتے ہیں۔ یہی ہیئت اجتماعی قاری کے لیے باعث دلچسپی ہوتی ہے اور اس کے تاثرات کو وہ دلچسپی کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ قاری ادب یا فن میں اپنے آپ کو تلاش کرتا ہے، اپنے مسائل کا حل ڈھونڈتا، اپنے تجربات و مشاہدات کی تصدیق ادب کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے اگر ادب میں اسے یہ سب کچھ نہیں ملتا، تو وہ اسے ٹھکرا دیتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی کے تمام مسائل، تجربات اور دلچسپیاں ادب کا حصہ نہیں بن سکتیں، کیونکہ ادب نہ تو صحافت کا نام ہے اور نہ ہی ادیب صحافی ہوتا ہے ادب کی مختلف اصناف سماج کے تجربات، مشاہدات اور مسائل کو اپنے طور پیش کرتی ہیں، مگر اس میں فنکار یا ادیب کا اپنا نقطۂ نظر بھی شامل ہوتا ہے۔

ادیب اپنی تمام تر آزادی کے باوجود سماج کی قدروں کو یکسر نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ ہی ادب کے ساتھ مکر و فریب کر کے اچھے ادب کی تخلیق کر سکتا ہے۔

الغرض سماج سے ماورا ہو کر ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ جب کبھی کسی ادیب نے اعلیٰ ادب کی تخلیق کی ہے

1۔ آل احمد سرور۔ ادب اور نظریہ۔ ص، 378

2۔ اردو ناولوں میں سماجی مسائل کی عکاسی۔ ڈاکٹر محمد امین انصاری۔ ص، 23

تو اس کا تخلیق کردہ ادب براہ راست یا بالواسطہ سماج کا مظہر رہا ہے۔ ادیب کا شعور اسے سماج کی حقیقتوں کی عکاسی اور ان کی تنقید پر مجبور کر دیتا ہے۔ ادیب سماج کا ایک باشعور فرد ہوتا ہے اس کی دور بین نگاہیں سماج کی خوبیوں اور خامیوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اسی لیے ادیب اور سماج کے درمیان ہمہ وقت ایک تصادم کی کیفیت رہتی ہے اور اس کا ادب اس تصادم کے ردعمل کا نتیجہ ہوتا ہے ہنس راج رہبر کہتے ہیں:

''ادب اچھا یا برا جیسا بھی ہے زندگی کے لیے ہے اور وہ زندگی کے سماجی اور مادی حالات سے پیدا ہوتا ہے''۔ 1

کسی ادیب کی تخلیقات کا جائزہ لینے کے لیے اس عہد کے سماجی حالات کا مطالعہ بے حد ضروری ہے، کیونکہ اس کا ادب انہیں حالات کا پروردہ ہوتا ہے ۔ گذشتہ دو صدیوں میں ہماری سماجی زندگی برطانوی سامراج کے شکنجوں میں کسی رہی ہے۔ اس نے ہمارے تخلیقی سرچشموں کو ابلنے سے روکا ہے اور اپنے ذاتی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں فقط رِسنے کی اجازت دی ہے کبھی آزادی سے بہنے نہیں دیا۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے یہاں ایک حد تک صنعتی ترقی بھی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ سرمایہ داری کو بھی فروغ ہوا۔ لیکن قومی زندگی میں جاگیردارانہ رجحانات بدستور حاوی رہے ہیں۔ غریبی اور جہالت برابر بڑھتی گئی ہے۔ اور ہماری تہذیبی زندگی دن بہ دن ٹھٹھرتی گئی۔ لیکن کوئی بھی سماج جس میں ایک طبقہ دوسرے طبقہ کا خون چوستا ہے، اپنے وجود کا تا دیر قائم نہیں رکھ سکتا۔ طبقاتی کشمکش ایسے سماج کا شیرازہ بکھیر دیتی ہے محکوم اپنی زنجیروں کو توڑنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ اس سے اس کے دل و دماغ میں نئے شعور کے دیئے جلتے ہیں، جس سے وہ اپنے حریف کو بخوبی پہچان لیتا ہے، جو اسے مختلف بھیس میں فریب دیتا رہا ہے۔ چاہے وہ رسم و رواج کے روایتی لباس میں آئے یا مذہب کی مقدس عبا میں لپٹا ہوا ہو۔ ادب کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ سامراجی پشت پناہی کے باوجود جاگیردارانہ نظام اور سماجی بدنظمی کے کریہہ چہرے سے نقاب ہٹا کر اس کی اصلی شکل کو نمایاں کر دیا ہے۔ اس شعور کی اصلی شکل کو نمایاں کر دیا ہے۔ اس شعور کی عکاسی ہمارے ادب میں واضح طور پر

1۔ ترقی پسند تحریک، ایک جائزہ، ہنس راج رہبر۔ ص، 129

ملتی ہےاس کی واحد وجہ یہی ہے کہ ادیب کبھی بھی اپنے سماج اور معاشرے سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔اس کی تخلیقات نے ہمیشہ حلقہ شام وسحر کوتوڑ کر سماج کی تبدیلیوں کے ساتھ ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔اس نے اپنے ادب کے لیےمواداپنے سماج اور معاشرے سے حاصل کیا ہے۔اسی لیےعوام کے ذہن وشعور نے بھی اسے بہ طیب خاطر قبول کیا ہے۔اچھا ادب وہی ہے جس میں سماجی زندگی کے حقائق و معارف کی بہترین عکاسی کی گئی ہواور قاری کوایسا محسوس ہو کہ اس کا کردار یا تو وہ خود ہے یا سماج کا کوئی فرد ہےایسے ہی ادب کو مقبولیت حاصل ہوسکتی ہے جس کا پس منظر اور پیش منظر سماج سے قریب تر ہو۔کیونکہ قاری اگر ایک طرف اپنے کوادب کے تخلیقی کردار سے ہم آہنگ سمجھتا ہےتو دوسری طرف وہ اس کردار کے قالب میں اپنے کو ڈھالنے کی سعی مشکور بھی کرتا ہے۔

رینے ویلک فرماتے ہیں:

’’لوگ کہانیوں کے کرداروں کی طرز پر اپنی زندگی کوڈھل سکتے ہیں انہوں نے کتابوں کے مطابق محبت کی ہے،جرم کیے ہیں اورخودکشی بھی کی ہے۔‘‘(1)

اگر ادیب نے اپنی تخلیقات میں سماج اور معاشرے کی صحیح عکاسی کی ہےتو قاری بھی ادیب کے تصورات اور تاثرات سے اپنے کوقریب محسوس کرتا ہے اس طرح ادیب اور قاری میں مکمل ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے یعنی ادیب اپنے سماج سے متاثر ہی نہیں ہوتا، بلکہ اسے متاثر بھی کرتا ہے،کیونکہ ادب صرف زندگی کی ترجمانی ہی نہیں کرتا،اس پرتنقید بھی کرتا ہے۔

جن ادیبوں اورنقادوں نے ادب اور سماج کے مسائل پر قلم اٹھایا ہےانہوں نے یا تو سماج اور ادب کے باہمی رشتے پرضرورت سے زیادہ زور دیااور ادب کوسماج کا مرحون منت قرار دیا۔یاپھرانہوں نے سماج اورادب کودومختلف اکائیاں تصور کیا۔درحقیقت ادیب ایک فن کار بھی ہےاور ایک سماجی فرد بھی۔وہ اپنا مواد سماج سے حاصل کرتا ہے،لیکن فن کے تقاضوں کوبھی ملحوظ رکھتا ہے۔وہ سیاسی یامذہبی طرزفکرتواختیار کرسکتا ہے،

(1)Rene wellek and warren austin theory of leteratureP. 102

مگر فن کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک اچھا ادیب ادب برائے فن کا قائل نہیں ہو سکتا۔ وہ ادب کو زندگی کا ترجمان اور اس کی تنقید سمجھنے کے لیے مجبور ہے۔ اس لیے اچھے ادب میں فکر و اسلوب اور جذبہ و خیال کی ہم آہنگی ملتی ہے، اور سماجی شعور کے ساتھ فنی التزام پایا جاتا ہے۔ ادب کی بنیاد بہر حال مادی حقائق اور سماجی شعور پر قائم ہے۔ اس کے بغیر اچھے ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ اچھا ادب براہ راست زندگی اور اس کے مسائل سے الجھتا رہتا ہے۔ اس کی تخلیق میں ایک سماجی مقصد بہر حال کارفرما ہوتا ہے، اسی لیے سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''ادیب شعوری طور پر کوئی مقصد رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، ایک قادر القلم فن کار کی تحریر کوئی نہ کوئی منفی یا مثبت سماجی مقصد رکھتی ہے''۔ 1

ادیب اپنی تخلیقات میں گرد و پیش کی دنیا، سماجی اور معاشی نظام کی پیچیدگیوں اور انسان کے دل کی دھڑکنوں کو حسین پیکر میں متحرک اور زندہ حقیقتوں کے ساتھ پیش کرتا ہے اسی لیے سید احتشام حسین ادب کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ادب انسانی شعور کی وہ تخلیق ہے جس میں ادیب اپنے ذہن سے باہر کے مادی اور خارجی حقائق کا عکس مختلف شکلوں میں مختلف قیود اور جمالیاتی فوٹوگراف کی طرح ساکن یا بنا بنایا نہیں ہوتا۔ بلکہ متحرک اور زندہ حقیقتوں کا متحرک عکس ہوتا ہے''۔ 2

المختصر ادب دلکش پیرایہ بیان میں خارجی اور داخلی زندگی کی پیشکش کا نام ہے یہ خارجیت و داخلیت اور رمزیت و ایمانیت کا ایک خوشگوار امتزاج اور حسین مرقع ہے ادیب اس کے توسط سے روح عصر کا منفرد انداز میں اظہار کرتا ہے دراصل یہی اظہار ادب ہے۔

☆☆☆

1۔ سید احتشام حسین، ذوق ادب، اور شعور۔ص، 21.22

2۔ سید احتشام حسین، ذوق ادب، اور شعور۔ص، 104-105

سیاسی پس منظر

سیاست:

''سیاست''انگریزی زبان کے لفظ پالیٹکس (Politics) کا اردو ترجمہ ہے یہ لفظ یونانی زبان سے نکلا ہے یونانی زبان کے لفظ پالس (Polis) سے مشتق ہے اور اس لفظ کے معنٰی یونان میں نگر یا ''اسٹیٹ'' کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

اردو میں سیاست کے لغوی معنٰی فیروز اللغات میں کچھ اس طرح سے درج ہیں:

''حکومت،سلطنت،ملکی انتظام رعب داب،دھمکی،گوش مالی سزا''(1) وغیرہ ہیں۔

اسی طرح سے اعجاز اللغات اور فرہنگ آصفیہ میں بھی یہی معنٰی ملتے ہیں:

''حفاظت،نگرانی، معاملاتی ملکی حکومت،سلطنت، رعب دبدبہ،سختی،قوت، دہشت،سزا۔ وغیرہ ہیں۔''(2)

ان دو اقتباس کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ سیاست کے لغوی معنٰی نگرانی،حکومت،سلطنت اور معاملاتی ملکی انتظام کے معنوں میں یہ استعمال ہوتے ہیں۔

فرہنگ سیاسیات میں لفظ سیاست کے لغوی اور اصطلاحی معنٰی بتاتے ہوئے انگریزی زبان کے لفظ پالٹکس،اور یونانی لفظ (Polics) سے مشتق قرار دیتے ہوئے کچھ اس طرح بیان کیے گئے ہیں:

> ''لفظ 'پالٹکس' ،یونانی لفظ (polics) سے مشتق ہے۔جس کے معنی''شہر'' کے ہیں۔قدیم یونانیوں کے نزدیک کسی شہر کے معاملات سے متعلق علم کو 'پالٹکس'' کہا جاتا تھا۔وہ لوگ ریاست اور شہر میں فرق نہیں کرتے تھے اس طرح ''سیاسیات'' کو

---

(1) فیروز اللغات۔الحاج مولوی فیروز الدین۔ص،825۔

(2) اعجاز اللغات۔جدید اردو۔ص، 456۔

ایسا مضمون سمجھا جاتا ہے جس میں شہری حکومت کے مسائل پر غور کیا جائے"۔ 1

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ سیاست کے لغوری اور اصطلاحی دونوں اعتبار سے اس کے معنی حکومت، ریاست اور شہر کے ہوتے ہیں۔ اس طرح سے جامع اردو انسائکلو پیڈیا میں اس کے معنی شہر اور مملکت کے بتاتے ہوئے یوں درج ہیں:

"سیاست کے عام معنی امور مملکت کا انتظام کرنے کے ہیں سیاسیات کی ابتداء تہذیب (Civilization) کے ساتھ ہوئی۔ لفظ "پالیٹکس" (سیاست) یونانی "زبان" کا لفظ (Polics) مشتق ہے جس کے معنی شہر کے ہیں۔۔۔ سیاست سے مراد وہ عمل یا کاروائی ہے جس کے ذریعے مقاصد کے حصول کے لیے مناسب ذرائع اختیار کیے جائیں۔ سیاست کا عمل محض انسانی گروہوں کے درمیان ہوتا ہے نہ کہ افراد کے درمیان"۔ 2

جس طرح ادب اور زندگی کا رشتہ گہرا ہے اسی طرح سے انسانی زندگی اور سیاست کا بھی گہرا تعلق ہے جس طرح سے ادب انسانی زندگی کا ایک آئینہ ہوتا ہے اسی طرح سے سیاست بھی انسانی زندگی میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ ادب جس طرح سے انسانی زندگی کے تغیرات سے بدلتا گیا ویسے بھی سیاست میں بھی تبدیلیاں آتی گئیں۔

دور حاضر میں انسانی زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلیاں ہوتی ہیں جس کے وقوع پذیر ہونے میں سیاست کا اہم رول رہا ہے قدیم زمانے میں اس کے معنی و مفہوم جو بھی رہے ہوں لیکن ان دنوں سیاست کے نہ صرف معنی و مفہوم، ہی بدلے ہیں بلکہ جدید سیاسی اصطلاحات مثلاً، جمہوریت، آئین، انتخاب، اقتدار اور گروہ وغیرہ کو بے حد مقبولیت بھی حاصل ہو چکی ہے۔

1۔ فرہنگ سیاسیات۔ از: محمد محمود فیض حسن علی جعفری۔ ص، 263

2۔ جامع اردو انسائکلو پیڈیا۔ جلد سوم۔ ص، 344

جدید سیاسی نظریات کے مطابق سیاست اقتدار کے لیے جدوجہد سے مشتق ہے اس لیے ہر برٹ۔ جے۔ سپائرو (Herbert Spiro) نے سیاست کو انسانی معاشرہ کے مسائل حل کرنے کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سیاست وہ عمل ہے جس کے ذریعہ انسانی معاشرہ، دو افراد یا بڑے سے بڑا انسانی طبقہ اپنے مسائل حل کرتا ہے''۔ 1

لفظ سیاست اپنے اندر اپنے وسیع معنی رکھتا ہے کہ اس کے دائرے میں وہ تمام چیزیں آ جاتی ہیں۔جن کا تعلق انسانی زندگی سے ہے سیاست ایک مخصوص سماجی ڈھانچے کے اندر ہی تشکیل پاتی ہے سیاست ہماری زندگی میں ہمارے وجود سے لے کر خاندانی زندگی، تہذیبی اقدار اور معاشی نظام سب کو متاثر کرتی ہے۔

آر۔ایچ۔سالٹاؤ (R.H.Saltau) سیاست کو ہر آدمی کی زندگی کا بنیادی عنصر کہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''سیاست کا تعلق ہر اس آدمی سے ہوتا ہے، جو کسی بھی طرح کی ذمہ داری کا احساس رکھتا ہے۔ 2

مذکورہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاست ایک عمل ہے جو مختلف گروپ اور تنظیموں کے درمیان حصول مقاصد کی خاطر یا ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی غرض سے عمل میں آتی ہے جس میں مسائل، قوت اور عمل کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔

پچھلے صفحات میں سیاست کی تعریف کرتے ہوئے ایک بات کا ذکر ہوا تھا کہ جس طرح سے ادب اور زندگی کا گہرا تعلق ہے اسی طرح سے زندگی اور سیاست کا بھی گہرا تعلق ہے، اسی طرح سے ادب اور سیاست کا بھی گہرا تعلق ہے اگر ہم ادب کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ادب میں سیاست کسی نہ کسی حد تک

---

1 ۔ اردو ہندی کے سیاسی ناول (تقابلی مطالعہ) از: ڈاکٹر سورج دیو سنگھ۔ص، 24-22۔

2 ۔ اردو ہندی کے سیاسی ناول (تقابلی مطالعہ) از: ڈاکٹر سورج دیو سنگھ۔ص، 24

ہمیشہ شامل رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ادب میں سیاسی پہلو کو جگہ بھی دی گئی۔

اختر انصاری ایک جگہ ادب اور سیاست کے تعلقات پر بحث کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

> ''ادب اپنے دور کی سیاست کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جس زمانے میں سیاست اور سیاسی تنظیمیں صاحب اقتدار بالائی طبقے کی ملکیت تھیں اور عوامی طبقے جمود اور بے حسی کا شکار تھے، ادب اور سیاست کا تعلق بھی سرسری، سطحی اور معمولی تھا۔ پھر جب عوام میں سماجی احساس بڑھا اور سیاسی شعور پیدا ہوا اور خود سیاسی مسائل زیادہ اہم اور وزنی ہو گئے تو ادب اور سیاست کا تعلق پھر گہرا اور جاندار ہو گیا۔ آج کل ادب اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ ادب سیاست کے تقاضوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ اس پر مجبور ہے کہ ادب میں سیاسی حقائق کی جگہ پیدا کرے۔ صرف یہی نہیں وہ یہ بھی ضروری سمجھتا ہے کہ سیاست اور اس کے ادب کا یہ باہمی تعلق محض اتفاقی نہ ہو بلکہ اس کی شعوری اور دانستہ کوشش کا نتیجہ ہو''۔ 1

سیاسی ادب کو سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے ہمارے ملک کے سیاسی حالت کو جاننا بہت ضروری ہے کیونکہ ہمارے ملک کے حالات شروع سے یکساں نہیں رہے ہر دور میں بدلتے گئے، جس کا اثر انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ انسان سے جڑی معاشرہ کی ہر وہ چیز پر ہوا ہے جس کی عکاسی ہمارے ادب میں کی گئی ہے۔

1600ء میں انگریزوں نے ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے اپنے کاروبار جمانے شروع کیے۔ اور یہ کاروبار بہت وسیع ہو گیا انگریزوں نے آخر کار بہادر شاہ ظفر کو بھی شکست دے دی۔ اور ہندوستان پر اپنی حکومت جمالیا۔ ہندوستان کے نظم و نسق کو بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ نظم و نسق برطانوی حکومت کے ہاتھوں میں جاتے ہی انہوں نے 1858ء میں ہندوستانی لوگوں پر اپنے قانون لا دد ئے گئے۔ اور یہ قانون کے تحت ہندوستانیوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی جاتی تھی۔ ہندوستانیوں کو سرکاری نوکریاں نہیں دی جاتی تھی۔

1۔ اردو ہندی کے سیاسی ناول (تقابلی مطالعہ) از: ڈاکٹر سورج دیو سنگھ۔ ص،25

انگریزوں کا یہ رویہ دیکھ کر ہندوستانیوں نے ان کے خلاف آواز اُٹھائی۔ ہندوستانیوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہوگئی۔ 1857ء میں انگریزوں کے خلاف مخالفت کی اور آگے چل کر یہی مخالفت جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔ ہندوستانی یہ چاہتے تھے کہ پہلے انگریز ہندوستانیوں کو کاروبار میں فروغ دئے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلے پہل ہندوستان کا سیاسی مسئلہ آزادی نہ ہو کر صنعت وحرفت کو ترقی دینا تھا۔ اور ہندوستانی سرمایہ دارانہ نظام کو فروغ دینے کا مسئلہ تھا۔ جو آگے چل کر ہندوستان کا نصب العین بن گئی، اور انگریزوں سے ہر مسئلہ پر ہندوستانیوں کے حق دینے اور ان کی حفاظت کرنے کی مانگ کی اس کے لیے ہندوستانیوں نے تحریکیں شروع کیں۔ جن کا مقصد ہندوستان کی صنعت وحرفت کو ترقی دلانا اور سرمایہ داری کا بڑھانا تھا۔

1885ء میں نیشنل کانگریس پارٹی کا وجود ہوا۔ اس پارٹی کا مقصد تھا کہ ہندوستانیوں کے خیالات کو تقویت بخشنا تھا اور اس طرح یہ پارٹی کو عمل میں لایا گیا۔ اس پارٹی کے رہنما۔ اے، او، ہیوم کو بنایا گیا۔ اے، او، ہیوم کی مدد کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ہندوستانی عوام یہ جانتے تھے کہ اگر کوئی ہندوستانی رہنما اس انجمن کی بنیاد ڈالنا چاہے گا تو بھی انگریزی حکومت انہیں ہرگز اجازت نہیں دے گی۔ اس طرح اسے ہندوستانیوں کو ہیوم کی مدد لے لینا پڑا۔ اسی طرح کانگریس پارٹی کے رہنما کو کامیابی حاصل ہوئی۔ انگریزوں کی بھی خواہش تھی کہ ایک انجمن کا قیامت عمل میں آئے۔ اور ہندوستانی لوگوں کے خیالات تاثرات ان تک پہنچے اور اُن کے مسائل پریشانیوں کو دور کیا جائے انتشار کو شدت اختیار کرنے سے روکا جائے۔

شروع میں انجمن عوام کا فائدہ دیکھ کر اصلاحی کام انجام دے رہی تھی جس کے تحت وہ ہندوستانیوں کے اپنے حقوق دلانا چاہتی تھی۔ اور ہندوستانیوں کو سرکاری عہدوں پر فائز کرنا چاہتی تھی ہندوستانیوں کے دماغ میں غیر ملکی حکومت سے چھٹکارا لینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ جو مہربانیاں کر رہے تھے یہ سب بھول گئے اور حکومت میں فرق پیدا کر دیا اور بنگال کی تقسیم کرنے کا ارادہ کر لیا یہ بات ہندوستانیوں کو ناگریز لگی اور ہندوستانی عوام غم وغصے میں آگئے انگریزوں کے خلاف احتجاج کرنا شروع کر

دیا۔ انگریزوں کی یہ چال نہ کام ہوگئی۔ اور انہیں اپنے ارادہ بدلنا پڑا۔ ہندوستانیوں نے تقسیم کے خلاف تحریکیں شروع کیں اور اس کے نتیجہ میں ویدیشی چیزوں کے خاتمہ کی تحریک عمل میں آئی۔ یہ تحریک صرف بنگال ہی میں نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے علاقوں میں زور وشور سے اس ودیشی تحریک کا آغاز ہوا۔ اسی دوران گاندھی جی نے بھی گھریلو صنعتوں پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالا اور ہر طرف چرخا اسکولیں شروع ہوئیں۔ اسی طرح اس دور میں ہندوستانی گھریلو صنعتوں کو بہت ہی زیادہ ترقی حاصل ہوئی۔

جرمنی اور برطانیہ کے درمیان 1914ء میں پہلی جنگ عظیم ہوئی جس میں ہندوستان کے فوجیوں کو بھیجا گیا۔ فوجیوں نے یہ سوچ کر جنگ میں حصہ لیا کہ جنگ ختم ہوتے ہی ہندوستانیوں کو ان کے اختیارات واپس دے دیئے جائیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ جنگ کے سارے اخراجات ہندوستان کے خزانے سے خرچ ہو رہے تھے۔ خزانے ختم ہو رہا تھا۔ اس کی بھرپائی کے لیے ہندوستانی کسانوں پر ٹیکس (لگان) بڑھا دیا گیا کسانوں پر لگان بڑھانے کی وجہ سے پنجاب کے کسانوں میں غم وغصہ بڑھ گیا۔ اور کسانوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنا شروع کر دیا۔ اس بغاوت کے ختم کرنے کے لیے ایک ایکٹ بنایا گیا۔ اس ایکٹ کے بناتے ہی سارے ملک میں 6/اپریل 1919ء کو ملک گیر پیمانے پر ستیہ گرہ کی گئی وہ ستیہ گرہ کامیاب رہی۔ اس کے بعد ہی پھر 13/اپریل 1919ء کو جلیان والہ باغ کا خون آشام حادثہ ہوا۔ جس میں جنرل ڈائر کے حکم سے لوگوں پر گولیاں چلائی گئی۔ جس میں امرتسر، پنجاب، لاہور کے عوام مشتعل ہوا تھے۔ اسی دوران خلافت کا مسئلہ بھی سامنے آیا۔ ہندوستانیوں کے اوپر ہو رہے ظلم کو گاندھی جی برداشت نہیں کر پائے۔ اور انہوں نے بھی ایک تحریک عدم تعاون شروع کی جو کہ پہلی اگست 1921ء کو عمل میں لائی گئی اور تحریک عدم تعاون کا اعلان ہوتے ہی 17/نومبر 1921ء کو برطانیہ کے شہزادہ ویلز ہندوستان کے دورے پر آیا اس کے آتے ہی ہندوستانیوں میں مخالفت کا جذبہ ستیہ گرہ کے طور پر وقوع پذیر ہوا۔ اسی دوران گاندھی جی کو گرفتار کر لیا گیا۔ 10/مارچ 1922 کو گاندھی جی کو حکومت کے خلاف ورزی کرنے کے جرم میں جیل بھیج دیا

گیا۔ گاندھی جی کی گرفتاری سے ہندوستانیوں کے دلوں میں اور بھی زیادہ صدائے احتجاج ہوا۔ گاندھی جی کو چھ سال کی سزا ہوئی۔ یہی احتجاج عوام کے اظہار تشدد کو اپنایا۔ اس سے گھبرا کر گاندھی جی نے انگریز افسر لارڈ ارون سے سمجھوتے پر آمادہ ہو گئے 1931 ءکو یہ سمجھوتہ ہوا جو ارون پیکٹ کہلایا۔

دوسری گول میز کانفرنس کے بعد تیسری گول میز کانفرنس 1933 ء میں اس کا اجلاس ہوا۔ جس کے تحت 1935 ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہوا۔ ہندوستانیوں نے اپنے حق کے لیے لڑائی شروع کی۔ اس ایکٹ میں ہندوستانیوں کے نظام میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اس کے نظام تبدیلیاں کے تحت انگریزوں کو پریشان کرتے رہتے تھے ان شرائط کے مطابق گورنر کے جو اختیارات وسیع ہو گئے تھے گورنر کے خلاف ورزی کرنے والے عوام کو وہ نوکریوں سے ہٹا دیا کرتا تھا۔ ہندوستانی عوام کو غیر ملکی بدستور مسلط تھی ان کے خلاف احتجاج کے طور پر کانگریسی لیڈروں نے حکومت کے روبرو ایک مطالبہ پیش کیا کہ:

> ”کانگریس نے اپنی اکثریت والے صوبوں میں اس شرط پر وزارتیں بنائی منظور کیں کہ گورنر روزمرہ کے انتظام میں مداخلت نہ کریں گے اور وزیروں کو حکومت چلانے دیں گے اور اپنی پوزیشن دستوری حاکم کی سی رکھیں گے۔ تین مہینے کے سیاسی تعطل یا جمود کے بعد اس مطالبے کو بہت بڑی حد تک برطانوی حکومت نے مانلیا اور جولائی 1937 ء میں اپنی اکثریت والے صوبوں میں کانگریس نے اپنی وزارتیں بنائیں اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالی“(1)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کے منتخب شدہ وزرائے سے زیر اثر عوام کو بہت سکون ملا۔ ظلم، اور سخت قوانین روکے گئے۔ عوام کو اپنی بات خود کہنے اور لکھنے سے آزادی ملی۔ جو سیاسی قیدی تھے جو ان کو آزاد کیا گیا۔ کسانوں پر جو لگان بڑھا دیا گیا تھا وہ قرضے کی امدادی قوانین پاس ہو گئے۔ جس سے کسانوں میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ کسانوں کو مہاجنوں اور زمینداروں کے چنگل سے چھٹکارا ملا۔ دیہاتوں میں

---

(1) مشمولہ: مختصر اردو افسانہ سماجیاتی مطالعہ۔ از: ڈاکٹر عائشہ سلطانہ۔ ص 62

سہولتیں ہوئی دیہات سدھارنے کے لیے کئی اسکیمیں عمل میں آئی۔کھدر کا چرچا ہوا۔گھریلو صنعتوں کو بھی ترقی ہوئی۔اسی کے ساتھ ساتھ دیہاتوں میں تعلیم کی سہولتوں کے لیے تعلیمی نظام میں نئی اصلاحیں کی گئی۔ میونسپلٹیوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دئے گئے۔۔الغرض یہ وزراءعمل طور پر عوام کی ہی وزارتیں تھیں اور سب لوگ آزادی کے ساتھ جی سکتے تھے۔اسی طرح تعلیم طالب علموں کی بھی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ ہندوستانی ابھی چین کی سانس بھی نہیں لے پائے تھے کہ یوروپ کے ممالک میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی اور برطانوی حکمرانوں نے ہندوستان کے وزیروں کی صلاح ومشورے کے بغیر ہی ہندوستانیوں کی جانب سے بھی جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا۔اسی طرح ہندوستانی انگریزوں کے سخت مخالف ہوگئے اور انگریزوں کے سامنے یہ شرائطر رکھے کہ جنگ کے مقصد کیا ہے اور ساتھ ہی مانگ بھی رکھی کہ حکومت جنگ میں حصہ لینے سے پہلے ہی ہندوستان کو آزاد کرنے کا اعلان کردے اور اس جنگ میں یہ حق دیا جائے کہ ہندوستانی اپنی مرضی کے مطابق انتظام بھی کریں۔لیکن انگریزوں نے یہ مانگ کو ٹھکرا دیا۔اور یہ انگریزوں نے یہ کہا کہ ہندوستانیوں میں یکجہتی نہیں ہے جب تک وہ آپس میں ہندو مسلم مسئلہ کو حل نہیں کرتے تب تک ان کا کوئی بھی مطالبہ نہیں مانا جاتا۔انگریزوں کے انکار کی وجہ سے ہندوستانی کانگریس وزراء نے اپنے نوکریوں کو استعفٰی دے دیا۔

کانگریس کا اجلاس 1945ء میں منعقد کیا گیا اس میں ہندوستانیوں کو مکمل آزادی کی تجویز پاس ہوئی۔ ہندوستانی عوام اب انگریزوں کی بات کو نہیں منظور کریں گے بلکہ انہیں مکمل آزادی کے سائے کسی بھی بات کو منظور نہیں کریں گے۔اس بات کو انگریزوں سے منوانے کے لیے سامراجی جنگ کرنے کی مخالفت میں گاندھی جی کی نگرانی میں ستیہ گرہ شروع ہوا۔ہندوستانیوں نے انگریزوں سے بہت مایوس تھے اس لیے انہوں نے ہندوستان چھوڑ دو تحریک شروع کی 1942ء میں یہ تحریک شروع ہوئی۔اسی دوران گاندھی جی نے ایک اخبار ''ہریجن'' میں یہ تحریر کیا کہ انگریزوں کو ہندوستان کے سیاسی اقتدار سے پوری طرح ہٹ جائیں اور

ہندوستان کو ہندوستانیوں کے حوالے کردیں۔ اور وہ اپنے وطن انگلینڈ واپس چلے جائیں۔ اس اخبار کے ذریعہ یہ خبر ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی اور تمام ہندوستانی کو یہ بات بہت پسند آئی اور تمام ہندوستانیوں نے اس تحریک میں پیش پیش رہنے لگے۔

اس طرح سارے ہندوستان میں یہ تحریک یعنی ہندوستان چھوڑ دو چلانے سے ملک میں شدید افراتفری کا ماحول برپا ہوگیا۔ کانگریس رہنماؤں کو انگریزوں نے گرفتار کرنا شروع کردیا۔ تو ہندوستانیوں کے دلوں میں زیادہ جوش پیدا ہوا۔ اسی جوش میں لوگوں نے اپنے اشتعال کا اظہار توڑ پھوڑ کر کے کیا۔ اور جیل کو آگ لگادی۔ اور انقلاب کے نعرے بلند کیے۔ اور ریل کی پٹریاں بھی اُکھاڑ دیں۔ اور اسکولوں، کالجوں، سرکاری دفاتر کو پوری طرح تہس نہس کر کے عمارتوں کو نقصان پہنچایا۔ اس نقصان سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انگریزی حکومت اب آخری سانس لے رہی ہے۔ مگر انگریز بہت شاطر ذہن تھے انہوں نے جلد ہی اپنے قابو میں لے لیا۔ اور انگریزی فوج میں ہندوستانی حصہ لینے والوں کے اوپر ظلم کیا اور انہیں بے دردی سے کچل دیا گیا۔ اس تحریک کو کچل دیئے جانے کی وجہ سے 1945ء تک ہندوستانیوں میں سیاسی جمودی طاری رہا، ان دنوں کانگریسی لیڈروں کو جیلوں سے آزادی ملی۔ ان دنوں دوسری جنگ عظیم کا خاتمہ بھی ہوگیا تھا۔

انگریزوں کو اس بات کا اندازہ ہوگیا اور یہ بات کو محسوس کر رہے تھے کہ اب ہندوستان عوامی بغاوت پر آچکی ہے اور ہم اب ہندوستان پر اور زیادہ حکومت نہیں کر سکتے۔ اور ہندوستانیوں کو آزادی دینا ہی ہوگا۔ انگریزوں کی سرکاری فوجیں جنگ کر کے بہت زیادہ تھک گئے تھے اور وہ کسی بھی حالت میں ہندوستانیوں سے جنگ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اب ان میں مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں تھی اِدھر ہندوستان کے سیاسی رہنما بھی بدل گئے تھے سیاسی صورت حال بھی قدرے تبدیل ہوچکی تھی۔ انگلستان میں قدامت پسند جماعت کا عہد کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ اور مزدور جماعت پر سر اقتدار سنبھالے ہوئے تھی۔ یہ مزدور جماعت ہندوستانیوں کے ساتھ دے رہی تھی۔ انگریزوں کو اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ اب ہندوستانی عوام ہمارے باتوں میں آنے

والی نہیں ہے اور ہماری باتوں پر اعتبار نہیں کریں گے۔اس بات سے انگریز بہت بے چین تھے۔اس انتشار نے جگہ لے لی تھی۔ ہندوستانی پولس اور حاکم نے بھی حکومت کے احکام کی خلاف ورزی کرنا اپنا اشعار بنالیا تھا۔ ہندوستانیوں نے یہ عہد کرلیا کہ انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ کر اپنے وطن کو واپس جانا چاہئے اور ہندوستان کو آزاد کرانا ان کا مقصد بن گیا۔اسی دوران انگریزی افسر برطانوی وزیر لارڈ پیتھک لارنس، وزیر بندسر اٹفیر ڈ کرپس، اور مسٹر اے وی الگزنڈر کی نمائندگی میں ایک کیبنٹ مشین ہندوستان کو پہنچا۔ یہ کیبنٹ مشین ہندوستانیوں کئی ہفتوں تک بات چیت کرتے رہے اس بات کے ذریعہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جسے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں پارٹیوں نے اس تجویز کا انکار کردیا۔ انکار کی وجہ سے دونوں پاٹیوں میں اختلاف اور بھی زیادہ بڑھتا گیا۔ مسلم لیگ اور کانگریز پارٹی کے اختلاف کی وجہ سے حکومت نے پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر لیاقت علی، سردار بلد یوسنگھ اور محمد علی جناح کو دسمبر 1946ء میں لندن بلایا گیا۔ان کو بلاکر سمجھایا کہ دونوں پارٹیوں کے اختلاف کو ختم کیا جائے لیکن یہ کوشش ناکام ہوئی اور ہندوستانی لوگ سمجھوتہ سے ہم خیال نہیں ہو پائے۔ انگریزی حکومت نے اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ برطانیہ حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان جون 1948ء کو آزاد کردیا جائے گا۔ اگر اس بات سے ہندوستانی کسی نتیجے پر نہ پہنچ پائے تو اور متفقہ دستور اساسی مرتب کرنے میں ناکام رہے تو حکومت ہندوستان کا اقتدار ایک سے زیادہ ہندوستانی حکومتوں کے حوالے کردیا جائے گا۔اسی دوران لارڈ ویول کی جگہ پر لارڈ ماؤنٹ بیٹین کا تقرر ہندوستان میں وائسرائے کی حیثیت سے ہوا۔ ماؤنٹ بیٹین کے بعد ہی ہندوستانی رہنماؤں سے بات چیت کے بعد ایک پلان بنایا گیا پلان میں یہ بات ہوئی کہ برطانوی حکومت کی منظوری ملتے ہی 3رجون 1947ء کو اس منصوبہ کا اعلان کردیا جائے گا۔

مسلم لیگ اور کانگریس پارٹیوں نے اس پلان کو منظور کرلیا۔اور اس طرح جون 1948ء کے بجائے 14رگسٹ 1947ء کو ہندوستان تقسیم ہوا اور 15رگست 1948ء کو ہندوستان کو آزادی حاصل ہوئی

ہندوستان نے اپنی آزادی کا پرچم لہرایا اور پاکستان نے اپنی آزادی کا پرچم لہرایا۔ آزادی سے پہلے یہ دونوں ممالک متحد تھے۔ جیسے ہی آزادی ملی یہ دونوں ممالک ہندوستان اور پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ہندوستانیوں کو ایک طرح سے خوشی ہو رہی تھی اور بظاہر لوگ خوش بھی تھے لیکن دونوں ملک اندرونی طور پر غم اور افسردہ بھی ہو رہے تھے۔ کیونکہ ہندو سمجھتے تھے کہ ایک وسیع سرزمین جو صرف ہندوستان کہلاتی تھی، مسلمانوں کی وجہ سے دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے اور مسلمانوں کا یہ نظریہ تھا کہ انہیں نہ ہی پورا بنگال ملا ہے اور نہ پورا پنجاب اس لیے ان کی بھی خوشیاں ادھوری ہی رہ گئی تھیں۔

1946ء سے ہی ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ فرقہ وارانہ فسادات برپا ہو چکے تھے اور اس سے پہلے 1923ء کے بعد سے ان دونوں قوموں میں وقتاً فوقتاً جھگڑے ہوتے رہتے تھے لیکن بقول مصنفین جدوجہد آزادی:

> ”گاندھی جی کے برت کی وجہ امن کانفرنس منعقد کی گئی، لیکن اس سے حالات کو سدھارا نہیں جاسکا اگلے دو سال میں فرقہ پرستی زیادہ شدت کے ساتھ دور دور تک پھیل گئی۔ 1925ء میں سولہ فساد ہوئے 1926ء میں ہونے والا کلکتہ کا فساد بدترین تھا۔ بڑے بڑے شہروں کے بعد اب چھوٹے چھوٹے قصبے بھی فساد سے متاثر ہونے لگے۔ سائمن کمیشن نے 1922ء سے 1927ء تک کی درمیانی مدت میں ہونے والے ایک سو بار فسادات کی فہرست پیش کی تھی جس میں چار سو پچاس انسانی جانیں ضائع ہوئی تھیں اور پانچ ہزار اشخاص زخمی ہوئے تھے“(1)

اس طرح یہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں حکومت کرنے کے لیے تفریق پیدا کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کو اپنا کر ہندو مسلم میں دونوں فرقوں میں لڑایا اور یہ احساس لدایا کہ یہ دونوں الگ قومیں ہیں دونوں فرقوں کے افراد کے ذہنوں میں یہ بات بٹھائی اور دونوں کو برابر کے حق ہونے چاہئے

(1) اگست گڑبڑ۔ آزاد چمن لال باغی جوہر۔ ص، 107

اور ایک دوسرے سے لڑیں انگریز اس بات کا فائدہ اٹھائے اور دونوں قوموں کا ذہن غیر ملکی حکومت کے بیچ نہ جانے اور انگریز آرام کے ساتھ حکومت کریں۔

انگریزوں نے ہندو مسلم کے بیچ ہی پھوٹ نہیں ڈالی بلکہ ذات پات کے بیچ میں بھی نفرت پیدا کر دیئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ دو قوموں کے بیچ میں قومی نظریہ کے بیج بھی بوئے تھے۔ وہی بیج آزادی کے بعد بھی تناور درخت کی صورت اختیار کر گیا اور یہی وجہ تھی کہ ہندو مسلمان دونوں ہی قومیں اپنی اپنی حدیں پار کر گئے۔ جو انسانیت کے دائرے میں شامل تھیں۔ جونہی ہندوستان پاکستان کا بٹوارا ہوا۔ دونوں قومیں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کی وجہ سے عوام کو سخت سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لاکھوں لوگوں کی جانیں گئیں۔ اور ہزاروں مرد، عورتیں گھر سے بے گھر ہو گئیں۔ اپنی رشتہ داروں سے بچھڑ کر ساری زندگی ان سے دور چلے گئے اور ان سب میں زیادہ خاتون کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑی۔

ان کی عزت کو ان ہی کے بھائیوں نے تار تار کر دیا عورتیں ان سب میں زیادہ ذلت ہر مسائل کا سامنا کرتی نظر آتی ہیں۔ قوم کو تو آزادی مل گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ، ہجرت کا مسئلہ، فسادات پھر سے نئی زندگی گذارنے کا سروسامان مہیا کرنا وغیرہ بہت سے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔

ایک مسئلہ زبردست کھڑا ہوا ہندو پاک کی آزادی کے بعد جو انتقال آبادی کا مسئلہ تھا، کچھ مسلمانوں کو پاکستان جانا تھا اور کچھ ہندو ایسے تھے جو ہندوستان کو آنا چاہتے تھے، اس وقت دونوں بیزار ہو کر صرف ہندو حکومت اور مسلم حکومت کے زیر سایہ منتقل ہونا چاہتے تھے۔ اسی طرح لوگوں کا ایک مقام سے دوسرے مقام اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے میں کئی زندگیاں تباہ و برباد ہو گئی۔ اور تینوں مذہب کے لوگ ایک دوسرے کے جان کے دشمن ہو گئے اسی طرح دونوں قوموں کا خون بہنے لگا۔ 1948ء تک یہ سلسلہ اس طرح جاری رہا۔ اور فساد زیادہ ہی بڑھتا گیا۔ اسی دوران قتل وخون تباہی و بربادی عورتوں کے ساتھ ظلم و زیادتی میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ اسی طرح دھیرے دھیرے یہ فساد ختم ہوا۔ لیکن عوام کو کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

پناہ گزینوں کی دوبارہ آبادی کا مسئلہ سب سے اہم مسئلہ تھا جو کہ دونوں حکومتوں کے روبرو ایک سوال بنا ہوا تھا۔ اور جگہ جگہ کیمپ لگائے گئے یہ کیمپ عارضی تھے رہائش گاہ بنانے اور انہیں دوبارہ زندگی سر کرنے کا سامان مہیا کیا گیا۔ انہیں کاروبار دیا جائے۔ جس کے ذریعہ وہ اپنے گھر بار چلائے۔ انہیں نوکریاں دی جائے۔ یہ مسئلہ حکومت کے سامنے بہت زیادہ اہم تھا۔ جس کو حل کرنا تھا۔ دوسرے ملکوں سے آئے مہاجرین نے ہندوستان میں رہنے بسنے والے مسلمانوں پر ظلم کرنا شروع کیا جنھوں نے نہ کبھی پاکستان جانے کی خواہش کی تھی۔ دونوں حکومتوں میں چند شر پسند لوگ تھے جو فساد کو بڑھا رہے تھے چند ایسے لوگ بھی تھے جو ایک دوسرے کی حفاظت کی خاطر اپنی جانوں کی بازی لگا رہے تھے اور انہیں اپنے ملک کی سرحد تک بہ حفاظت پہنچا رہے تھے۔

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ فساد میں پاکستانی اور ہندوستانی دونوں سرحدوں کے لاکھوں لوگوں نے ہی نہیں بلکہ کروڑوں کی جانیں گئیں۔ اسی وجہ سے کئی عورتیں بیوہ ہوگئی۔ بچے یتیم ہو گئے۔ لڑکیوں کو اغواء کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ آزادی حاصل تو ہوگئی لیکن کروڑوں قربانیاں بے قصور لوگوں کی جان و مال کا نقصان ہوا آزادی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کی قیمتی اشیاء سے بھی محروم ہونا پڑا۔ اس میں کچھ بھی نظر نہیں آتا بلکہ ایک دوسرے سے بدلہ، اس انتقام کے جذبے کے تحت ہو رہا تھا۔ پھر بھی اپنی محنت و مشقت سے جلد سے جلد انڈین یونین نے اس کو اپنے قابو میں کرلیا۔ اور ملک میں امن امان قائم کیا۔ لیکن یہ فرقہ وارانہ باتیں آج بھی ہندو مسلمان کے دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے۔ آزادی کے بعد سے اب تک ہندو مسلمان فساد بہت سے علاقوں میں سینکڑوں فسادات ہیں۔ ان فسادات سے کئی معصوم لوگوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اور یہ سلسلہ اب بھی ہندو پاک میں جاری ہے۔

جیسے کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ملک کے اس طرح کے سیاسی حالت سے زندگی کے ہر شعبہ میں تبدیلیاں آئیں اور ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والا شخص ان سیاسی حالت سے متاثر ہوا۔ اس طرح ہر عام آدمی کی

طرح ایک ادیب بھی ان سب سیاسی حالت سے دوچار ہوا اور اس سے متاثر بھی ہوا۔

یہ بات سچ ہے کہ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے جس میں انسان کے جذبات اور خیالات کی عکاسی ہوتی ہے اسی طرح سے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ادیب اپنے وقت کی پیداوار ہوتا ہے۔ اور اس کی شخصیت کی تعمیر اس سے تعلق رکھنے والے عہد کے سیاسی اور سماجی اور تہذیبی وہ معاشرتی حالات سے ہی بنتی ہے اور وہ جب ادب تخلیق کرے گا تو جس طرح سے اس نے سماجی اور سیاسی حالت سے دوچار ہوا ہے۔ اسی طرح سے وہ اپنی تخلیقات میں اسی طرح کا نقشہ پیش کرے گا۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادب اور سیاست میں گہرا تعلق ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے علیٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆

باب دوم

اردو ناول 1960ء سے قبل

اردو ناول 1960ء سے قبل

1) اردو ناول ابتداء سے 1900ء تک

2) اردو ناول 1900ء سے 1936ء تک

پریم چند اور دوسرے ناول نگار

3) ترقی پسند تحریک اور اردو ناول نگاری

اہم ناول نگار اور ان کے نمائندہ ناول

4) تقسیم ہند سے 1960ء تک کے چند اہم ناول نگار اور ان کے ناول

☆☆☆

ابتدائی دور کی ناولیں اور ناول نگار

مغرب میں ناول نگاری کا آغاز اٹھارویں صدیق عیسوی میں ہو چکا تھا۔اس سے قبل وہاں ایسے قصے لکھے جاتے تھے جو رومانس کے نام سے مشہور تھے۔جس میں تخیل کے سہارے حسین زندگی کے مرقعے کھینچے گئے تھے۔لیکن یورپ کی صنعتی انقلاب نے وہاں ایک عظیم انقلاب برپا کیا اور زندگی کی تیزی رفتاری، ترقی نے جہاں معاشرت میں تبدیلی لائی اس کا اثر وہاں کے ادب پر بھی ہوا اور تخیلی قصوں کی جگہ حقیقی زندگی کو ادب میں پیش کیا جانے لگا اور اس طرح سے ناول نگاری کا آغاز ہوا۔

ہندوستان میں ناول آغاز 1857ء کے غدر کے بعد شروع ہوتا ہے اس سے پہلے اردو ادب میں داستانوں کا دور دورہ تھا۔لیکن 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد یہاں کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آئی۔ غدر کے بعد معاشی تہذیبی صورتوں اور مغرب سے آئی سائنسی برکتوں نے حساس ذہن کو ناول کی طرف رجوع کیا، ہندوستان میں ناول ایک دم سے وجود میں نہیں آیا بلکہ ابتداء میں انگریزی ناولوں کی طرز پر ہندوستانی ناول لکھے گئے یا انگریزی ناولوں کے براہ راست ترجمہ کئے گئے۔

اس سلسلہ میں پہلا نام نذیر احمد کا ہے۔جنھوں نے قدیم طرز کی قصہ گوئی کو ترک کرتے ہوئے ایسے قصے شروع کئے جس میں حقیقی زندگی کے مسائل کا بیان ہو۔

1869ء میں انھوں نے اپنا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' تصنیف کیا، اردو کے محققین کے پاس اردو کے پہلے ناول نگار کے محققین کے سلسلہ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔بعض محققین نذیر احمد کو پہلے ناول نگار مانتے ہیں اور بعض ''مولوی کریم الدین'' کو جنھوں نے ایک تمثیلی قصہ ''خطِ تقدیر'' کے نام سے لکھا تھا۔ جس کی اشاعت 1862ء میں عمل میں آئی۔تاریخی اعتبار سے ''خط تقدیر'' کو ''مراۃ العروس'' پر فوقیت حاصل ہے، لیکن اردو کی بیشتر ناقدوں نے نذیر احمد کو ہی اردو کا پہلا ناول نگار مانا ہے۔

اسی بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ نذیر احمؔد کی ناول ''مراۃ العروس'' میں وہ فنی لوازم نہیں ہیں جو ایک ناول کے لئے ضروری ہے۔لیکن نذیر احمد نے ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی تھی۔اس لئے ان لوازم کی تلاش نذیر احمد کے ہاں پوری نہیں ملتی۔نذیر احمد نے اصلاح کا بیڑہ اٹھایا تھا اور معاشرہ کی بدحالی، اخلاق کی درستگی تعلیم وتر بیت کو درست کرنے کے لئے انھوں نے اپنی بچیوں کو یہ قصے لکھ کر دیئے۔اور جب یہی قصے 1869 میں ''مراۃالعروس'' کے نام سے چھپ کر شائع ہوتے تو انہیں قبولیت دوام حاصل ہوئی۔اس طرح مقبولیت کے بعد انھوں نے اردو کتابیں لکھنی شروع کی۔جن مین ناول کے فنی لوازم آتے گئے۔نذیر احمؔد نے بہت سے ناول لکھے جن میں ''مراۃ العروس''، ''بنات النعش''، ''توبۃ النصوح''، ''ابن الوقت''، ''محصنات''، ''ایامیٰ'' ''رویائے صادقہ'' ''منتخب الحکایات شامل ہیں۔

نذیر احمد کے پورے ناول انیسویں صدی کی سماجی زندگی اور اسی زمانے کے مسلمان گھرانوں کی حالت کی عکاسی کرتے ہیں ڈاکٹر یوسف سرمست نذیر احمد کے ناولوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے رقم طرز ہیں:

> ''نذیر احمد کے پورے ناول اس زمانے کی مختلف سماجی حقیقتوں کو پیش کرتے ہیں۔اس زمانے کے سماجی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں اور انیسویں صدی کی حقیقی سوسائٹی ہی کو پس منظر بناتے ہیں۔''مراۃ العروس'' بنات النعش'، ''توبۃ النصوح''، ''فسانہ مبتلا'' ابن الوقت، ایامیٰ، رویائے صادقہ، میں کوئی ایک

ناول بھی ایسا نہیں ہے جس میں انیسویں صدی کی سماجی زندگی اور اس زمانے کے مسلمان گھرانوں کی حقیقت شعارانہ عکاسی نہیں کی گئی ہو۔انھوں نے زندگی کی حقائق اور اس کے ٹھوس پہلوؤں کو ہمیشہ سامنے رکھا۔ کیونکہ ان کا مقصد انسان اور انسانی سماج کو بہتر بنانا تھا۔''(1)

مولوی نذیر احمد نے ''مراۃالعروس''اور''بنات النعش''معاشرہ میں عورتوں،خاص کر مسلمان عورتوں کی حالت کو مدنظر رکھ کر لکھے ہیں۔جس میں انھوں نے ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے عورتوں کی اصلاح جانب معاشرے کو متوجہ کرنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔

''مراۃالعروس'':

اس ناول میں لڑکیوں کی تعلیم وتربیت اور امور خانہ داری سے ان کی واقفیت کے ضمن میں دو متضاد طبیعت بہنوں اکبری اور اصغری کو سبق اموز کہانی پیش کی گئی ہے۔

بنات النعش:

اس ناول میں امور خانہ داری کا مزید درس اور معلومات عامہ کے تعلیمی قصے۔بیان کئے گئے ہیں اس میں ایک بگڑی ہوئی امیر زادی حسن آرا کو اصغری اور اس کی نند محمودہ راہِ راست پر لے آتے ہیں۔اور وہ ایک نیک فطرت لڑکی بن جاتی ہے۔اسی ناول کو مراۃالعروس کا دوسرا حصہ بھی کہا جاتا ہے۔

بہرحال ''مراۃالعروس''اور بنات النعش،معاشرہ کی اصلاح کے لئے نذیر احمد کی مخلصانہ کوشش کی بہترین مثالیں ہیں۔

توبۃالنصوح:

اس ناول میں مذہب،اخلاق عبادت وغیرہ جیسے مسائل پر بحث کی گئی ہے اور ہر موضوع سے متعلق

---

(1)بیسویں صدی میں اردو ناول۔از۔ڈاکٹر یوسف سرمست،ص33

اطمینان بخش اور مدلل گفتگو کی گئی ہے۔توبۃ النصوح میں نذیر احمد ایک پختہ مشق یافتہ ناول نگار نظر آتے ہیں۔

مولوی نذیر احمد کی ناول نگاری کے دو دور ہیں۔ان کی ناول نگاری کا پہلا دور 1869ء سے 1874ء تک رہا۔"مراۃ العروس" "بنات النعش" اور "توبۃ النصوح" اسی ابتدائی دور کے ناول ہیں۔دوسرا دور دس سال کے طویل وقفے کے بعد 1882ء میں شروع ہوا۔اس مدت میں "محصنات" "فسانہ مبتلا" "ایامیٰ" "ابن الوقت" اور رویائے صادقہ لکھے اور شائع کئے گئے۔فسانہ مبتلا، میں نذیر احمد کی نفسیاتی بصیرت اپنا جلوہ دکھاتی ہے وہ نہ صرف اس ناول سے اپنے فن کے عروج کی جانب گامزن نظر آتے ہیں بلکہ بڑی ہی فن کارانہ صلاحیتوں کو برتتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ناول "ایامیٰ" میں بھی ان کا فن ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا نظر آتا ہے۔"ابن الوقت" میں نذیر احمد ناول کے فن کو نہ صرف پوری طرح برتتے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ ناول کا فن ان کے تابع نظر آتا ہے اور بڑی آسانی سے پلاٹ و کردار تخلیق کرتے چلے جاتے ہیں۔بہر حال ابن الوقت میں نذیر احمد کا فن اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔

"رویائے صادقہ" میں نذیر احمد نے دہلی کے ایک شریف خاندان کی زندگی کو پیش کیا ہے۔اس ناول میں نذیر احمد مذہبی اختلافات کے خاتمہ کا درس دیتے ہیں اور یہی اس ناول کا مقصد ہے۔نذیر احمد بلاشبہ اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔جنھوں نے "مراۃ العروس" سے ابتداء کی لیکن "ابن الوقت" لکھ کر اردو ناول کو کئی منزلیں آگے بڑھا دیا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ:

ناول کی اس تشکیلی دور میں نذیر احمد کے بعد بڑا نام پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ کا ہے۔جنھوں نے متعدد ناول لکھے جس میں کڑ دھڑم، کامنی رنگے سیارے طوفانِ بدتمیزی، سر کہسار، جام سرشار، بچھڑی دلہن، پی گہاں، اور چنچل نار، شامل ہیں مگر ان کا ناول فسانہ آزاد، بہت مقبول ہوا۔

---

(1) بیسویں صدی میں اردو ناول۔از۔ڈاکٹر یوسف سرمست، ص 33

فسانۂ آزاد:

سرشار کا یہ شاہکار ناول جو 'اودھ اخبار'' میں بالاقساط شائع ہوا یہ ناول اس عہد کا شاہکار ہے۔''فسانہ آزاد'' کا موضوع دراصل لکھنوی زوال آمدہ یا زوال پذیر تہذیب ہے۔اس محدود دائرہ میں سرشار نے جو وسعت پیدا کی ہے وہ ان کے مشاہدے کی گہرائی کا ثبوت ہے۔انھوں نے زندگی کے ہر پہلو کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

سرشار کی ناول نگاری کے بارے میں وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ''سرشار اردو کے پہلے ناول نگاری ہیں جنھوں نے زندگی کے پھیلاؤ اور اس کی گہرائی پر احاطہ کرنے کی طرف روشنی ڈالی اور اردو ناول کو اس کے بالکل ابتدائی دور میں ایک ایسی روایت سے آشنا کیا جسے ضمنی عظمت کا پیشہ خیمہ کہنا چاہیے ،سرشار نے لکھنوی معاشرے کو اپنا موضوع منتخب کرنے کے بعد اس بات کو اپنا منصب جانا کہ اس معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کی اس طرح مصوری کریں کہ دیکھنے والے ان سب پہلوؤں کو جیتا جاگتا اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں''۔(1)

سرشار کا ناول ''فسانہ آزاد'' کی خوبیوں کو سراہاتے ہوئے ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں۔

> ''اس کے برخلاف فسانۂ آزاد لکھ کر سرشار نے بیسویں صدی کے ناول نگاروں پر ثابت کردیا کہ ناول میں اصل اور بنیادی چیز زندگی کی پیش کشی ہے''۔

سجاد حسین انجم:

مولوی نذیر احمد، سرشار کے بعد اردو ناول کو فروغ دینے میں سجاد حسین انجم کا بھی حصہ ہے۔انھوں نے کائنات حیات، شیخ چلی اور بھلا بھگت، کے نام سے تین قصے لکھے جو مزاحیہ انداز کے ہیں۔سجاد حسین کا مشہور

---

(1) وقار عظیم ''داستان سے افسانے تک''۔ص 76۔

ناول نشتر جو 1893ء میں شائع ہوا جو ایک تماش بین حسن شاہ کی سرگذشت ہے جو غالباً میری تقی میر کا ہم عصر تھا اور جس نے فارسی میں اپنی حیات اور اپنے عشق و محبت کے متعلق بے مثل کتاب لکھی تھی۔ انجم نے نہ صرف اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ بلکہ اپنی جگر کاوی اور خونابہ دل کی رنگ آمیزیوں کے ذریعہ ایسے طبع زاد ناولوں کی صفت میں لا کھڑا کر دیا۔

ناول ''نشتر'' کو اردو کا اہم ناول قرار دیتے ہوئے یوسف سرمست کہتے ہیں:

''نشتر'' اردو کا ایک بہت اہم ناول ہے۔عزیز احمد کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ یہ اردو کے چند اہم ناولوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے کیونکہ کرداروں کے والہانہ جذبات کی عکاسی اس میں بڑے ہی سلیقہ سے کی گئی ہے۔ ان کا یہ خیال بھی صحیح ہے کہ انگریزوں کے ڈیرہ دار طوائفوں سے تعلقات، ان کے ادبی مذاق اور ذوق پر صرف اسی ناول سے روشنی پڑتی ہے''۔(1)

سجاد حسین انجم کا شمار ان ناول نگاروں میں ہوتا ہے جس کے یہاں بیسویں صدی کے اہم رجحانات کے ابتدائی آثار اپنی واضح شکل میں پائے جاتے ہیں۔

عبدالحلیم شرر:

سرشار کے بعد اس دور کے بڑے ناول نگار عبدالحلیم شرر ہیں۔انھیں تاریخی ناول نگاری کا بانی کہا جاتا ہے۔ڈاکٹر یوسف سرمست عبدالحلیم شرر کی نمایاں حقیقت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''اردو ناول نگاری میں شرر کی نمایاں اور ممتاز حیثیت ان کی تاریخی ناول نگاری کی وجہ سے ان کے تاریخی ناولوں کی تعداد بھی ان کے دوسرے ناولوں سے کہیں زیادہ ہے''۔(2)

نذیر احمد نے اصلاح معاشرہ کا جو سلسلہ شروع کیا تھا۔شرر نے اسے جاری رکھا،شرؔر کا اسی بات پر

(1)ڈاکٹر یوسف سرمست بیسویں صدی میں اردو ناول،ص 67

(2)ڈاکٹر یوسف سرمست بیسویں صدی میں اردو ناول،ص

ایقان تھا کہ اسلاف کے شاندار کارناموں کو یاد دلا کر اخلاف میں ایک نئی قوتِ عمل، ولولہ اور جوش پیدا کیا جائے، چنانچہ انھوں نے تاریخ اسلام کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔

شرؔر نے تاریخی ناولوں کے کردار اور واقعات و مقامات تاریخ سے لئے ہیں۔ لیکن انہیں پیش کرنے میں مقامی فضا اور مقامی رنگ کو اختیار کیا ہے، شرؔر کے ناولوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ شرؔر کی جملہ تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(1) ''دلچسپ'' حصہ اول 1885، حصہ دوم 1886ء، (2) دلکش 1886ء (3) ملک العزیز ورجنا 1886ء، (4) حسن انجلینا 1998 (5) منصور وموہنا 1890ء (6) یوسف ونجمہ 1891ء (7) فلورافلورنڈا 1892، (8) ایا عرب (حصہ اول) 1899ء (9) فردوس بریں 1899ء (10) مقدس نازنین 1900ء (11) بدرالنساء کی مصیبت 1901ء (12) شوقین ملکہ 1904ء (13) فتح اندلس 1904ء (14) آغا صادق کی شادی 1908ء (15) قیس ولبنیٰ 1908ء (16) ماہ ملک 1908ء (17) فلپانا 1910ء (18) غیب داں دلہن 1910ء (19) زوال بغداد 1912ء (20) روضۃ الکبریٰ 1913 (21) حسن کا ڈاکو 1913ء (22) اسرار دربار ہرام پور 1914ء (23) خوفناک محبت 1915ء، (25) مفتوح فاتح 1914ء (26) بابک خرمی 1917ء (27) جویائے حق 1917 (28) بصیت چین 1919ء، (29) عزیزہ مصر 1920 (30) اسیر بابل (31) طاہرہ 1923ء (32) مینا بازار 1925ء (33) نیکی کا پھل 1926ء۔

عبدالحلیم شرؔر کے یہ تمام ناول دونوعیتوں کے حامل ہیں۔ معاشرتی یا رومانی اور تاریخی۔ شرر کے رومانی ناولوں میں ''بدرالنساء کی مصیبت'' اور ''آغا صادق کی شادی'' اہم سمجھے جاتے ہیں۔ دونوں بھی ناول معاشرتی موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ اور دونوں ناولوں میں پردے کو اصل موضوع بنایا گیا ہے۔

شرؔر کے تاریخی ناولوں میں ''ملک العزیز ورجینا'' ''منصور وموہنا، اور فردوس بریں، اہم ہیں۔ فردوس

بریں شرر کا حقیقی معنوں میں شاہکار ناول ہے۔

احسن فاروقی شرر کے ناولنگاری کی جائزہ لیتے ہوئے ان کا ناول ''فردوس بریں'' پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

''فردوس بریں کو شرر کی تمام زندگی کا حاصل اور فنکاری کا فردوسِ بریں ہے''۔(1)

اس طرح ڈاکٹر یوسف سرمست شرر کی تاریخی ناولوں کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''شرر کے سماجی اور معاشرتی ناولوں کے مقابلہ میں ان کے تاریخی ناول انھیں اردو ناول کی تاریخ میں ایک بلند مقام دیتے ہیں۔ کیونکہ صرف انھوں نے ناول کو ایک مقصد کے لئے استعمال کر کے اس کی وسعت کو ظاہر کیا''۔ (2)

اور اسی طرح آگے لکھتے ہیں:

اس طرح تاریخی ناول لکھ کر شرر نے فن کارانہ تخلیق کے ایک بڑے مطالبہ کو کسی نہ کسی حد تک پورا کیا۔ کیونکہ اس طرح انھوں نے انسان کی دلچسپی کا دائرہ ذاتی تجربے کی محدود فضا سے آگے بڑھایا''(3)

مذکورہ بالا دونوں اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرر کے تاریخی ناولیں اردو ناول نگاری میں ایک نیا باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر نگینہ جبین شرر کی ناول نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''شرر نے معارتی، تاریخی اور مذہبی ناول لکھے۔ شرر نے اسلام، اس کی تاریخی اور اس کی عظمت کا احساس دلاتے ہوئے مسلمانوں کو ان کی پستی کا احساس دلانے کی کی کوشش کی ہے''۔(4)

---

(1) حسن فاروقی ''اردو ناول کی تنقیدی تاریخ''،ص 119۔

(2) ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول،ص 144۔

(3) ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول،ص 144۔

(4) نگینہ جبیں ''اردو ناولوں کا سماجی اور سیاسی مطالعہ 1947 اس کے بعد،ص 34۔

شرر نے اردو ناولوں کے ارتقاء میں اپنے ناولوں کے ذریعہ اہم حصہ ادا کیا ہے۔ان کے رومانی ناولوں میں سماج کی عکاسی ملتی ہےاوران کے تاریخی ناولوں میں رومانی دنیا آباد نظر آتی ہے۔یہی رومانیت آگے چل کرہمیں نیاز فتحپوری اور دوسرے فنکاروں کے پاس نظر آتی ہے۔

حکیم محمد علی خاں طبیبؔ:

شرر کے معاصرین میں حکیم محمد علی طبیب بھی ہیں شرر کی طرح طبیب نے بھی تاریخی اور معاشرتی ناول لکھے ہیں۔طبیب نے شرر کی تقلید میں مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔حکیم محمد علی خان طبیب کے مشہور تاریخی ناول میں ’’عبرت‘‘جعفر وعباسیہ،نیل کے سانپ،اورخضر خان دیول دیوی،شامل ہیں اور معاشرتی ناولوں میں حسنِ سرور،اختر وحسینہ،گورا،ہیں۔

طبیبؔ کا ناول ’’عبرت‘‘ تاریخی ناولوں کی دنیا میں ایک کامیاب ناول ہے۔اس ناول میں سماجی، معاشرتی اور سیاسی حالات اپنی ساری پیچیدہ گیوں کے ساتھ قاری کو بڑے سلیقہ سے پیش کیا ہے اور یہ ناول طبیبؔ کی بہترین مکالمہ نگاری کا نمونہ ہےاور ساتھ ہی میں اس ناول میں منظر نگاری کے جاندار نمونے موجود ہیں۔

طبیبؔ کا دوسرا اہم ناول ’’جعفر وعباسہ‘‘ ہےاس ناول میں طبیبؔ نے عراقی کہانی کے ذریعہ،عورتوں کی بے پردگی سے پیدا ہونے والی برائیاں بیان کی ہیں۔اس ناول میں اس عہد کی پوری زندگی کی عکاسی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔طبیبؔ کا ایک اور تاریخی ناول خضر خان دیول دیوی‘‘بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناول میں طبیبؔ نے کہانی،کردار،مکالمے،ماحول،جذبات نگاری اور فلسفہ حیات یہ تمام چیزوں کو سلیقہ سے برت کراس میں ایک خاص آہنگ پیدا کردیا ہے۔اس ناول میں طبیبؔ نے علاوالدین خلجی کے عہد کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔

ناول ’’نیل کا سانپ‘‘بھی طبیبؔ کا ایک تاریخی ناول ہے۔اس میں ’’قلوپطرہ‘‘اور’’انتونی‘‘ کی قدیم

تاریخی داستان بیان کی گئی ہے۔

طیبؔ نے اپنے ناولوں کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز بن جائیں اس لئے ان کے تاریخی ناولوں میں اسلامی تاریخی کے اوراق ماضی کو تازہ کیا گیا ہے۔ اسلام کی تاریخی عظمتوں اور سربلندیوں کو دکھلانے کی کوشش کی ہے۔ان کے ناولوں کا مقصد مسلمانوں میں بجھے ہوئے جوش اور مردہ حوصلوں کو از سرِ نو زندہ کرنا تھا۔مختصر کہ طبیب تاریخ اسلام سے اپنے غیر معمولی شغف، ناول نگاری کی جداگانہ نوعیت اور اپنے ناول ''عبرت'' کی وجہ سے اردو ناول نگاری کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

منشی سجاد حسین:

اس عہد کے ناول نگاروں میں منشی سجاد حسین کا نام ایک اہم نال نگاروں میں لیا جاتا ہے۔

منشی سجاد حسین کے ناولوں میں (1) حاجی بغلول (2) کایاپلٹ (3) احمق الدین (4) اور میٹھی چھری ہیں۔یہ تمام ناول 1902ء سے پہلے چھپے ہیں۔

حاجی بغلولؔ:

منشی سجاد حسین کا یہ سب سے کامیاب ناول ہے اس ناول میں لکھنوی معاشرت کے جیتے جاگتے نمونے ملتے ہیں۔اس کے باوجود حاجی بغلول اردو ادب کا ایک ناقابل فراموش کردار ہے۔منشی سجاد حسین کا دوسرا مقبول ناول ''احمق الدین'' ہے۔اس ناول کا موضوع مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید کا عبرت ناک انجام ہے۔ سجاد حسین نے اس ناول میں انگریزی حکومت کی استعمال کی پالیسی کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔''احمق الدین'' اردو ادب کا ایک سدبہار اور غیر فانی کردار ہے۔

میٹھی چھری:

اس ناول کا موضوع نوابوں اور جاگیرداروں کی تعشات وغفلت سے ہونے والی تباہیاں ہے اس

ناول میں منشی سجاد حسین نے نوابوں اور جاگیرداروں کی عیش کوشی، نا عاقبت اندیشی اور بے عملی کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مالی اور معاشی حالات کے تباہ ہو جانے سے نفسیاتی زندگی میں جو الجھنیں پیدا ہوتی ہیں انھیں سجاد حسین نے بڑے فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ناول ''کایا پلٹ'' میں منشی سجاد حسین نے انگریزوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا اور اس بات پر طنز کیا ہے کہ انگریز لیڈر تو بن گئے ہیں لیکن ان کی باتوں میں خلوص ہے نہ سچائی اور نہ ہی وہ ہندوستانیوں کے حقیقی مسائل سے واقف ہیں سجاد حسین کا یہ ناول اپنے عہد کی سیاسی و معاشی زندگی کا آئینہ دار کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف سرمست سجاد حسین کی ناول نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سجاد حسین کے ہاں ان کے عہد میں ہونے والے واقعات کا جو بھر پور شعور ملتا ہے اس اعتبار سے نہ صرف انھیں بیسویں صدی کا گہرا شعور رکھنے والا ناول نگار کہنا پڑتا ہے، بلکہ انھیں سنجیدہ ناول نگار کہا جا سکتا ہے''۔(1)

اور آگے ان کے ناولوں کی خصوصیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

> ''اردو ناول نگاری میں ان کے پاس سب سے پہلے مزدوروں کے حقوق کا احساس ملتا ہے جو ان کی انسان دوستی اور محنت کش طبقہ سے سچی ہمدردی کا بین ثبوت ہے۔''(2)

مختصر یہ کہ اردو ناول میں سب سے پہلے سجاد حسین نے ہی برطانوی حکومت کی بے انصافیوں کو صحیح رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کے ناول اپنی فنی کمزوریوں کے باوجود اردو ناول نگاری کی تاریخ میں قابل ذکر مقام رکھتے ہیں اور یہی ان کی اہمیت ہے۔

قاری سرفراز حسین عزمیؔ:

قاری سرفراز حسین عزمیؔ بھی ان ناول نگاروں میں ہیں جو اردو ناول نگاری کو بہت کچھ دیا ہے۔ عزمی

---

(1) ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، ص69۔

(2) ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، ص75۔

نے 10 ناولیں لکھے ہیں: (1) سعید (2) سعادت (3) شاہد و رعنا (4) سزائے عیش (5) انجام عیش (6) سراب عیش (7) بہار عیش (8) خمار عیش (9) ثروت دلہن (10) مس عنبریں۔ عزمؔی نے اپنے تمام ناول اصلاحی نکتہ نظر سے لکھے ہیں اس نکتہ نظر میں بھی ان کے یہاں وسعت نہیں وہ صرف طوائف کی اصلاح ہی کو اپنے ناول کا موضوع بناتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کے ابتدائی تین ناول ''سعید'' ''سعادت'' اور شاہد و رعنہ، دوسرے ناولوں سے زیادہ اہم ہیں۔

مذکورہ بالا تین ناولوں میں شاہد و رعنا، عزمؔی کا بہت مقبول ناول ہے بلکہ یہ کہنا سچ ہوگا کہ عزمؔی کی شہرت اسی ناول کی وجہ سے ہے۔ قاری سرفراز حسین نے 'شاہد و رعنا' میں دہلی کی معاشرت پیش کی ہے زمانہ 1857ء کے بعد کا ہے۔ انگریزی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات بھی ناول میں مل جاتے ہیں اور دہلی کی مٹتی ہوئی تہذیب کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔

مجموعی اعتبار سے ''شاہد و رعنا'' ایک کامیاب ناول ہے اور قاری سرفراز حسین عزمؔی کے تمام ناولوں میں سب سے بہتر ناول ہے اور عزمی کی شہرت کا مدار بھی ''شاہد و رعنا'' ہی ہے۔

قاری سرفراز حسین عزمؔی نے اصلاحی مقصد کے پیش نظر معاشرے کے ناسور 'طوائف' کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ ان کے تمام ناولوں کا موضوع ''طوائف' اور اس کی زندگی ہے۔ انھوں نے طوائف کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔

نذیر احمد، سرشار، اور شرر کے ساتھ اردو ناول نگاری کا اولین دور ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد اردو ناول نگاری میں ناول نگاری کی ایک نئی کھیپ سامنے آتی ہے۔ جن میں سے بہت سے ناول نگار نے اپنی ناول نگاری کا آغاز انیسویں صدی کے آخری عشرے میں کیا اور بیسویں صدی کے دوسرے دہے تک سلسلہ جاری رکھا۔ جہاں ایک طرف ان ناول نگاروں کا گہرا رشتہ اپنے پیش روؤں اور ان کی قائم کردہ روایتوں سے تھا۔ وہیں دوسری طرف وہ بسیوں صدی کے ابتدائی دور کے نئے تقاضوں سے بھی آشنا تھے۔ لہذا ان کے ناولوں

میں قدیم وجدید دونوں ہی رجحانات اور طرز کا امتزاج ہے۔اسی عہد کے ناول نگاروں میں صرف مرزا رسوا اپنی حقیقت پسندی اور واقفیت نگاری کے سبب منفرد ممتاز ہیں اور اردو ناول نگاری میں سنگ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مرزا محمد ہادی رسؔوا:

رسوا نے جملہ پانچ ناول لکھے جن کے نام یہ ہیں (1) افشائے راز، (2) اختری بیگم (3) ذات شریف (4) شریف زادہ اور ''امراؤ جان آؔدا''۔ یہ تمام ناول معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ مرزا رسواء کا شاہکار ناول ''امراؤ جان ادا'' ہے اس ناول کا سن اشاعت کے تعلق سے صحیح معلومات نہیں ہے لیکن محققین کے مطابق یہ ناول 1899ء میں شائع ہوا تھا۔ کہنے کو تو اس ناول میں ''امراؤ جان'' نامی ایک لکھنوی طوائف کا قصہ ہے طوائفوں کا ذکر پہلے ناولوں میں بھی ملتا ہے۔لیکن اسی ناول میں رسوا نے لکھنو کے انحطاط پذیر معاشرے وہاں کی تہذیب کی اس کے علاوہ جذبات انسانی کی مصوری کا کمال دکھایا ہے۔

مرزا رسوا نے ''امراؤ جان آؔدا'' کے بعد ''شریف زادہ'' لکھا، اس ناول میں عابد حسین کی حیات بیان کی گئی ہے۔ ''شریف زادہ'' فنی اعتبار سے مکمل ہونے کے باوجود امراؤ جان ادا کی طرح شاہکار نہیں بن سکی۔ لیکن یہ ایک دلچسپ ناول ہے۔موضوع کردار نگاری، پلاٹ، نظریہ حیات اور اسلوب کے اعتبار سے شریف زادہ' ایک اچھا اور معیاری ناول ہے۔ ''شریف زادہ'' کے بعد رسواء نے ''ذات شریف'' لکھا۔ ''ذات شریف'' میں مرزا رسوا نے لکھنو کے چار سو بیسوں، سفید پوش لیڈروں کی سازشوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

''ذات شریف'' کے بعد رسوا نے ''اختری بیگم'' لکھا اور اس میں طبقاتی کشمکش کو اپنا موضوع بنایا۔

افشائے راز، امراؤ جان ادا، شریف زادہ، ذات شریف اور اختری بیگم کے علاوہ مرزا رسوا نے ایک جاسوسی ناول ''خونی شہزادہ' لکھا اور تقریباً پانچ ناول انگریزی سے ترجمہ کئے۔ حسب ذیل ہیں بہرام کی

رہائی،طلسمات،خونی جورو،خونی بھید،اور خونی عاشق۔رسوااردو ناول نگاری میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ سماجی حقیقت نگاری کو ناول سے روشناس کروایا۔

اردو ناول ابتداء سے 1900ء تک اپنی ارتقائی منزل کی طرف گامزن نظر آتا ہے۔اردو ناول کی ابتداء میں ناول نگاری کا رجحان اصلاحی تھا۔لیکن بعد میں سرشار،شرر،عزمی۔منشی سجاد حسین اور رسوا نے اپنے ناولوں کے ذریعہ ناول کو زندگی سے قریب کردیا۔اب سماجی حقیقت نگاری سیاسی ہلچل اور معاشی استحصال کا بیان بھی اردو ناول میں ہونے لگا۔اس طرح اردو ناول نے اپنے تشکیلی دور سے آگے بڑھ کر اپنے ارتقاء کی منزل کو پالیا۔1901ء کے بعد لکھے جانے والے ناول اپنے پیش رو ناولوں اور ناول نگاروں کو تیار کئے گئے منظر ہی کے سہارے آگے بڑھتے ہیں۔

☆☆☆

1900ء سے 1936ء تک کی ناول نگاری

انیسویں صدی کے اختتام میں اور بیسویں صدی کے اول میں سماجی مصلحین کی کوششوں کے زیر اثر زندگی کو نئے زاویہ سے دیکھا جانے لگا۔ بیسویں صدی کے ابتداء میں زندگی کا ایک وسیع اور ہمہ گیر تصور فروغ پا رہا ہے تھا اور ناول ہی وصف تھی جس کے ذریعہ ہر قسم کے موضوعات پر آزادانہ اظہار خیال کیا جا سکتا تھا اور زندگی کی نئی آگہی کو پورا تکمیل کے ساتھ پیش کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے اس دور کے ناول نگار انسان کو داخلی اور اندرونی احساسات اور جذبات کے آئینہ میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں اور ان کی یہی نفسیاتی بصیرت انھیں بیشتر ناول نگاروں سے جدا کرتی ہے۔

مرزا ظفر علی بیگ جو آغا شاعر قزلباس دہلوی کے نام سے مشہور ہیں ان کا تعلق اسی عہد سے ہے ان ناولوں میں ''ہیرے کی کنی''، ''ناہید''، ''ارمان'' اور ''نقلی تاجدار'' مشہور ناول ہیں۔ آغا شاعر دہلوی کا ناول ''ہیرے کی کنی'' کافی مقبول ہوا اس ناول میں آغا شاعر نے اپنی نفسیاتی بصیرت کا ثبوت دیا ہے اور ایک خاص بات انھوں نے اس ناول میں شعور کی رو تکنیک کا استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے ناول ''ہیرے کی کنی'' کی انفرادیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ آغا شاعر دہلوی کا ایک اور اہم ناول ''ارمان'' ہے اس ناول کا موضوع ایک خاندانی تنازعہ کا لم ناک انجام ہے۔ مجموعی طور پر اردو ناول میں نفسیاتی پہلو کی پیش کش میں آغا شاعر قزلباس نے نام کمایا۔

راشد الخیری:

اس دور کے ایک اہم ناول نگاروں میں راشد الخیری بھی اہم ناول نگار ہیں۔ ڈاکٹر یوسف سرمست

راشدالخیری کی ناول نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''شرر نے اپنی تاریخی ناول نگاری کے ذریعہ اسلام کی عظمت کو ظاہر کیا اور راشدالخیری نے اپنی ناول نگاری کی مدد سے مشرقی روایات کو قائم وباقی رکھنے کی کوشش کی...... راشدالخیری اپنے ناولوں کے ذریعہ وہی کام انجام دے رہے تھے جو اکبرالہ آبادی اپنی شاعری کے ذریعہ کر رہے تھے۔''(1)

راشدالخیری کے اہم ناول درج ذیل ہیں:

(1) آمنہ کالال (2) الزہرا، (3) سیدہ کالال، (4) عروس کربلا، (5) یاسمین شام، (6) ماہ عجم، (7) بیلہ میں میلہ، (8) نانی عشو، (9) انگوٹھی کا راز، (10) وداعِ خاتون، (11) جوہر قدامت، (12) منازل السائرہ، (13) حیات صالحہ، (14) بنت الوقت، (15) نوبت پنج روزہ، (16) سیلاب اشک، (17)، جوہر عصمت، (18) تمغہ شیطانی (19) تفسیر عصمت، (20) صبح زندگی، (21) شام زندگی، (22) شب زندگی، (23) نوحہ زندگی، (24) سراب مغرب اور (25) سمرنا کا چاند۔

راشدالخیری نے اپنے تمام ناولوں میں روایات اور تہذیب کی حفاظت کے لئے طبقہ نسواں کی مظلومی، توہم پرستی اور جہالت وتنگدلی کے خلاف آواز بلند کی اور اپنے ناولوں میں خاص طور پر خواتین ولڑکیوں کو تعلیم وتربیت اور ان کی معاشرتی زندگی کو موضوع بنایا۔ ڈاکٹر یوسف سرمست کہتے ہیں۔

''راشدالخیری اپنے ناولوں کے ذریعہ سماج کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اسی لئے انھوں نے عورتوں کی تربیت اور ان کی تعلیم کو بنیادی اہمیت دی کیونکہ یہی کل کے دن ماں بنتی ہیں''۔(1)

راشدالخیری کے ناولوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب کا موازانہ کرکے مشرقیت کی برتری ثابت کی ہے اور ان کے تمام ناولیں میں ہندوستانی خواتین کی گھریلو زندگی محورمرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔

---

(1) ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، ص 145۔

(1) ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، ص 146۔

راشدالخیری کے ناولوں کی زبان دلی کی ٹکسالی زبان ہے تشبیہ اور استعاروں کا برمحل استعمال، واقعات کی جذبات نگاری اور سیرت نگاری میں مولانا راشدالخیری ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ راشدالخیری کے ہم عصروں میں مرزا محمد سعید بھی ہیں۔ مرزا محمد سعید کی ناول نگاری 1905ء سے شروع ہوتی ہے مرزا محمد سعید نے دو ناول لکھے ہیں ان کا پہلا ناول خواب ہستی، ہے اور دوسرا ناول ''یاسمین'' 1908ء شائع ہوا۔

ڈاکٹر یوسف سرمست ان دوناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''ان دونوں ناولوں نے اردو ناول کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے ''خواب ہستی'' اور ''یاسمین'' میں سماجی حالات کے تغیرات اور فرد کی کشمکش کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے چونکہ فرد کی زندگی ادب کا مرکزی اور بنیادی موضوع ہوتا ہے''۔(1)

مرزا محمد سعید اعتدال پسندانہ نظریہ رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ مغربی اور مشرقی تہذیب کے درمیان راستہ کو اپنانے کا درس دینا چاہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں پر مقصدیت چھائی رہتی ہے۔

خواب ہستی:

مرزا محمد سعید اس ناول میں معاشرہ کی تبدیلیوں سے فرد کی نفسیات کیفیت پر ہونے والے اثرات کو چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست رقم طراز ہے۔

> ''خواب ہستی میں اگر چہ کہ معاشرہ کی تبدیلیوں سے فرد کی نفسیاتی کیفیت پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کو بڑی حد تک فنکارانہ طور پر پیش کیا گیا ہے''۔(2)

---

(1) ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول ،ص 151۔

(2)۔ ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول ،ص:152۔

اوراس ناول میں ''عشق مجازی'' کے ذریعہ ''عشق حقیقی'' تک پہنچنے کے مراحل بیان کئے ہیں۔اس ناول کا مرکزی کردار عثمان جوانتہائی تعلیم یافتہ اور ہنر مند ہے۔ڈاکٹر یوسف سرمست اس ناول کے مرکزی کردار کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

> ''خواب ہستی، میں عثمان کا کردار ناول میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔عثمان ابتدائی بیسویں صدی کا وہ نوجوان ہے جو معاشرہ کی تبدیلی اور اس کے انتشار میں اپنی راہ کو متعین نہیں کرسکا ہے''۔(1)

یاسمین

مرزا صاحب کا دوسرا ناول ''یاسمین'' جو خواب ہستی کے تین برس بعد 1908ء میں شائع ہوا۔اس کا موضوع ان خطرات کا بیان ہے ہماری خواتین کو خالص مغربی تعلیم دینے سے پیش آسکتے ہیں۔یہ ناول بھی ''خواب ہستی'' کی طرح اخلاقی واصلاحی ہے۔

بہرکیف مرزا محمد سعید کے دونوں ناول مشہور ومقبول ناول ہیں۔مرزا محمد سعید خود ایک تجربہ کار اور وسیع مطالعہ رکھنے والے فنکار ہیں۔علی عباس حسینی مرزا محمد سوعید کے عمیق مشاہدہ کو کچھ اس طرح سراہایا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''مرزا صاحب کی نظر وسیع ہے اور مشاہدہ عمیق وہ علم النفس کے ماہر ہیں اور ان کے قلم میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک چالاک ادیب اور فنکار ناول نگار کے ہنر ہے''۔(1)

اس عہد کے نئ اور پرانی قدروں کی کشمکش میں جہاں بعض قدروں کو قائم وباقی رکھنے کے لئے اوران میں امتزاج پیدا کرنے کے لئے راشد الخیری ،مرزا محمد سعید اور دوسرے ناول نگار جدوجہد کر رہے تھے ان میں ایک ''نیاز فتحپوری'' بھی شامل ہیں۔

---

(1) ڈاکٹر یوسف سرمست ،بیسویں صدی میں اردو ناول ،ص 152۔

(1) ناول کی تاریخ اور تنقید ،از:علی عباس حسینی ۔ص:311

نیاز فتحپوری:

نیاز فتحپوری کے دو ناول ہیں ایک ''ایک شاعر کا انجام'' جو 1913ء میں لکھا گیا۔ اور دوسرا ناول ''شہاب کی سرگذشت'' یہ دونوں ناول رومانی ناول ہیں۔ جس میں مذہب، فلسفہ محبت وعشق نکاح کی اہمیت اور سماجی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

نیاز فتحپوری کی ناول نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> ''نیاز نے اردو ناول کی اہم خدمات انجام دی اور اسکو نہ صرف ایک نئی وسعت سے روشناس کیا بلکہ اپنی رومانی بغاوت سے آئندہ آنے والے ناول نگاروں کے انقلابی رجحانات کے لئے راستہ صاف کیا ہے''۔(1)

نیاز فتحپوری کے ساتھ ایک اور نام آتا ہے وہ ہے ''کشن پرشاد کول'' ان کے پاس بھی نیاز فتحپوری کے رومانی بغاوت کے رجحانات ملتے ہیں۔

پنڈت کشن پرشاد کول:

کشن پرشاد کول نے دو ناول لکھے ہیں ایک ''شاما'' جو 1917ء میں شائع ہوا ہے اور دوسرا ''سادھو اور بسوا''، لیکن کشن پرشاد کول کا ناول ''شاما'' بہت مقبول ہوا اور ان کی پہچان بن گیا۔ ناول 'شاما' کی کہانی مذہب اور سماج کے گرد گھومتی ہے یہ ایک سماجی ناول ہے اور ان کا بنیادی مقصد 'ہندوستانی سماج اور خاص طور سے ہندو سماج میں عورتوں پر جو بیجا قسم کی سماجی اور مذہبی بندیشیں ہیں، ان کے خلاف احتجاج کرنا ہے اور اس ناول میں کول نے شاما کردار کے ذریعہ بیسویں صدی کے بعض سماجی وسیاسی تحریکوں پر روشنائی ڈالی ہے۔

کرشن پرشاد کول نے شاما میں ناول کے فن کو چابکدستی سے برتا ہے اور فنی نقطہ نظر سے یہ ایک اہم ناول ہے اور شاما سماجی مذہبی اور سیاسی عناصر داخل کرتے ہوئے کول نے اردو ناول کو بیسویں صدی کی ربع اول میں عصری حسیت سے روشناس کروایا جو ان کا اہم کارنامہ ڈاکٹر یوسف سرمست ناول ''شاما'' پر اظہار خیال

---

(1)۔ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول۔ص:167

کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شاما کا اردو ناول نگاری میں صرف اچھی کردار نگاری اردو ناول کے فن کو سلیقہ سے برتنے کے اعتبار ہی سے ممتاز مقام رہے گا بلکہ اس کی اہمیت اسی بناء پر بھی رہے گی یہ ناول اپنے اندر ''مباشی ناول'' کی بھی بہت خوبیاں رکھتا ہے''۔(1)

علی عباس حسینی:

اس عہد کے ایک اہم ناول نگار علی عباس حسینی بھی ہیں۔علی عباس حسینی،افسانوں، ڈراموں اور تنقیدی مضامین کے علاوہ ناول بھی لکھے ہیں۔علی عباس حسینی کے ناول یہ ہیں۔ (1) سر سید احمد یا خاف کی پری'' جو 1919ء میں لکھا۔اور دوسرا ''شاید کی بہار آئی'' تیسرا ناول ''زیٹیوں کا بادشاہ حکیم بانا'' لیکن ''ناول'' شاید کے بہار آئی اور ''زیٹیوں کا بادشاہ حکیم بانا'' یہ دونوں ناول 1954ء کے بعد شائع ہوئے ہیں لیکن انیسویں صدی کی دوسرے دہے میں لکھے جانے والا ناول صرف ''سر سید احمد یا خاف کی پری'' ہے۔اس ناول میں منظر کشی نہایت معتدل اور متوازن ہے مکالمے فطری ہیں اور زبان کی سادگی اور لطیف نفسیاتی اشارے ملتے ہیں یہ ایک رومانی ناول ہے۔

پریم چند اور ان کے ناول:

پریم چند اردو ناول کے ارتقاء میں ایک عہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔پریم چند کی ناول نگاری پچیس سال سے بھی زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔انھوں نے 1902ء سے 1936ء تک چھوٹے بڑے جملہ تیرا (13) ناول لکھے ہیں۔اور ان کے ناولوں میں کم وبیش وہ سبھی رجحانات دکھائی دیتے ہیں جو اس وقت کی ناول نگاری میں رائج تھے۔ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''پریم چند اردو ناول میں ایک عہد کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ وہ سارے

---

(1)ڈاکٹر یوسف سرمست،بیسویں صدی میں اردو ناول،ص172۔

رجحانات جو ابتدائی صدی 1939ء تک اردو ناول میں رہے۔ وہ کم و بیش کسی نہ
کسی صورت میں پریم چند کی ناول نگاری میں نمایاں ہوتے ہیں اس طرح ان کی
ناول نگاری ایک پورے عہد کی عکاسی کرتی ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پریم
چند کی ناول نگاری اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات سے راست
طور پر وابستہ رہی ہے"۔(1)

پریم چند کی ناول نگاری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پہلے دور میں پریم چند نے اسرار معابد، ہم خرو ہم ثواب، جلوہ ایثار، اور بیوہ لکھا۔ ناول فن کی ابتداء جن فنکاروں کے ہاتھوں ہوئی تھی اور معاصر ناول نگاروں نے ناول کے سرمائے میں جو کچھ وراثت کے طور پر پریم چند کو سونپی تھی (یعنی رومانیت کا اثر) اس کا اثر پہلے دور کے ناولوں میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے اس کے علاوہ داستانوں کی رومانیت نے پریم چند کے ذہن کا خمیر پیدا کیا تھا تو اسکے اثرات ابتدائی ناولوں پر پڑنے ضروری تھے۔ ان ابتدائی ناولوں میں ان کا ازالہ پوری طرح سے کردیا گیا۔ رومانی اثرات کے باوجود بھی ان ابتدائی دور کے ناولوں میں پریم چند کی اصلاحی مقاصد کا رنگ نکھرا ہوا ملتا ہے۔ بیل میل، شادی اور بیوہ کی دوبارہ شادی جو مسائل میں جو اس وقت کے سماج میں سب سے اہم تھے جو کہ ان ناولوں میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

ان کے دوسرے دور کے ناولوں میں بازارِ حسن، گوشہ عاضیت، نرملا اور غبن، شامل ہے۔ اسی دور کے ناولوں میں بھی سماجی اصلاح ہی ان کا مقصد رہا ہے۔ اس کے علاوہ اسی دور کے ناولوں پر اس وقت کے سیاسی ہلچل کا اثر بھی واضح طور پر ملتا ہے۔ طوائف بازی اور بیل میل ازدواجی زندگی، معاشی کشمکش، دیہی زندگی کی محرومیاں، جاگیرداری کی لعنت، کسانوں اور دیہاتوں کی اذیت ناک زندگی اور ان سے متعلق اونچا اور مفاد پرست طبقہ، باغیانہ اور انقلاب پسند ذہنیت، اعلیٰ وادنی کے مابین کشمکش، ہندوستانی کسانوں کی سیاسی وسماجی بیداری وغیرہ حقائق کو پریم چند نے اس دور کے ناولوں میں خوبی سے پیش کیا ہے اس وقت کے سیاسی

(۱)۔ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول۔ص:184

حالات سماج کے مظلوم افراد کو بھی بیداری کی طرف راغب کر رہے تھے۔

پریم چند کے تیسرے دور کے ناولوں میں ''چوگان ہستی'' پردہ مجاز، میدان عمل، گئودان، اور منگل سوتر ہیں چونکہ اس وقت تک پریم چند کا سیاسی شعور بیداری کی حد سے عمل میں تبدیل ہو چکا تھا اور وہ سرکاری نوکری سے مستعفی ہو کر عوام کی خدمت میں پوری طرح ملوث ہو چکے تھے۔ انھوں نے قلم کے ذریعہ قوم کی خدمت کا جو بیڑا اٹھالیا تھا اب اس پر پوری طرح متوجہ ہو چکے تھے۔ پریم چند نے اسی دور میں اپنا سب سے ضخیم ناول ''چوگان ہستی'' لکھا ہے جس میں کہ ہندوستانی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ ملتا ہے اسی دور میں پریم چند نے اپنے کرداروں کو مفاد پرست سیاست اور مفلوج سماجی اقدار سے منحرف دکھایا ہے۔ اور اپنے کرداروں کے ذہنی فکری معیار کو اس قدر بلند کر دیا ہے کہ معمولی سا بھکاری بھی عوام و خواص کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔

پریم چند کے ناولوں کے موضوعات میں دیہات یا دیہاتی زندگی ایک اہم عنصر ہے، ان کے ناولوں میں جہاں ایک مظلوم مزدور، کسان کی زندگی کی کشمکش ملتی ہے وہی جابر زمیندار، ٹھیکیدار، سرمایہ دار کے مظالم کی داستان بھی ملتی ہے۔ انھوں نے پسماندہ ہریجن طبقہ کے لئے بھی آواز اٹھائی ہے اور سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کی استحصال پسندانہ سازشوں سے غریب عوام کو آگاہ کرایا۔ پریم چند نے اپنے ناولوں میں پرانی فرسودہ رسوم و روایات کی برائیاں بیان کی ہیں، مذہبی ٹھیکہ داروں کے بے جا قیود سے لوگوں کو آگاہ کرایا۔ دیہاتی زندگی کے ساتھ ساتھ پریم چند نے ''شہری بابو'' مل مزدور، شہروں کی تیز رفتار زندگی اور شہری لوگوں کے مسائل کا اپنے ناولوں میں تذکرہ کیا۔ پریم چند کے ناولوں کے موضوعات بہت پھیلے ہوئے ہیں۔

پریم چند کے ناولوں کی زیادہ تر نوعیت دو طرح کی ہے۔ ایک اصلاحی اور دوسرے سماجی و سیاسی حقیقت نگاری پر مبنی ناول، اسرار معابد، ہم خرما و ہم ثواب، بازار حسن، نرملا، پردہ مجاز، بیوہ اور غبن، پریم چند کے اصلاحی ناول ہیں اور جلوہ ایثار، گوشۂ عافیت، چوگان ہستی، میدان عمل اور گئودان ان کے سماجی و سیاسی نوعیت کے ہیں۔

اسرار معابد:

یہ ناول پریم چند نے 1903ء تا 1905ء میں لکھا یہ ایک اصلاحی ناول ہے اس ناول میں انھوں نے مذہب کے نام پر کئے جانے والے استحصال کو ناول کا موضوع بنایا ہے اور مذہب کے ٹھیکہ داروں کی وجہ سے پیدا ہونے والی سماجی خرابیوں کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔

ہم خرما و ہم ثواب:

یہ ناول 1904ء میں لکھا گیا ہے اس میں بھی انھوں نے معاشرتی اصلاح کو ہی موضوع بنایا ہے جس میں مذہبی گمراہیوں کی جانب اصلاحی اشارے ملتے ہیں اور ہندو عورتوں کے سماجی مسائل اور خاص کر بیو گی کو موضوع بنایا گیا ہے اس ناول کا مرکزی کردار ''دھنک دھاری لال'' ہے جس کی تقریر کے ذریعہ پریم چند نے معاشرتی خرابیوں کو اجاگر کیا ہے۔

جلوہ ایثار:

یہ پریم چند کا پہلا اہم ناول ہے جس میں پہلی مرتبہ پریم چند نے دیہاتی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔اور طبقاتی کشمکش کا خاکہ بھی اس ناول میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> ''جولہ ایثار میں جہاں متوسط طبقہ کی زندگی پیش کی گئی ہے وہیں اس میں دیہاتی زندگی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند کو ابتدا ہی سے دیہاتی زندگی اور محنت کش طبق سے ہمدردی تھی۔(1)

اس ناول کی دوسری خصوصیات یہ ہے کہ پریم چند نے ''کم عمری کی شادی کے خلاف بھی آواز بلند کی اور ساتھ ہی بے جوڑ شادی کے مسئلہ پر اور اس کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی اور ساتھ ساتھ ہندوستانی عوام

---

(1) ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، ص 190۔

بالخصوص گاؤں کے باشندے تو ہم پرستی کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔

''جلوہ ایثار'' کے بعد پریم چند نے ''بازار حسن'' لکھا جو 1916ء میں شائع ہوا۔اس ناول کا موضوع ایک ایک طوائف کی زندگی ہے۔اس ناول میں سماجی اصلاح بالخصوص خواتین کے سماجی اور معاشرتی مسائل کو خصوصیات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔اور ایک طوائف کی زندگی کے ذریعہ ہندوستانی عورت کی ناگفتہ بہ حالات کی دردناک تصویر پیش کی ہے۔اس ناول میں ناول کے فن پر پریم چند کی گرفت مضبوط نظر آتی ہے۔ اس ناول پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> ''بازار حسن'' میں پریم چند نے ایک سماجی مسئلہ کو موضوع بنایا ہے۔لیکن اس ناول کا کینوس ان کی تمام پچھلی ناولوں سے وسیع ہے۔ وہ انفرادی مسائل کو اجتماعی زندگی کے پس منظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔انفرادی مسائل پوری سماجی زندگی سے جس طرح وابستہ ہوتے ہیں ان کے روابط کا تجزیہ پریم چند اس ناول میں زیادہ چابکدستی سے کرتے ہیں'' (1)

گوشۂ عافیت:۔

گوشۂ عافیت، پریم چند کے دوسرے ناولوں کی طرح ایک شاہکار ناول ہے۔ یہ ناول انہوں نے 1920ء میں لکھا۔اس ناول میں پریم چند نے پہلی بار واضح طور پر محنت کش طبقہ کی زندگی اور ان سے وابستہ بنیادی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ڈاکٹر یوسف سرمست اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''گوشۂ عافیت، میں ہندوستان کے سب سے بڑے طبقے یعنی دیہاتوں اور کسانوں کے احساسات اور ان کی جدوجہد کو پیش کیا گیا ہے گوشۂ عافیت، میں دیہاتیوں اور کسانوں کی زندگی کو اس تکمیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ ان سے متعلق رکھنے والے ہر طبقہ کی حقیقی خصوصیات سامنے آجاتی ہیں۔ (2)

---

(1) ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول۔ص،194

(2) ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول۔ص،198

ڈاکٹر محمد ایمن انصاری نے بھی گوشۂ عافیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ پریم چند نے اس ناول کو سماجی پستی اور معاشی بدحالی اور اس عہد کے سیاسی نظام کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''پریم چند نے اس ناول میں پہلی بار کسانوں کے بنیادی مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے گاؤں کی معاشرت اور کسانوں کی سماجی پستی اور معاشی بدحالی کو اس عہد کے سیاسی نظام کے پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے''۔(1)

گوشۂ عافیت کے بعد پریم چند نے ''نرملا'' 1923ء میں لکھا یہ بھی ایک اصلاحی ناول ہے اس ناول میں پریم چند نے بے جوڑ شادی کو موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست رقم طراز ہیں۔

> ''نرملا، میں پھر ایک بار پریم چند نے سماجی مسئلہ کو اپنی ناول کا موضوع بنایا ہے۔ اگرچہ اس ناول میں ان کی فنی پختگی پوری طرح نمایاں ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہندوستان کی معاشی اور سیاسی جدوجہد کو اپنا موضوع نہیں بنایا ہے۔(2)

پریم چند نے اس ناول میں جو بے جوڑ شادی کے مسئلے کا ہر پہلو سے جائزہ لیا ہے۔ اور ساتھ ہی جہیز کی غلط رسم ورواج کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اور بے جوڑ شادی کی وجہہ سے جہیز بنایا ہے ناول کی اس خصوصیات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ۔کے،کے، کھلّر لکھتے ہیں۔

> ''نرملا، پریم چند کا ایک معاشرتی اصلاحی ناول ہے جس میں بقول پریم نرائن ٹنڈن پریم چند نے ''ان مشکلات کا تجزیہ کیا ہے جو لڑکی کی شادی میں جہیز نہ دے سکنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ پندرہ برس کی نرملا کو جس کی جوانی کا کنول ابھی کھلا بھی نہیں ہے ایک چالیس سالہ شخص سے بیاہ دینا کتنا بھیانک پاپ ہے۔ یہی

---

(1) اردو ناولوں میں سماجی مسائل کی عکاسی۔از ڈاکٹر محمد ایمن انصاری۔ص،66

(2) بیسویں صدی میں اردو ناول۔ڈاکٹر یوسف سرمست۔ص،302

دکھانا اس ناول کا سماجی مقصد ہے''۔(1)

''چوگان ہستی''

یہ ناول پریم چند نے 1924ء میں لکھا۔اس ناول میں پریم چند ہندوستانی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔سیاسی اور سماجی حالات اس ناول میں بھرپور انداز میں سامنے آتے ہیں۔اس نام کا مرکزی کردار ''سورداس'' ہے جس کے ذریعہ پریم چند نے ہندوستان کی تحریک آزادی کی پوری جدوجہد کو پیش کیا ہے۔ڈاکٹر یوسف سرمست اس ناول کو سیاسی جدوجہد اور فلسفۂ عدم تشدد کی تفسیر کہتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

> ''اس میں ہندوستانی زندگی کے ہر رخ کو ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کے اہم ترین دور کو اس کی پوری وسعت کے ساتھ سمیٹ لیا گیا ہے ''چوگان ہستی'' ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کا مکمل اشاریہ ہے اور گاندھی جی کے فلسفہ عدم تشدد کی بھرپور تفسیر ہے عدم تشدد کی وہ جنگ جو مہاتما گاندھی کی سرکردگی میں ابتداء سے ناول کے لکھے جانے تک لڑی گئی پوری تصویر کشی ''چوگان ہستی'' میں ہوتی ہے۔(2)

''پردۂ مجاز'':۔

اس ناول کو پریم چند نے 1924-1925ء میں لکھا۔ڈاکٹر یوسف سرمست کہتے ہیں کہ:۔

> ''نرملا ''چوگان ہستی'' اور ''پردہ مجاز'' ایسے دور میں لکھے گئے ہیں جب کہ پریم چند کی تخلیقی قوت پوری شدت کے ساتھ بروئے کار آ گئی تھی''۔(3)

پردۂ مجاز ایک اصلاحی ناول ہے اور اس ناول میں انہوں نے مذہبی عقیدہ تناسخ کو موضوع بنایا ہے۔

اور اس ناول میں قدیم ہندوستانی تہذیب بیان کیا ہے۔

---

(1)اردو ناول کا نگارخانہ۔از کے کے کھلر۔ص،25

(2)ڈاکٹر یوسف سرمست۔بیسویں صدی میں اردو ناول۔ص۔702

(3)ڈاکٹر یوسف سرمست۔بیسویں صدی میں اردو ناول۔ص۔302

ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں کہ:۔

''پردہ مجاز'' میں اگر چہ پریم چند نے زندگی کے حقائق کو پس منظر بنایا ہے۔
لیکن ناول میں بنیادی اور مرکزی حیثیت تاریخ کے مسئلہ کو ہی حاصل ہے''(1)

بیوہ:۔

پردہ مجاز کے بعد پریم چند نے ''بیوہ'' 1932ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول پریم چند کے قدیم ناول ''پرتگیا'' کا ترجمہ ہے جو ہندی میں 1929ء میں لکھا تھا۔ پریم چند نے اپنے دوسرے ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی ہندوستان کی بدلتی ہوئی سیاسی و سماجی صورت حال کا بیان کیا ہے۔ اور خاص طور پر ہندوستانی سماج میں بیواؤں کے مسئلہ پر آواز بلند کی ہے۔

ڈاکٹر محمد ایمن انصاری اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''پریم چند نے اس ناول میں پورنا کے کردار کے ذریعہ بال بیواؤں کی بد نصیبی اور ہندو سماج میں ان کی بے چارگی اور کسمپرسی کی بڑی مؤثر عکاسی کی ہے''۔(2)

غبن:۔ 1935ء۔ ''بیوہ'' کے بعد پریم چند نے غبن لکھا یہ ناول بھی پریم چند کے دوسرے ناولوں کی طرح شہکار ناول ہے۔ یہ ایک گھریلو معاشرتی ناول ہے ڈاکٹر سید علی حیدر اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے پریم چند کے فنی ارتقاء پر اس طرح روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''غبن'' میں پریم چند کے فنی ارتقاء کے ایک خاص پہلو پر روشنی پڑتے ہے۔
وہ یہ کہ پریم چند راست طور پر سیاسی ہلچل کو پیش کیے بغیر بھی اس زمانے کی روح
کو اسیر کر لیتے ہیں۔ پریم چند کو ناول کے فن پر گرفت حاصل ہوگئی تھی یہ اس کی

---

(1) ڈاکٹر یوسف سرمست۔ بیسویں صدی میں اردو ناول۔ ص۔ 612

(2) ڈاکٹر محمد ایمن انصاری ''اردو ناولوں میں سماجی مسائل کی عکاسی۔ ص، 102

ایک مثال ہے ''غبن'' اگر چہ کہ بالکلیہ سماجی موضوع سے متعلق ہے لیکن یہاں
انہوں نے اس زمانہ کی سیاسی فضاء کو بھی بالکل نئے انداز سے اسیر کرلیا
ہے''(1)

''میدان عمل'':۔

پریم چند کا یہ ناول 1932ء میں شائع ہوا۔ پریم چند نے اس ناول میں ہندوستان کی قومی اور سیاسی جدوجہد اور حصول آزادی کی جدوجہد، کسان، مزدور تجارت پیشہ نوکری پیشہ طالب علم عورت امیر، غریب نادر اور پریشان حال اور اچھوتوں کے حالات زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر سید اعلیٰ حیدر اپنی کتاب ''اردو ناول سمت ورفتار'' میں اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''میدان عمل کا قصہ ہندوستان کی تحریک آزادی کا ایک عظیم اور طویل سلسلہ
ہے جس میں پورے ملک کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور ہر طبقہ کا ذکر ہوجاتا ہے
کسان، مزدور، تجارت پیشہ، نوکری پیشہ، طالب علم، عورت سب ہی اس تحریک
آزادی کے ہم نوا بن کر سامنے آتے ہیں ''میدان عمل'' میں امیر، غریب، نادار
اور پریشان حال اور مجبوری و ناداری سے سسکتے ہوئے لاچار اچھوتوں کے
حالات زندگی کی ترجمانی ہوتی ہے، غریب کسانوں کے گھر کے لیے زمین،
کھیت لگان اور دوسری پریشانیوں کے مسائل کو بھر پور ترجمانی پر زیادہ زور دیا
ہے''۔(2)

اور اسی طرح ڈاکٹر سید اعلیٰ حیدر اس ناول کے بارے میں آگے لکھتے ہیں:

''اس میں اپنے عہد کی سچی تصویر کشی ملتی ہے اور میں اپنے عہد تمام سماجی و

---

(1) اردو ناول سمت ورفتار۔از: ڈاکٹر سید اعلیٰ حیدر۔ص، 231

(2) اردو ناول سمت ورفتار۔از: ڈاکٹر سید اعلیٰ حیدر۔ص، 231

سیاسی سرگرمیوں کا مکمل نقشہ ہی موجود نہیں ہے، بلکہ مختلف سیاسی قوتوں کی رہنمائی بھی کرتی ہے میدان عمل، میں اپنے دور کے انسانوں کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے۔اس میں کامیاب ناول کی طرح زندگی کی تعمیر کا جذبہ ابھر کر سامنے آ گیا ہے''۔(1)

ڈاکٹر یوسف سرمست بھی اس ناول کی مقبولیت کو سراہتے ہوئے پریم چند کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میدان عمل'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ پریم چند کو اب ناول کے فن پر پورا عبور حاصل ہوگیا تھا وہ اس ناول میں اپنے پورے مواد کو انتہائی سلیقہ سے پیش کرتے ہیں۔ پریم چند ہندوستان کی پوری سیاسی سماجی اور معاشی زندگی کو اس ناول میں جس طرح سمیٹ لیتے ہیں۔اس کی مثال کسی دوسرے ناول میں نہیں ملتی''(2)

غرض پریم چند نے اپنے اس ناول میں محنت کش طبقے کو جدو جہد کی راہ بھی دکھائی اور سماج کے ہر طبقہ کی اصلاح کرنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے۔

گئودان:۔

میدان عمل کے بعد پریم چند نے اپنا شہکار ناول گئودان 1935ء میں مکمل کیا۔اس ناول میں بھی پریم چند نے محنت کش طبقے کی زندگی اوران کے مسائل کو موضوع بنایا ہےاور دیہاتی زندگی کا شہروں میں منتقل ہونا، دیہاتی اور شہری زندگی کی کشمکش، ان تمام موضوعات کو پریم چند نے اپنے اس ناول میں بیان کیا ہے۔اس کا مرکزی کردار ''ہوری'' ہے جو ایک کسان ہے پریم چند نے ہوری کے ذریعہ کسانوں کے شعور کو پیش کیا ہے دیہاتی حقائق کی سچائی گئودان کے ہر صفحہ پر مل جاتی ہے۔ڈاکٹر یوسف سرمست گئودان کو پریم چند کی ناول

(1)اردو ناول سمت ورفتار۔از: ڈاکٹر سید علیٰ حیدر۔ص، 531

(2)ڈاکٹر یوسف سرمست۔بیسویں صدی میں اردو ناول۔ص 144

نگاری کی فنی پختگی اور ارتقاء کی معراج کہتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''بہر حال گئو دان پریم چند کی ناول نگاری کی فنی پختگی اور ارتقاء کی معراج ہے پریم چند کی ناول نگاری ہندوستان کے سیاسی ،سماجی اور معاشی وسائل سے وابستہ ہو کر خوب سے خوب تر ہوتی گئی اور آخر میں ہندوستان کے کروڑ گا باشندوں یعنی دیہاتو کی زندگی کو ان کے طبقاتی ،سماجی اور معاشی پس منظر میں پیش کر کے اردو ناول کو حقیقت نگاری اور زندگی کی وسعتوں اور پہنائیوں کو سمیٹنے کا سلیقہ بخش دیا۔اس طرح ''گئو دان'' اُردو ناول نگاری میں ایک روشنی کا مینار ،اور سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے''۔(1)

مختصر یہ کہ گئو دان اپنے وقت کے نظام کے خلاف ایک ذہنی بغاوت تھا۔گئو دان نے اردو ناول کو ایک ایسی وسعت سے نوازا جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

الغرض پریم چند کے ناولوں نے ادب میں ایک نئی راہ پھونک دی اور ملک کے پڑھے لکھے طبقے کو آنے والے انقلاب کے لیے تیار کیا۔اردو ناول جو نہایت جذباتی اور رومانی تھا اسے ایک نئی زندگی بخشی مختلف لوگوں کے درمیان پل باندھے اردو فکشن میں بلکل نئی آواز تھے۔ڈاکٹر سید اعلیٰ حیدر، پریم چند کے بنیادی مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''انہوں نے صحیح منوں میں ایک انقلابی فنکار کی حیثیت سے اپنے عہد کی تحریکوں میں حصہ لیا پریم چند نے مکمل طور پر عصری آگہی کا ثبوت دیا ہے اور وقت کے تقاضے کو پورا کرتے ہوئے اپنے گردوپیش کے حالات کی عکاسی کی ہے پریم چند پہلے ادیب ہیں جن کی نظر اونچے محلوں کی طرف نہ جا کر کچے مکانوں اور جھونپڑیوں پر جمہ اوران ٹوٹے پھوٹے کچے مکانوں میں دھول میں لپٹی ہوئی ہندوستانی زندگیوں کو دیکھا پھٹے کپڑوں میں فطری زندگی کے مناظر کا

---

(1)ڈاکٹر یوسف سرمست''بیسویں صدی میں اردو ناول۔ص،142

> مطالعہ کیا اور غربت سے پستے ہوئے انسانوں میں زندگیوں کا سراغ تلاش کیا اور انہیں میں لذت محسوس کی اور یہی ان کی عظمت کا راز ہے۔انہوں نے اپنے انسانیت دوستی کے جذبہ کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا اور بڑے دلیرانہ انداز میں سماجی بندھن اور مذہبی پابندی سے لڑتے رہے اور اپنی چھپن برس کی زندگی اور چھتیس برسوں کی ادبی زندگی میں چودہ مکمل اور ایک نامکمل ناول چھوڑ گئے۔جن میں ''گئو دان'' میدان عمل،اور غبن،ان کے عظیم ناول ہیں جو اردو ناول نگاری کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں''۔(1)

اردو ناول کے اس بیسویں صدی کے دور میں جہاں پریم چند اور دوسرے ناول نگاروں نے جو خدمات انجام دی ہیں اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔پریم چند کے ہم عصروں میں کچھ اور ناول نگار بھی اہمیت کے حامل ہیں۔جیسے قاضی عبدالغفار،مجنوں گورکھپوری،عظیم بیگ چغتائی،ل،احمد،فیاض علی،وغیرہ اہم ناول نگار ہیں جیسے ڈاکٹر یوسف سرمست نے ان ناول نگاروں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پریم چند کی زندگی ہی میں جو ناول نگاروں کی نئی ادبی نسل ابھر آئی تھی اس میں قاضی عبدالغفار،مجنوں گورکھپوری،عظیم بیگ چغتائی،ل،احمد وغیرہ شامل ہیں، یہ سب ناول نگار انگریزی اور مغربی ادب سے خاص طور پر متاثر ہیں۔مجنوں گورکھپوری کا ذکر ناول نگاری کی حیثیت سے کبھی کیا ہی نہیں جاتا،حالانکہ ان کے افسانے اصل میں ناولٹ ہیں اور اگرچہ کہ ان کا مرکزی خیال زیادہ تر ہارڈی کے ناولوں سے لیا گیا ہے۔پوری فضا ہندوستانی ہے اس تعلق سے تفصیلی بحث آگے آئے گی۔بہر حال ربع ثانی کے پہلے دہے میں پریم چند کی ناول نگاری کے ساتھ اور اس کے متوازی ناول نگاری کا ایک دوسرا ہجان ملتا ہے جو ترقی پسند

---

(1)اردو ناول سمت و رفتار۔از:ڈاکٹر سید اعلیٰ حیدر۔ص،72۔621

تحریک اور اس تحریک کے زمانے میں ہونے والی ناول نگاری کے لیے راہ ہموار کرتا ہے"۔(1)

قاضی عبدالغفار:۔

قاضی عبدالغفار پریم چند کے دور کے ایک ممتاز ناول نگار ہیں انہوں نے دو ناول لکھے ہیں (1) لیلیٰ کے خطوط (2) مجنوں کی ڈائری۔ ان دونوں ناولوں میں انہوں نے عورتوں کی مظلومیت اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی حالت کو موضوع بنایا ہے۔ قاضی عبدالغفار کے ان دونوں ناولوں کا اسلوب خطوط کی شکل میں ہے۔ڈاکٹر نگینہ جبیں لکھتی ہیں:

> "رومانی ناولوں کے ضمن میں قاصی عبدالغفار کے ناول "لیلیٰ کے خطوط 1931ء اور مجنوں کی ڈائری، مصنفہ 1934ء اہمیت کے حامل ہیں ناول کا عنوان خود اپنے اسلوب کی نشان دہی کرتا ہے ۔یہ ناول بھی خطوط کی شکل میں لکھا گیا جو مغرب میں ناول کے ابتدائی دور میں ایک محبوب اسلوب سمجھا جاتا تھا۔(2)

لیلیٰ کے خطوط:۔

اس ناول میں ایک طوائف کی داستان بیان ہوئی ہے دراصل اس طوائف کے کردار کے ذریعہ قاضی عبدالغفار نے عورتوں کی مظلومیت کو بیان کیا ہے۔ اور ساتھ میں ایک طوائف کے ذہنی ارتعاشات کو بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔لیلیٰ سوداگری کے عالم میں بھی تماشائی ہو کے ہندوستان کے تمدن کا کھیل دیکھتی ہے۔اور طنز، گہرے چبھتے ہوئے طنز سے، اسے بیان کرتی ہے۔ وہ سماج پر صرف طنز ہی نہیں کرتی۔ بلکہ اس سے شدید نفرت اور بیزاری کا اظہار بھی کرتی ہے۔لیلیٰ کو مردوں پر اعتبار نہیں۔ وہ ان کی حجت کو جھوٹا اور نقلی

---

(1)ڈاکٹر یوسف سرمست۔بیسویں صدی میں اردو ناول۔ص،552

(2)اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ 1947ء اور اس کے بعد۔از:نگینہ جبیں۔ص،34

سمجھتی ہے۔

قاضی عبدالغفار اس ناول میں لیلیٰ اور اس جیسی لاکھوں عورتوں کی وکالت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی یہ کوشش اس دور کے مزاج اور معاشرہ کے برعکس تھی مصنف کی یہ جسارت لائق صد تحسین ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ''لیلیٰ کے خطوط'' ایک طوائف کی زندگی کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد ایوب تاباں ''لیلیٰ کے خطوط'' کی خصوصیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''لیلیٰ کے خطوط'' کے وسیلے سے قاضی عبدالغفار نے ایک نئے اور بالکل اچھوتے انداز سے صنف نازک کی محرومیوں اور دشواریوں کا نہایت دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ جو قاری کے ذہن پر خاطر خواہ تاثر مرتب کرتا ہے۔ دراصل مصنف کا مقصد ہی یہ تھا کہ مردان خطوط کی روشنی میں اپنا تزکیہ نفس کرنے پر مجبور ہو جائیں اور ان کی سوچ کے نئے نت نئے راہیں کھل سکیں تاکہ بے بس و بیکس مخلوق صنف نازک کا مزید استحصال نہ ہو اور انہیں بھی تعلیم و ترقی کے یکساں مواقع مہیا ہو سکیں جو اس زمانے میں ہندوستانی مردوں کو حاصل تھے اپنے مقصد کے حصول کے لیے مصنف نیا اس دور کے علمائے دین اور رہبران قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی ہے''(1)

اسی طرح ڈاکٹر محمد ایوب تاباںؔ آگئے لیلیٰ کے خطوط کی ایک اور خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''لیلیٰ کے خطوط'' کی اہم صفت یہ بھی ہے کہ وہ روش عام سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں یعنی ایک ایسے معاشرے میں جہاں صرف مرد کی حکمراں حیثیت تسلیم کی گئی ہو اور عورت مجبور محض ہو اس کی حالت غلاموں سے کچھ زیادہ بہتر نہ ہو اور بیوی تک نہایت خادمہ کا درجہ رکھتی ہو، ایسے معاشرے میں ایک جنسی بازاری

---

(1) قاضی عبدالغفار ایک ممتاز نثر نگار۔ از: ڈاکٹر محمد ایوب تاباںؔ۔ ص، 351

نہایت حقارت سے اتنی بے باک اور آزادروی کے ساتھ تمام مردوں پر تنقید
کرے جہاں جنسی مخالف یعنی مرد چاپلوسی، خوشامد اور کثیر زرخرچ کرنے کے
باوصفت محض عارضی مسرت کا حق رکھتا ہو۔لیلیٰ اپنے عشاق کی طویل فہرست
میں کسی ایک کو بھی اس کا اہل نہیں سمجھتی کہ وہ صحیح معنوں میں ازدواجی زندگی کی
خوشیاں اس کے دامن میں مہیا کرنے کا متحمل ہو سکے گا۔ یہ سب کچھ اسے
زندگی کے تلخ تجربوں نے سکھا دیا ہے''۔(1)

الغرض قاضی عبدالغفار نے لیلیٰ کے کردار کے ذریعہ عورت کی مظلومیت کی خونچکاں داستان بڑے مؤثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔

مجنوں کی ڈائری:۔

''مجنوں کی ڈائری''میں قاضی عبدالغفار نے اپنے عہد کے ہندوستانی نوجوانوں کے سماجی وتہذیبی اور اخلاقی زوال کو موضوع بنایا ہے۔

''مجنوں کی ڈائری'' پر روشنی ڈالتے ہوئے قاضی عبدالغفار نے یوں اظہار خیال کیا ہے:

''چند الفاظ میں عرض کردوں کہ میرا موضوع کیا ہے؟ دورجدید کے وہ
نوجوان جو تعلیم یافتہ کہے جاتے ہیں اور جو زندگی کی کشمکش سے فارغ رہ کر اپنے
جذبات اور محسوسات کی زنجیریں کھول دیتے ہیں ہمہ تن ایک جہل مرکب بن
جاتے ہیں،اور زندگی کے مسلمات سے بے نیاز اور بے خبر ہو کر اپنے لیے جہل
مطلق کی ایک نئی دنیا بنا لیتے ہیں''۔(2)

جس طرح پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ قاضی عبدالغفار نے مجنوں کی ڈائری''میں ہندوستانی نوجوانوں کے سماجی تہذیبی زوال کو موضوع بنایا ہے۔لیکن ان سب کے لیے وہ کبھی نوجوانوں کو ذمہ دار نہیں مانتے بلکہ

---

(1) قاضی عبدالغفار ایک ممتاز نثر نگار۔از: ڈاکٹر محمد ایوب تاباں۔ص، 551

(2) بحوالہ:۔ڈاکٹر محمد ایمن انصاری'اردو ناولوں میں سماجی مسائل کی عکاسی۔ص 122

سماج کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ مانتے ہیں کہ شخصیت کو غیر متوازن ،مغربی تعلیم جوان نوجوانوں کو ملتی ہے جس میں وہ بی ،اے یا ایم ،اے اور ڈاکٹر اور علامہ کو پیدا کر دیتی ہے ،مگر انسان پیدا نہیں کر سکتی اور اس کے ساتھ مذہبی رہنمائی سے بھی محروم رہتے ہیں۔

ناول کا ہیرو مجنون اس نوجوان نسل کا نمائندہ ہے وہ ایک ذہنی خلفشار میں مبتلا ہے وہ زندگی کے ہر شعبے میں چاہے وہ سیاست ہو یا اخلاق یا مذہب ، پرانی اقدار سے بغاوت کرتا ہے اور اپنے طور پر نئی اقدار بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں کہ:

''اس طرح قاضی عبدالغفار کا یہ ناولٹ بیسویں صدی کے نوجوانوں کے اہم ذہنی رجحانات کو بڑی ہی عمدگی سے پیش کرتا ہے'' (1)

اور آگے ڈاکٹر یوسف سرمست ''مجنون'' کے کردار پر روشنی ڈالتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں جب ایک بڑی جنگ لڑی جا چکی تھی اس کے بھیانک نتائج پھیل چکے تھے۔ اور دوسری جنگ کا خوف ساری دنیا پر چھایا ہوا تھا۔ دنیا کا ہر فرد ایک ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا۔ پرانی قدروں کی شکست و ریخت ہو رہی تھی۔ اور نئی قدریں ابھی پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ اس انتشار کو قاضی عبدالغفار کا ''مجنون'' پوری شدت سے محسوس کرتا ہے اور اس کو بیان کر سکتا ہے اس لیے وہ ان حالات کے پیش نظر کہتا ہے۔ (2)

لہٰذا قاضی عبدالغفار اپنے ناولوں میں نوجوان نسل کو صحیح تعلیم و تربیت دینے کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور اعلیٰ قدروں کو اپنانے کی بات کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نگینہ جبیں نے قاضی عبدالغفار کے ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

---

(1) بیسویں صدی میں اردو ناول۔ ڈاکٹر یوسف سرمست۔ ص، 762

(2) بیسویں صدی میں اردو ناول۔ ڈاکٹر یوسف سرمست۔ ص، 765

> ''قاضی عبدالغفار نے اپنے ناولوں میں اس باغیانہ جذبے کی ترجمانی کی ہے جو سماج اور مذہب کے کسی بھی اصول کو نہیں مانتا اور ہر طرح کی بندشوں سے آزاد رہنا چاہتا ہے کیونکہ اسے ملک کے ان حالات سے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد پیدا ہو گئے تھے نہ سماج پناہ دے پاتا ہے اور نہ مذہب کوئی ذہنی سکون نتیجہ یہ ہوا کہ نئی نسل نے ان اصولوں سے انحراف کیا ہے''۔(1)

مجنوں گورکھپوری:۔

مجنوں گورکھپوری کے دو ناول ہیں (1) ''زیدی کا حشر'' اور دوسرا ''سوگوار شباب'' لیکن سوگوار شباب'' کا سنہ اشاعت 1944ء ہے لہٰذا زیر بحث میں ''سوگوار شباب'' نہیں ہے لیکن ''زیدی کا حشر'' 1928ء کے آس پاس لکھا گیا۔ یہ وہی اردو ناول کا دور ہے جس میں نئی اور پرانی قدروں کو جھٹلانے میں تیزی پیدا کر دی تھی۔ ڈاکٹر یوسف سرمست مجنوں گورکھپوری کی ناول نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

> ''مجنوں کی ناول نگاری کی اصلی اہمیت بھی اس بات پر منحصر ہے کہ ان کے ناول اس دور کے ناول نگای کے اور اس دور کے اہم رجحانات کی پوری نمائندگی کرتے ہیں۔ان ناولوں کے کردار مروجہ اخلاقی اور مذہبی پابندیوں میں جکڑے ہوتے نہیں ہیں۔ خاص طور سے محبت اور شادی کے معاملات میں ان کے کردار مروجہ سماجی اور اخلاقی بندشوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔(2)

عظیم بیگ چغتائی:۔

اس دور میں ناول لکھنے کے لیے مختلف اسلوب اپنائے گئے ہیں چنانچہ عظیم بیگ چغتائی نے مزاحیہ ناول نگاری سے اس دور میں اپنی پہچان بنائی ہے ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> ''عظیم بیگ چغتائی نے مزاحیہ ناول نگاری کو مستقل طور سے اپنا کر ایک

---

(1) اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ 1974ء اور اس کے بعد۔از: نگینہ جبیں۔ص،342

(2) بیسویں صدی میں اردو ناول۔ڈاکٹر یوسف سرمست۔ص،672

اختصاصی حیثیت حاصل کرلی ہے۔یوں تو سجاد حسین ایڈیٹر''اودھ پنچ'' نے سب سے پہلے مکمل مزاحیہ ناول ''حاجی بغلول'' لکھا لیکن مزاحیہ ناول نگاری کو بیسویں صدی میں ایک مستقل حیثیت اور صورت دینے میں عظیم بیگ چغتائی کا بڑا ہاتھ ہے عظیم بیگ چغتائی کی ناول نگاری صرف مزاحیہ ہی نہیں ہے انہوں نے ہنسنے ہنسانے ہی کو اپنا مقصود نہیں بنایا ہے بلکہ انہوں نے اس دور کے دوسرے ناول نگاروں کی طرح سماجی اور اخلاقی بندشوں سے بغاوت کی ہے''(1)

اور اسی طرح ڈاکٹر یوسف سرمست عظیم بیگ چغتائی کے ناول ''چمکی'' کے حوالے سے ان کے ناولوں کی خصوصیات اور مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''سماجی زندگی کی خرابیوں کو نمایاں کرنے کے علاوہ عظیم بیگ چغتائی ناول نگار کے اہم فرض یعنی انسانی جذبات کو پیش کرنے سے بھی خوب واقف ہیں۔ یوں تو ان کے مختلف ناولوں میں یہ صلاحیت جگہ جگہ نظر آتی ہے۔لیکن اسی لحاظ سے ان کا ناول ''چمکی'' شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے چونکہ اس میں مختلف عورتوں کے مختلف جذبات کو بہترین طریقہ سے پیش کیا گیا ہے اس میں ایک 'بڑی بی' کے معاشقے کو پیش کرتے ہوئے ایک بڑ عمر کی عورت ایک نوجوان مرد کے لئے ماورانہ جذبات رکھتی ہے اس کو بھی پیش کرنے میں عظیم بیگ چغتائی نے کمال کردکھایا ہے''۔(2)

فیاض علی:

اس دور کے اہم ناول نگاروں میں فیاض علی بھی شامل ہیں۔فیاض علی نے دو ناول ''شمیم'' اور ''انور'' لکھے ہیں۔''شمیم'' 1924ء میں لکھا اور کچھ سال بعد انور شائع ہوا یہ دونوں ناول بہت ہی مقبول ہوئے۔

---

(1)،(2) بیسویں صدی میں اردو ناول۔ڈاکٹر یوسف سرمست۔ص،285

ناول شمیم عشق ومحبت کی کہانی ہے ڈاکٹر یوسف سرمست اس ناول پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''شمیم'' میں مقبولیت حاصل کرنے کی تمام صفات موجود ہیں۔عشق ومحبت، تجسس اور سنسنی خیزی، کسی قدر سراغ رسائی اور پھر ہیرو ہیروئن کا ملاپ ''شمیم'' ناول کا ہیرو ہے جو پڑھا لکھا بھی ہے' دولت مند بھی، جو حسن سیرت بھی رکھتا ہے اور حسن صورت بھی، جو بہادر بھی ہے غیور بھی، جو بزلہ سنج بھی ہے اور ذہن بھی، غرض دنیا جہاں کی ساری خوبیوں سے متصف ہے یہی خصوصیات مقبول ناول کی امتیازی خصوصیات ہیں''۔(1)

شمیم کی طرح انور بھی ایک مقبول ناول ہے یوں تو اردو میں بہت مقبول سنجیدہ ناول لکھے گئے یہ سنجیدہ ناول ابتدائی ہی سے لکھے گئے اسی طرح سے شمیم اور انور بھی سنجیدہ ناول کی حیثیت سے بہت مقبول ہوئے۔

ڈاکٹر یوسف سرمست ناول ''انور'' پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی خصوصیات کو اس طرح سے سراہا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''انور، شمیم، سے کسی قدر اہم ناول ہے کیونکہ ''انور'' میں کرداروں کی یکسانیت اور اُ کتا دینے والی کیفیت نہیں ملتی۔اس میں کشور سلطانہ اور مہ جبیں بالکل علیحدہ اور منفرد نظر آتے ہیں۔یہی حال انور اور ممتاز کا بھی ہے۔یہ دونوں اپنا اپنا بالکل نمایاں ہے۔اس کے علاوہ ایک اور اہم بات جو اس کی قابل ذکر ہے وہ یہ کہ اس کے مکالموں کے ذریعہ اس عہد کے ان ذہنی رجحانات اور تشکیک پر کہیں کہیں روشنی پڑتی ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے خاص طور پر ممتاز کے خیالات بڑی حد تک عام سماجی اور مذہبی اصولوں اور بندشوں سے انحراف کرتے نظر آتے ہیں''۔(2)

---

(1)بیسویں صدی میں اردو ناول،از ڈاکٹر یوسف سرمست،ص290۔

(2)بیسویں صدی میں اردو نالو،از ڈاکٹر یوسف سرمست،ص291۔

ل۔احمد:

ل۔احمد کا ناول ''فسانہ محبت ہے یہ ناول 1935ء میں لکھا گیا اس ناول کا موضوع ہندوستان کی ازدواجی زندگی ہے،ل،احمد رومانی تحریک سے زیادہ متاثر رہے ہیں۔اس لئے ان کے اس ناول میں سیاسی پس منظر دب کررہ گیا ہے۔ ناول مکمل رومانی ہےاوراس کے ساتھ ہی اس میں ایک مکمل ازدواجی زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ڈاکٹر یوسف سرمست اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی خصوصیات کواس طرح بیان کیاہے:

> ''ناول کی اہمیت تمام تر ازدواجی زندگی کی چھوٹی بڑی الجھنوں کی پیش کشی اوران کی گرہ کشائی پر مشتمل ہے۔یہاں دکھایا گیا ہے کہ میاں بیوی کے مزاجوں میں فرق ہونا بالکل قدرتی بات ہے لیکن اس تفرقہ کو ختم کرنے میں ہی ازدواجی زندگی کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔یہاں یہ بات بھی پیش کی گئی ہے کہ ازدواجی زندگی میں جذباتی ٹکراؤ بھی ناگزیر ہے کیونکہ مرد ایک خاص نفسیاتی زندگی بسر کرنے کا عادی ہوتا ہےاورعورت کی اپنی الگ نفیساتی حالت ہوتی ہے۔شادی کے بعد ان دو مختلف نفسیاتی حالتوں کو ہم آہنگ کرنا ہی سب سے اہم مسئلہ ہوتا ہے۔ناول میں ازدواجی زندگی کی ان ہی نفسیاتی الجھنوں اور کیفیتوں کو سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے۔''(1)

بیسویں کے دوسرے دہے یا تیسرے دہے یعنی پریم چند کے ہم عصروں جو 1936ء سے قبل اردو ناول نگاری میں اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔بے شک وہ قاضی عبدالغفار عظیم بیگ چغتائی مجنون گورکھپوری،فیاض علی،ل احمد وغیرہ ہیں۔

قاضی عبدالغفار نے ''لیلیٰ کے خطوط'' اور ''مجنوں کی ڈائری'' اورعظیم بیگ چغتائی ''چمکی'' مجنوں

---

(1)بیسویں صدی میں اردو ناول،از ڈاکٹر یوسف سرمست،ص 93-292۔

گورکھپوری کے ناولٹ اور فیاض علی ''شمیم'' اور ''انور'' اور ل احمد نے ''فسانہ محبت'' لکھ کر سماج کے جن مسائل کی عکاسی کی ہے وہ عورتوں کی سماجی سیاسی معاشی اور جنسی آزادی اپنے عہد کی فرسودہ مذہبی اور سماجی قدروں سے بیزار نئے سماج کی تعلیم کا خواب تحریک آزادی، سماجی واصلاحی تحریکات وغیرہ کو اپنے ناولوں میں موضوع بنایا۔

بہر کیف اس عہد کے تمام ناول نگاروں نے اپنے رومانی رجحانات کے سبب اردو ناول نگاروں میں اہمیت رکھتے ہیں۔ ان ناول نگاروں کے رومانی وانقلابی رجحانات کی لہر بعد کو ترقی پسند شاعروں، ادیبوں اور ناول نگاروں کے یہاں زیادہ گہرائی و گیرائی اور وسعت کے ساتھ نمایاں نظر آتی ہے۔ مختصر یہ کہ 1900-36 کے دور کی ناولوں کی بہت سی خصوصیات رہی ہیں۔ اس میں کئی تجربہ ہوئے ہر لحاظ سے شعبہ حیات کے ہر مسئلہ کی ناول کا موضوع بنایا گیا۔

اس عہد کی ناول نگاری نے نئے شعور کو تیار کیا اور آنے والی تبدیلیوں کے لئے راہ ہموار کی۔ اور اس دور کے ناول نگار کے لب ولہجہ میں پرانی قدروں سے بے اطمینانی اور نئی قدروں کے فقدان کی وجہ سے زندگی سے ایک بیزارگی اور ایک خاص تندی وتیزی ملتی ہے اور ساتھ میں احساس کی تلخی بھی ملتی ہے۔ اور اسی عہد کے تمام ناول نگار بہت سے سماجی، اخلاقی اور مذہبی مسلمان کے خلاف بغاوت کرتے نظر آتے ہیں۔ اور یہی بغاوت کا جذبہ ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے کے بعد شدت اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح کا باغیانہ جذبہ قاضی عبدالغفار کے ناول ''لیلیٰ کے خطوط'' میں نظر آتا ہے۔

اس دور کے تمام ناول اپنے عہد کا آئینہ ہیں۔ یہ آئینہ اس دور کے افراد کی ''اندرونی زندگی'' کو پیش کرتا ہے۔ اس کے ساتھ اس دور کے ناول نگار فرد کے احساس وجذبات اور اس کی ذہنی حالت کو پیش کرنے میں پوری طرح سے کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان سب خصوصیات کے باوجود اس دور کی اہم خصوصیات یہ بھی رہی ہے کہ اس میں ادب لطیف کی چاشنی بھی نظر آتی ہے اور ساتھ ہی میں اس دور کے تمام یا بیشتر ناول نگار

”مارکسٹ اور اشتراکیت کے طرف مسائل نظر آتے ہیں۔ مارکسٹ کا یہ رجحان اس دور کے ناول نگاروں کا خاص وصف ہے۔

اسی دور میں ناول کی ہیئت پر بھی تجربہ کیے گئے ہیں۔ جیسے کہ ”ڈائری“ یا خطوط، کا اسلوب بھی اس دور کے ناول نگاروں نے اپنایا ہے۔ اس سلسلے میں قاضی عبدالغفار نے ”لیلیٰ کے خطوط“ اور مجنوں کی ڈائری مشہور ومقبول ہے۔ ان کے ساتھ مجنوں گورکھپوری نے بھی اس طریقہ کو اختیار کیا تھا۔ اس دور میں ناول کی ہیئت کے ساتھ ساتھ ناول کی قسموں میں بھی تنوع نظر آتا ہے اس سلسلہ میں قاضی عبدالغفار نے عشق پیشہ عاشق کو موضوع بنایا اور عظیم بیگ چغتائی نے مزاحیہ ناول لکھے، ظفر عم نے جاسوسی ناول لکھے۔ اس طرح سے ناول کی مختلف قسموں میں کسی ایک رنگ کو اپنانے کا رواج بھی اس دور میں عام ہونے لگا۔ اسی طرح 36-1900ء کے دور کے ناولیں اور ناول نگاری کی تاریخ میں بہت بڑا حصہ رکھتا ہے۔ اور اسی طرح اردو ناول نگاری 1900ء سے اپنی ارتقاء منزل طے کرتے کرتے 1936ء تک اپنے عروج پر پہنچتی ہے۔

☆☆☆

ترقی پسند تحریک اور اردو ناول نگاری: اہم ناول نگار اور ان کے نمائندہ ناولیں:

ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے آغاز سے قبل ہی لندن میں مقیم چند ہندوستانی طلبہ جن میں سجاد ظہیر ملک راج آنند وغیرہ شامل ہیں ترقی پسندی کی بنیاد ڈال چکے تھے اور 1935 میں ترقی پسند مصنفین کے عنوان سے ترقی پسند ادب لکھ رہے تھے۔ اپریل 1936ء میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس لکھنو میں ہوئی جس کی صدارت پریم چند نے کی تھی اور وہ اپنے صدارتی خطبہ میں ادب برائے ادب، کے بجائے ادب برائے زندگی کا نعرہ بلند کیا۔

فخر الکریم صدیقی اپنی کتاب 'اردو ناول میں خاندانی زندگی' میں ترقی پسند تحریک کے ابتدائی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے اس کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے لکھتے ہیں:

> ''دراصل بیسویں صدی کے ربع اول ہی کے بعض ناول نگاروں میں مذہبی، سماجی اور خاندانی قدروں اور روایتوں سے بے اطمینانی کے آثار ملنے شروع ہوجاتے ہیں جو ربع ثانی میں زیادہ نمایاں شکل اختیار کرلیتے ہیں ان حالات میں 1936ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ اس تحریک کے اغراض و مقاصد تھے جبر و استداد دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، انفرادی اجارہ داریوں کا خاتمہ اور ادبی جمود، اضمحلال اور انفعالیت کا تدارک، طبقہ واریت اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جنگ، ترقی پسند مصنفین کے اعلان نامے میں بھی تحریک کے اسی انقلابی رجحان کو ظاہر کیا گیا ہے(1)''۔

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ترقی پسند مصنفین نے اشتراکیت کو فروغ دیتے

---

(۱) اردو ناول میں خاندانی زندگی۔ص: 181

ہوئے جاگیردارانہ نظام کے خاتمہ پر زور دیا ہے۔

ترقی پسند تحریک کی امتیازی خصوصیت ''حقیقت نگاری'' ہے ان ترقی پسند مصنفین نے ادب کے فرسودہ ڈھانچوں کو توڑ کر یہ باور کرایا گیا کہ ادب کا مقصد تفریح نہیں ادب کو افادی ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقی زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔ ترقی پسند تحریک میں حقیقت نگاری ایک نئے مفہوم کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ حقیقت نگاروں نے خوبصورت، بدصورتی برائی، اچھائی کو جوں کا توں پیش کرنے کی کوشش کی، ادیبوں کو آزادی حاصل تھی اس آزادی نے بعض ایسی باتوں کو بھی عام کردیا جواب تک شجر ممنوعہ سمجھی جاتی تھی۔ عریاں نگاری، اور جنسی خیالات کو پیش کرتے ہوئے ادیبوں نے حقیقت نگاری کے مفہوم کو وسعت دی، تحلیل نفسی کے ذریعہ کرداروں کی زندگی کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا اور فرائڈ کے نظریات کو ادب میں کافی اہمیت دی گئی۔

غرض یہ کہ ترقی پسندی ایک وسیع ہمہ جہت اور تعمیری نقطہ نظر سے عبارت ہے، ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اردو ادب کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیے اور اردو ادب کو اس کے روایتی اور محدود تنگ ناتے سے نکال کر دیگر زبانوں کے ادبی سرمائے سے استفادہ کی طرف مائل کیا۔ قومی مسائل کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی مسائل اور موضوعات کے پیش کش کے رواج کو عام کیا۔ لہٰذا انور پاشا ترقہ پسند تحریک کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بہر حال ترقی پسند تحریک اردو ادب میں ایک تاریخ ساز تحریک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تحریک نے اردو ادب کو اصلاح تنگ ناتے سے نکال کر انقلابی روش پر ڈال دیا اور یہ انقلاب صرف مواد، موضوعات اور فکر کی سطح پر ہی نہیں بلکہ ہیت، تکنیک اور فن گویا ہر سطح پر اثر انداز ہوا۔ جس سے اردو ادب کو ہمہ جہت فروغ حاصل ہوا اور اس کے سرمائے میں بیش بہا اضافے ہوئے'' (1)

ترقی پسند تحریک نے جہاں اردو ادب کے تمام اصناف کو متاثر کیا وہاں ناول کو بھی متاثر کیا۔ یوں تو

(1) ترقی پسند اردو ناول ۔ از: انور پاشا ص، 86

ناول کا فن زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کے لیے سب سے زیادہ مناسب فن ہے۔اور اردو ناول میں ابتدا ہی سے زندگی کی حقیقتوں کو پیش کیا جاتا رہا۔لیکن ترقی ترقی پسند تحریک کے آغاز کے بعد اردو ناول زندگی اور اس کے مسائل کے جن نئے تقاضوں کو پیش کرنے میں نہایت کامیاب ثابت رہا نئے علوم،نظریات و تصورات اور عصری شعور نے ناول نگاروں کے ذہن کو وسعت، بالیدگی اور تنوع عطا کیا۔ترقی پسند ناول نگاروں کی فہرست تو بہت ہے مگر ان میں سب سے زیادہ اور مقبول ترقی پسند ناول نگار سجاد ظہیر، کرشن چندر، عزیز احمد، عصمت چغتائی، صالح عابد حسین، اوپندر ناتھ اشک، وغیرہ ہیں۔

سجاد ظہیر:۔

ترقی پسند ناول نگاروں میں سجاد ظہیر ایک اہم ناول نگار ہیں، ان کا ناول ''لندن کی ایک رات'' ترقی پسند ناول نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے۔یہ ناول 1938ء میں لکھا گیا اور 1938ء میں شائع ہوا۔اس ناول میں سجاد ظہیر نے ہندوستان کے ان طلبہ کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔جو حصول علم کے لیے انگلستان جاتے ہیں۔اور اس بے ساتھ ان طلبا کے ذہنی انتشار اور جذباتی و نظریاتی کشمکش کو بھی موضوع بنایا ہے اور ہندوستان کے خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھنے والے مختلف ذہن کے طالب علموں کی زندگی کے سیاسی اور سماجی شعور کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔انور پاشا اپنی کتاب ''ترقی پسند اردو ناول'' میں اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اگر چہ اس ناول کا کینوس زیادہ وسیع نہیں ہے لیکن اس مختصر سے کینوس پر سجاد ظہیر نے اپنے عہد کے نوجوانوں اور طالب علم طبقے کے ذہنی انتشار اور داخلی کرب و اضطراب کے پردے میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی و اخلاقی تمام حالات و کیفیت کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔جس میں آزادی کے حصول کے لیے جد جہد بھی ہے اور سیاسی و سماجی اور معاشی نظام کی تبدیلی کی خواہش بھی مذہب پرستی، اور مغرب کی رومانی فضاء میں کھو جانے والی تمنا میں بھی

ہیں اور دنیا ومافیہا سے بے نیاز ہو کر بے فکری ے دامن میں پناہ لینے کا رویہ بھی
۔برطانوی نظام کی حمایت اوراس میں عہدے حاصل کرنے کی تگ و دوبھی ہے
اور ہندوستان میں سیاسی رہنماؤں کی پالیسی اور اقدام پر طنز بھی مغربی اقدار و
اخلاق کی اصلاح اور حمایت کا جذبہ بھی غرض کہ اس ناول میں مقصد اور مختلف
کرداروں کی نفسیاتی اور داخلی پیچیدگیوں اور ذہنی انتشار کے پس منظر میں اس
عہد کے مزاج اور سیاسی ،سماجی ،اخلاقی ،تہذیبی مذہبی اور جنسی اقدار اوران کے
تصادم کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔(1)

''لندن کی ایک رات'' کی جو سب سے اہم خصوصیات ہے کہ وہ ناول نگاری میں تکنیک اور موضوع کے اعتبار سے ایک نیا تجربہ ہے۔اس ناول میں سجاد ظہیر نے مروجہ روایتی تکنیک سے ہٹ کر شعور کی رو کی تکنیک کو برتا اس سبب یہ ناول ناول نگاری کی تاریخ میں ایک اپنی الگ انفرادیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست ناول کی اس خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اردو میں نہ صرف جدید ناول نگاری کی ابتداء اس سے ہوتی ہے بلکہ اس
ناول سے اردو ناول نگاری ،شعور کی رو' کی تکنیک سے سب سے پہلے متعارف
ہوتی ہے(2)

اور اسی طرح انور پاشا نے بھی اس ناول میں استعمال کی گئی مخصوص تکنیک پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لندن کی ایک رات'' میں سجاد ظہیر نے اگر چہ مکمل طور پر نہیں لیکن جزوی
طور پر ہی شعور کی رو کی تکنیک کو جس مہارت اور حسن و خوبی کے ساتھ برتا ہے۔
وہ ان کے اخلاقانہ ذہنیت اور نفسیاتی و داخلی بصیرت کا ثبوت ہے۔انہوں نے

---

(1)ترقی پسند اردو ناول ۔از:انور پاشا ص، 77-67
(2)یوسف سرمست ۔بیسویں صدی میں اردو ناول ۔ص، 423

اس تکنیک کے ذریعہ اپنے کرداروں کی داخلی اور ذہنی کوائف کو اس انداز میں
پیش کیا ہے کہ ان کا ماضی اور حال اور ان کی نفسیاتی گتھیاں رفتہ رفتہ کھل کر سامنے
آجاتی ہیں''۔(1)

مختصر یہ کہ ناول ''لندن کی ایک رات'' میں نوجوانوں کے دلوں میں پرورش پا رہی نا آسودگی کا احساس بھی ملتا ہے اور مختلف رجحانات رکھنے والے نوجوانوں کی نفسیاتی زندگی پر روشنی پڑتی ہے جو اشتراکی خیالات کی طرف مائل ہے مگر اس کے خیالات میں پختگی نہیں اور وہ موجودہ نظام سے مطمئن نہیں ہے۔ اور ساتھ میں یہ ناول اپنے دور کے سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی بھی ہے لہٰذا ڈاکٹر یوسف سرمست اس ناول کو اردو ناول میں سنگ میل کی حیثیت قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''لندن کی ایک رات'' اردو ناول نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے
کیونکہ مواد اور ہیئت دونوں اعتباروں سے یہ اس دور کی ناول نگاری کے سارے
اہم رجحانات کو پیش کرتا ہے(2)

کرشن چندر:۔

کرشن چندر کا شمار ترقی پسند ادیبوں کی فہرست میں سرفہرست ہے۔ انہوں نے اپنا پہلا ناول ''شکست 44-1943'' ء میں لکھا۔ جو ایک مکمل ترقی پسند ناول ہے۔ اس ناول میں سماج کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے اور سماجی رسم و رواج کی کشمکش اور مذہبی قید و بند اور طبقاتی کشمکش پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔

نگینہ جبیں اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے مفصیل اندار میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''44-1943ء میں کرشن چندر نے اپنا پہلا ناول ''شکست'' کے نام سے
پیش کیا، شکست رومان اور سماجی حقیقت نگاری کے خوبصورت، امتزاج کا مرقع
ہے جس میں عشق و محبت کی گھٹن، سماجی رسم و رواج کی مذموم پابندیاں، مذہبی

---

(1) ترقی پسند اردو ناول ۔ از: انور پاشا ص، 58

(2) بیسویں صدی میں اردو ناول ۔ از: ڈاکٹر یوسف سرمست ۔ ص، 323

قدروبند اور طبقاتی سماج کی کشمکش کی تصویر حرکت کرتی نظر آتی ہے۔اس ناول میں کرشن چندر کی رومان نگاری، نیاز، مجنون اور عزیز احمد سے مختلف ہے۔لیکن حقیقت نگاری پریم چند کے ناولوں کی حقیقت نگاریوں پر کہیں کہیں پہلو مارتی ہے۔اگر چہ ناول کی کہانی کوئی نئی نہیں ہے۔لیکن فنی اعتبار سے 'شکست' بھی گئو دان، اور لندن کی ایک رات، کی طرح اہمیت کا حامل ہے"(1)

ناول شکست میں بنیادی طور پر کشمیر کی دیہاتی زندگی کے پس منظر میں معشوق، کی فطری خواہشات اور سماجی رکاوٹوں کی کشمکش اور ٹکراؤ کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس ناول میں دو کہانیاں ہیں۔یہ دونوں کہانیاں ایک ساتھ چلتی ہیں ایک کہانی ایک اچھوت لڑکی چندرا اور دوسری کہانی راجپوت نوجوان موہن سنگھ کی ہے۔یہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔لیکن سماج کی رجعت پرست طاقتیں مذہب دھرم، جات پات اور امیر غریب کی دیواریں کھڑی کر کے اس میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں۔اور ان دونوں میں کشمکش اور ٹکراو پیدا ہوتا ہے بالآخر سماج کی رجعت پرست قوتوں کا پلہ بھاری پڑتا ہے اور دونوں کی محبت سماجی جبر و استبداد کی قربان گاہ قربان ہو جاتی ہے۔انور پاشا "ناول" شکست، پر تبصرہ کرتے ہوئے اس ناول کے موضوع اور پس منظر پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

"اس ناول کا موضوع محبت اور رومان کے پس منظر میں دو قدروں اور دو قوتوں کا تصادم اور ٹکراو ہے۔ایک طرف وہ قوتیں ہیں جو سماج کے فرسودہ نظام کا بنائے رکھنا چاہتی ہیں اور جو مذہب دھرم، جات پات، چھوا چھوت، اونچ نیچ، اور معاشی و اقتصادی تفریق پر منحصر رجعت پسند قدروں کی آڑ میں معاشی اور طبقاتی استحصال، مہاجنی نظام اور اس کے ظلم و استبداد کو روا رکھنا چاہتی ہیں۔ دوسری طرف وہ قوتیں ہیں جو اس فرسودہ سماجی نظام سے بغاوت کرنا چاہتی ہیں اور مذہب، جات پات چھوت چھات، اونچ نیچ اور امیر غریب کی تفریق سے

(1) اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، 1947ء اور اس کے بعد۔از: نگینہ جبیں۔ص،28

بالاتر ہوکر محبت اور انسان دوستی کی حمایت کرنا چاہتی ہیں سماج کو ظلم و استبداد اور
استحصال شکنجوں سے آزاد کرانا چاہتی ہیں دونوں میں ''رن پڑتا ہے''۔(1)

ڈاکٹر یوسف سرمست ناول 'شکست' کو صحت مند محبت کی شکست کہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شکست'' میں فرسودہ نظام کے مقابلے میں صحت منداور تازہ و توانا
نوجوانوں کی فطری اور صحت مند محبت کی 'شکست' پیش کی گئی ہے ان دونوں کی
کشمکش کو پیش کرتے ہوئے کرشن چندر نے فرسودہ نظام کی فولادی اور مضبوط
گرفت کو ظاہر کیا ہے''۔(2)

کرشن چندر نے ہندوستانی زندگی کے تلخ سماجی حقائق کو بھرپور طریقہ سے پیش کیا ہے اور ساتھ میں
کرشن چندر اپنی رومانیت بھی ظاہر کی ہے جو اس ناول کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے۔

ڈاکٹر یوسف سرمست 'شکست' کی رومانیت پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

''شکست'' کی یہ رومانیت صرف رومانیت ہی نہیں ہے بلکہ اس دور کی
حقیقت نگاری بھی ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں پورے قدیم عقائد ٹوٹ چکے
ہیں۔ اور نئے حالت میں نئی قدروں کی تلاش ہو رہی ہے پرانی بندشوں سے یہ
بیزارگی نئے حالات اور وقت کا مطالبہ تھی''۔(3)

اور اسی طرح ڈاکٹر یوسف سرمست اس ناول کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے اس کی منظر کشی اور دوسری اہم
خصوصیات کی طرف متوجہ کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شکست'' کی اہمیت اس کی نئی اور پرانی قدروں کی کشمکش کو پیش کرنے کے
ساتھ اس کی منظر کشی میں بھی مضمر ہے اس ناول کا سارا حسن اس کے پس منظر کی
فن کارانہ پیش کشی میں نمایاں ہوتا ہے فطری کا حسن اور سماج کی بدصورتی اس

---

(1) اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، 1947ء اور اس کے بعد۔ از: نگینہ جبیں۔ ص، 28

(2) بیسویں صدی میں اردو ناول۔ از: ڈاکٹر یوسف سرمست۔ ص، 378

(3) بیسویں صدی میں اردو ناول۔ از: ڈاکٹر یوسف سرمست۔ ص، 379

ناول میں طرح طرح سے نمایاں کیے گئے ہیں۔ان دونوں چیزوں سے کرشن چندر شدید طور پر متاثر ہوئے تھے اور یہی تاثر ان کے اس ناول میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔وہ جس طرح سے ان دونوں چیزوں سے متاثر ہوئے تھے اور جس شدت سے متاثر ہوئے تھے۔‘‘(1)

جس طرح مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ناول کی اہم خوبی میں ایک خوبی دلکش فطری منظر کشی ہے اس طرح کرشن چندر کا دلکش اسلوب بھی ہے اس ناول میں کرشن چندر نے جچی ہوئی زبان تراشے اور ڈھلے ہوئے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔

مختصر یہ کہ سماجی لعنتوں کے خلاف آواز اٹھانا اس کی نشاندہی کرنا اور نئی صحت مند قدروں انسان دوستی، ہمدردی، بے تعصبی سیکولرزم مساوات انصاف، محبت اور امن و آصتی وغیرہ کی حمایت کرنا ترقی پسندی کا اہم اور لازمی تقاضا ہے جسے کرشن چندر نے اس ناول میں بخوبی نبھایا ہے۔لہذا ڈاکٹر یوسف سرمست اس ناول کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے اس کو امتیازی مقام دیتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

’’کرشن چندر نے اپنا ناول ’’شکست‘‘ 1943 میں لکھا۔جو جدید دور کی ناول نگاری میں شکست، اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے امتیازی مقام رکھتا ہے۔لیکن ’’شکست‘‘ کے بارے میں بعض وقت بڑی متضاد رائیں بھی ملتی ہیں۔عزیز احمد نے اس بارے میں لکھا ہے:

’’غالباً وہ اردو کا بہترین ناول ہے‘‘۔(2)

عزیز احمد:

ترقی پسند نمائندہ ناول نگاروں میں ایک اہم نام عزیز احمد کا بھی ہے۔ان کے ابتدائی دور کے ناول میں

---

(1) بیسویں صدی میں اردو ناول۔از:ڈاکٹر یوسف سرمست۔ص،383

(2) بیسویں صدی میں اردو ناول۔از:ڈاکٹر یوسف سرمست۔ص،377

ہوس (1932) اور مرمر اور خون 1932 ہیں۔ ان دونوں ناولوں میں انھوں نے جنسیات اور انسانی جذبات کوموضوع بنایا ہےاور جنسیات کے ذریعہ انہوں نے انسانی نفسیات اور داخلی احساسات اور جذبات کو بڑے ہی فن کارانہ سلیقے سے پیش کیا ہے۔ جس میں فرسودہ رسوم واقدار کی اصلاح کا جذبہ کارفرما ہے۔

اس ابتدائی دور کے دور ناولوں کے علاوہ عزیز احمد نے اور چار ناول لکھے ہیں ''گریز'' 1943، ''آگ'' 1943ء، ''ایسی بلندی ایسی پستی'' 1948ء، اور ''شبنم'' 1950ء یہ تمام بہت کامیاب ناول ہیں لیکن ناول ''گریز'' کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔

''گریز'':

اس ناول کی کہانی ایک متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ نوجوان نعیم کی ہے جو یہ رئیس گھرانے کی خوبصورت لڑکی بلقیس سے محبت کرتا ہے لیکن اپنی معاشی کمزوری کی وجہ سے بلقیس کی شان نارسائی کا شکار بھی ہوتا ہے۔ پھر وہ آئی۔سی ایس کے لئے منتخب ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لندن چلا جاتا ہےاور وہاں کے ماحول سے متاثر ہوتا ہےاور وہاں کے مختلف لڑکیوں سے ملتا ہے۔ ان سے جنسی تعلقات قائم کرتا ہے پھر وہ کچھ لڑکیوں سے والہانہ محبت بھی کرتا ہے لیکن رنگ ونسل کی دیواریں حائل ہوجاتی ہیں اور پھر وہ شراب نوشی اور جنسی ہوسنا کی کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس پس منظر میں عزیز احمد نے مختلف کرداروں کے ذریعہ اس عہد کے متوسط طبقے کے طالب علموں اور نوجوانوں کی ذہنی نفسیاتی اور داخلی حالات کی عکاسی کی ہے اور متوسط طبقے کے ہندوستانی نوجوانوں طلباء کی مخصوص معاشرت کی پروردہ ذہنیت جو یہاں ناآسودگی کا شکار کسی طرح ہوتی ہے اور وہ اپنی آرزوؤں اور امنگوں کو یہاں کی سماجی واخلاقی جبر سے دبانے پر کس طرح مجبور ہوتی ہے۔ انور پاشا اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس ناول میں مصنف نے اس عہد میں عالمگیر سطح پر رونما ہورہے حادثات
> واقعات اور سیاسی، سماجی اور معاشی بحران سے پیدا شدہ صورت حال میں نئی نسل

کے ذہنی کرب، انتشار، بے اطمینانی اور بیزاری کی حالت کو بھی پوری شدت کے
ساتھ پیش کیا ہے''۔(1)

اس ناول میں جس انداز سے سماجی زندگی کے مسائل اور سیاسی زندگی کے اثرات کا ذکر ہے اس سے ناول نگار کے متنوع اور سیاسی تجربات پر روشنی پڑتی ہے جو عزیز احمد سے قبل اردو ناول میں کم نظر آتی ہے۔ دراصل عزیز احمد لندن کی زندگی کے بدلے ہوئے حالات کو پیش کر کے ملکی زندگی کے بعض پیچیدہ مسائل کا تجزیہ کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔

مختصر یہ کہ عزیز احمد کا یہ ناول تکنیک اور فن کے لحاظ سے اپنے دور میں ایک بہترین ناول کا درجہ رکھتا ہے اور عزیز احمد نے نفسیاتی تحلیل کی تکنیک کے ذریعہ نفسیاتی اور داخلی حالت کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے لہذا انور پاشا ناول ''گریز'' کو اردو ناول نگاری میں قابل قدر اضافہ قرار دیتے ہوئے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں:

''غرض یہ ناول اپنے عہد کے عالمگیر مسائل کو پیش کرتا ہے جس سے ناول نگار کے متنوع تجربات کا اندازہ ہوتا ہے تکنیک اور فن کے معاملے میں ''گریز'' اپنے عہد کے بہترین ناول کا درجہ رکھتا ہے۔مختلف زبانوں سے واقفیت ہونے اور مغربی ناول نگاری کے فن سے واقفیت کے سبب انھوں نے اردو ناول کو نئی تکنیکی معیار عطا کئے ہیں۔انھوں نے جس سلیقے کے ساتھ تحت الشعور، داخلی خود کلامی اور فرائڈ کی نفسیاتی تحلیل کی تکنیک کو برتا ہے وہ ان کی نفسیاتی زوف بینی پر دال ہے۔ناول کی ابتداء سے آخیر تک نعیم کے کردار کی تشکیل اور اس کے ارتقاء میں انہوں نے نفیساتی اور داخلی گھتیوں کو بڑی فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے جو اردو ناول نگاری میں یقیناً ایک قابل قدر اضافہ ہے۔''(2)

---

(1) ترقی پسند اردو ناول، از انور پاشا۔ص 104

(2) ترقی پسند اردو ناول، از انور پشا۔ص 113۔

گریز کے بعد عزیز احمد کا دوسرا اہم ناول ''آگ'' ہے جس کی اشاعت 1943ء میں ہوئی۔ اس ناول میں 1908 سے لے کر 1942ء تک کی کشمیر کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ دراصل عزیز احمد کشمیری زندگی کے ذریعہ ہندوستانی حالات کی تصویر کشی کی ہے کیونکہ 1908ء سے 1945ء تک ہندوستانی زندگی میں سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی میں جو تبدیلی آئی تھی اس کے جھلکیاں کشمیری زندگی میں صاف نظر آ رہی تھی۔

ڈاکٹر یوسف سرمست ناول ''آگ کے موضوع پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''آگ'' میں انھوں نے کشمیر زندگی کو پیش کرتے ہوئے بے شمار سماجی اور معاشی حقائق کو پیش کیا ہے ان حقائق کو پیش کرنے کے لئے عزیز احمد نے ناول کی کسی بندھی ٹکی تکنک کی پیروی نہیں کی اس لئے اس ناول سرمایہ دار طبقے کی تین نسلوں کی زندگی کی اضافت سے کشمیری زندگی کے ہر رخ کو اور اس کی ساری تبدیلیوں کو پیش کیا گیا ہے''(1)

مختصر یہ کہ ''آگ'' کا کینوس زیادہ وسیع ہے اس اس عہد کی سماجی اور سیاسی، طبقاتی کش مکش اور تہذیب و معاشرت، اخلاقی اقدار کے تصادم کو نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انور پاشا اس ناول کو صرف کشمیری زندگی کی عکاسی ہی نہیں بلکہ پورے ملک کی عکاسی کہتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''غرض کہ عزیز احمد کا یہ ناول ان کی پختہ سیاسی، سماجی، معاشی اور طبقاتی شعور کی عکاسی ہے۔ انھوں نے اس ناول کی پیش کشی میں کسی بندھی ٹکی تکنیک کی پیروی نہیں کی ہے۔ بلکہ ایک نیا انداز اختیار کیا ہے۔ جس میں روایتی انداز کا کوئی ہیرو یا ہیروئن نہیں بلکہ مختلف اور متنوع کرداروں اور واقعات اور حادثات کے ذریعہ کشمیری زندگی کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ لیکن یہ مسائل صرف کشمیر کے ہی نہیں بلکہ پورے ملک کے عوام کی زندگی کے مسائل کی حیثیت ہیں۔''(2)

---

(1) بیسویں صدی میں اردو ناول۔ از: ڈاکٹر یوسف سرمست۔ ص، 368

(2) ترقی پسند اردو ناول۔ از انور پاشا، ص 115

ایسی بلندی ایسی پستی:

''گریز'' اور'' آگ'' کے بعد عزیز احمد کا تیسرا بے حد مقبول اور اہم ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' ہے یہ ناول 1948ء میں منظر عام آیا۔ یہ ناول عزیز احمد کی فکر وفن کی پختگی کا ثبوت ہے۔ یہ ناول عزیز احمد کی ایک طویل زندگی کا مشاہدہ ہے کیونکہ یہ ناول کا موضوع ان کے اپنے وطن حیدر آباد کی زندگی سے متعلق ہے۔ عزیز احمد نے اس ناول میں حیدر آباد کی تہذیبی اور معاشرتی، تمدنی وسماجی زندگی کو فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

عزیز احمد کے فن بے شمار خصوصیات میں سے ایک خصوصیات کردار نگاری ہے عزیز احمد اپنے کرداروں کو زندہ اور متحرک پیش کرنے کی بے پناہ قدرت رکھتے ہیں اور اس ناول میں بھی عزیز احمد نے اپنے کردار نگاری کے فن کو بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ ڈاکٹر سید علی حیدر اپنی کتاب ''اردو ناول سمت و رفتار میں ناول 'ایسی بلندی ایسی پستی'' کی کردار نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عزیز احمد کا یہ ناول کردار نگاری کے لحاظ سے اہم ہے۔ ناول کے تمام کردار پوری طرح سے جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اور وہ تمام کردار اس دنیا کے عام انسان کی طرف ہیں۔ کرداروں کے حرکات وسکنات میں انسانی زندگی کی عکاسی کے فطری نمونے موجود ہیں''۔(1)

عزیز احمد کے اس ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کا موضوع دراصل میں بلندیوں کی پستیاں دکھاتا ہے اور اس ناول میں اونچا طبقہ یعنی امیر طبقہ ہی اس ناول کا مرکزی موضوع ہرا ہے جس طرح حقیقی زندگی میں ہر طبقہ دوسرے طبقہ سے وابستہ رہتا ہے اسی طرح اس ناول میں بھی ہر طبقہ کی زندگی سامنے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کے حوالے سے عزیز احمد کی ناول کی خصوصیات پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں:

---

(1) اردو ناول سمت ورفتار، ڈاکٹر سید علی حیدر۔ ص 167۔

''عزیز احمد اپنے ناولوں میں کسی مخصوص ہیئت یا فارم کی پیروی نہیں کرتے بلکہ اپنے مواد کے لئے خود اپنی انفرادی تکنیک استعمال کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں شعور کی رو کی تکنیک لے کر ہمہ وان مصنف تک یا پرسی لبک نے کہانی بیان کرنے کے جتنے طریقے بیان کئے ہیں وہ سب کے سب یہاں ملتے ہیں۔وہ زندگی کا ہر ممکن طریقے سے بھر پور اظہار کرتے ہیں ان کی یہی خصوصیت ان کے ناولوں کو بے حد تنوع اور اہمیت بخشی ہے۔ان کا مطمع نظر صرف زندگی کا بھر پور اظہار ہوتا ہے۔اس لئے وہ مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں اور زندگی کو مکمل انداز میں پیش کر دیتے ہیں''۔(1)

عزیز احمد کے مقبول ناول میں ''شبنم'' بھی ایک مقبول ناول ہے۔ناول ''شبنم'' 1952 میں شائع ہوا اور اس ناول کا موضوع حیدر آباد کے مسلم سماج سے تعلق رکھتا ہے اس کے اہم کردار، شبنم، ارشد، رشیدی صلب نیلم، امیر، ہزیا وغیرہ ہیں۔ناول کا مرکزی محور ''ٹائم ہوٹل'' اور راکسی سینما ہیں۔

عزیز احمد کی ناول نگاری ہر اعتبار سے اردو ناول نگاری کے ایک اہم موڑ کی نشاندہی کرتی ہے۔وہ زندگی کو بھر پور طریقے سے پیش کرنے والے ایک کامیاب ناول نگار ہیں۔عزیز احمد ہر لحاظ سے اس دور کے اہم ترین ناول نگاروں میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔فخر الکریم صدیقی ترقی پسند ادبی تحریک کی حقیقت نگاری کے حوالے سے عزیز احمد کی حقیقت نگاری پر اس طرح رقم طراز ہیں:

''ترقی پسند ادبی تحریک کے ساتھ حقیقت نگاری کا دور آیا۔ادب برائے زندگی کی آواز بلند ہوئی۔زندگی کی نئی اور پرانی قدروں کا جائزہ لیا گیا۔تاکہ ادب علوم کے جذبات اور احساسات کا آئینہ بن سکے۔عزیز احمد اس تحریک میں کافی آگے نظر آتے ہیں''۔(2)

---

(1) بیسویں صدی میں اردو ناول۔از: ڈاکٹر یوسف سرمست۔ص، 502

(2) اردو ناول میں خاندانی زندگی، فخر الکریم صدیقی، ص 195-194۔

عصمت چغتائی:

عصمت چغتائی ترقی پسند مصنفوں کی صف میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔متوسط مسلم گھرانوں کی معاشی وجنسی وسماجی گھٹن ان کی ناولوں کے موضوعات ہیں۔ان کی روش سعادت حسن منٹو سے جاملتی ہے کیونکہ حقیقت کے برملا اظہار میں ان کا عقیدہ ہے۔ان کا کہنا ہے کہ سڑے ہوئے ناسور پر پٹی باندھنے سے وہ ختم نہیں ہوگا۔ہم بظاہر اسے تو ڈھک سکتے ہیں مگر اسے جڑ سے ختم کرنے کے لئے نشتر لگانا ضروری ہے۔ مطلب سماج کے مختلف سڑے گلے عقائد ورسم ورواج سے نجات پانے اوران کے غلط ومضر اثرات کو سماج و انسانیت سے ہمیشہ کے لئے دور کرنے کی خاطر مختلف ذہنی جسمانی اور جنسی وغیرہ کے غیر معمولی رشتوں، نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی کج رویوں کو انھوں نے اپنے منفرد اور برملا انداز میں ہمارے سامنے پیش کر کے انھیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی تحریک پیدا کی۔ عصمت چغتائی کی اہم ناولوں میں ''ضدی'' ''ٹیڑھی لکیر'' ''معصومہ''''سودائی''ایک ''قطرہ خون'' وغیرہ ہیں لیکن 1947ء تک شائع ہونے والے یعنی ترقی پسند تحریک سے۔جو ناول متاثر رہے وہ صرف دو ہی ہیں ایک ''ضدی'' اور دوسرا ''ٹیڑھی لکیر''۔

ضدی:

ناول ضدی 1940ء میں منظر عام پر آیا یہ ایک رومانی ٹریجڈی ہے حالاں کہ ناول عصمت چغتائی کی ابتدائی کوشش ہے اوراس ناول کے ذریعہ زندگی کا کوئی خاص پہلو اجاگر ہو کر سامنے نہیں آتا مگر اس میں ایک متوسط طبقے کے زمیندار کا بیٹا پورن کی محبت ایک پسماندہ غریب طبقہ کی لڑکی آشا سے دکھا کر عصمت نے اس وقت کے بدلتے ہوئے سماجی رجحان اور قدروں کی تبدیلی کی طرف وضاحت سے اشارہ کیا ہے۔

اسی ناول میں رومانیت اور جذباتی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ اس عہد کے چند اہم مسائل کو موضوع بتایا ہے جیسے سماج میں،اونچ نیچ، جاگیردار اور سرمایہ دار طبقے کی روایت پرستی اور جھوٹے وقار کے یہ چہرے سے نقاب بھی اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔مجموعی اعتبار سے عصمت کا یہ ناول ایک کامیاب ناول ہے

اور یہ ناول زبان وبیان کے اعتبار سے بھی عصمت کے مخصوص رویے کی نشاندہی کرتا ہے۔عصمت متوسط طبقے کی عورتوں کی زبان کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔

''ٹیڑھی لکیر'':

ضدی کے بعد عصمت نے اپنا شاہکار ناول ''ٹیڑھی لکیر'' 1947ء میں لکھا۔ یہ ناول سوانحی کے انداز میں ہے۔اس میں ایک کردار ''شمن'' ہے اس ناول میں اس کردار کی زندگی کا مطالعہ بچپن سے جوانی تک کی تفصیل اور بہت گہرائی سے کیا گیا ہے۔ دراصل ''ٹیڑھی لکیر'' ایک نفسیاتی ناول ہے اور کردار 'شمن' کے ذریعہ مسلم متوسط طبقے کی نوجوان لڑکیوں کی نفسیات ان کی جنسی الجھنیں اور مخصوص قسم کی معاشرے میں ان کی نفسیات پر اثر انداز ہونے والے مختلف عوام وعناصر کو نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے 'شمن' کے علاوہ اس طبقے کی دوسری عورتوں اور لڑکیوں کے کرداروں کے ذریعہ متوسط طبقے کی گھریلو اور معاشرتی زندگی اور ماحول کے تمام کچے چھٹے کو بے نقاب کر دیا ہے جن سے وہ بحیثیت عورت بخوبی واقف ہیں۔

ڈاکٹر یوسف سرمست اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ٹیڑھی لکیر'' میں شمن کے کردار کے ارتقاء کو پیش کرتے ہوئے عصمت نے جس طرح معاشی اور نفسیاتی عوامل کا تجزیہ لیا ہے وہ اپنا جواب نہیں رکھتے ہو شمین نے کہا ہے کہ بظاہر فرائڈ اور مارکس کے نظریات میں مطابقت پیدا کرنا ناممکن ہے، لیکن عصمت نے ان دونوں نظریات کے سہارے اپنے کردار کے ارتقاء کو بہترین طریقے سے پیش کیا ہے، انہوں نے معاشی حالت جس طرح کردار کی ساخت پرداخت میں حصہ لیتے ہیں اس کا بھی ذکر کیا ہے، اوران حالات سے جو نفسیاتی گتھیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا بھی تجزیہ کیا ہے''۔(1)

---

(1) بیسویں صدی میں اردو ناول۔از: ڈاکٹر یوسف سرمست۔ص،409

''ٹیڑھی لکیر''میں عصمت چغتائی نے اس حقیقت کوپیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح انسان اپنے ماحول گردوپیش اور سماجی و معاشرتی اقدار و حالات سے متاثر ہوتا ہے۔اور یہ ساری چیزیں اس کی نفسیات، ذہنیت اور شخصیت کی تعمیر میں کتنا اہم رول ادا کرتی ہیں۔انور پاشا اس ناول کی جملہ خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''گرچہ یہ پورا ناول متوسط طبقے کی گھریلو اور معاشرت زندگی کے متعدد چھوٹے چھوٹے مسائل اور جزیات کی پیش کش پر مشتمل ہے جن سے شمن اور دیگر کردار نفسیاتی اور جنسی الجھنوں اور انتشار کا شکار ہوتے ہیں۔لیکن اس میں عصمت کا مخصوص نقطہ نظر بھی بالکل واضح ہو کر سامنے آ گیا ہے۔جہاں ایک طرف وہ اپنے سماج اور معاشرے کی رجعت پسندی روایت پرستی،فرسودہ رسم و رواج تعصب و تنگ نظری اوران سے پیدا شدہ درپردہ جنسی غلاظت، بداخلاقی بے راہ روی اور گھٹن وغیرہ کو منظر عام پر لا کر اس کی اصلاح کے لیے اکساتی ہیں وہیں دوسری طرف اس ناول میں انہوں نے جا بجا اس عہد کی سیاسی، سماجی اور معاشی بدحالی اور انتشار کی جانب بھی واضح اشارے کیے ہیں''۔(1)

مختصر یہ کہ ناول 'ٹیڑھی لکیر''میں عصمت نے فرد کو اس کی سماجی نفسیات کے ساتھ پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح فرد کے ذہن اور شخصیت پر س کی جماعت کی نفسیات اور کارکردگیوں کا اثر پڑتا ہے۔اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فد کے عمل ردِّعمل حرکات وسکنات، عادات واطوار اور خیالات اس کے گھریلو ماحول اور سماجی رسمورواج سے بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔لہٰذا ڈاکٹر یوسف سرمست عصمت چغتائی کو ترقی پسند مصنفین میں ان کو انفرادیت کی حیثیت کی حامل قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عصمت چغتائی ترقی پسند مصنفین میں اس حیثیت سے انفرادیت کی حامل

---

(1)ترقی پسند اردو ناول۔از:انور پاشا۔ص،124

ہیں کہ انھوں نے متوسط مسلم گھرانوں کی پردہ نشین لڑکیوں کی نفسیاتی الجھنوں اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ان کا مقصد مسلم معاشرہ میں پھیلی ہوئی خامیوں کو بے نقاب کرنا ہے۔ عصمت نے خاص طور پر خاندانی زندگی کے جس پہلو پر زور دیا ہے وہ جنس ہے جس کو انھوں نے بڑی بے با کی اور بے تکلفی سے اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے''۔(1)

صالحہ عابد حسین:

دیگر ترقی پسند ناول نگاروں میں صالحہ عابد حسین بھی ہیں۔ ان کا پہلا ناول ''عذرا'' 1942ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول کافی مقبول ہوا۔ اس ناول میں دہلی کے مسلم متوسط طبقے کی خانگی زندگی پیش کی گئی ہے اس ناول میں اس دور کے حالات کا بیان ملتا ہے۔ جس میں جدید مغربی تعلیم کے اثرات قدیم مشرقی تربیت سے دست و گریباں ہیں۔ صالحہ عابد حسین عام گھریلو زندگی کی مصوری کرنے میں ثانی نہیں رکھتی گھریلو فضا کے ساتھ معاشرے اور زندگی کے پیچیدہ مسائل اور سیاسی اثرات وغیرہ کو بھی نہایت دلفریب انداز میں پیش کرتی ہیں۔ فخر الکریم صدیقی ان کی ناول نگاری کی خصوصیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کی ازدواجی زندگی قابل رشک حد تک کامیاب تھی ان کی ذاتی زندگی کی یہی خوبیاں ان کے ناول میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام گھریلو زندگی کی مصوری کرنے میں جو کامیابی صالحہ عابد حسین کو حاصل ہوئی ہے۔ اس کی مثال مشکل ہی سے دوسری خاتون ناول نگاروں کے یہاں مل سکتی ہے۔ وہ صرف گھریلو فضا ہی کو پیش نہیں کرتیں بلکہ معاشرے اور زندگی کے پیچیدہ مسائل اور سیاسی اثرات جماعت اور افراد کے تعلقات کو گھریلو سیاق و سباق میں دیکھتی ہیں''۔(2)

---

(1) بیسویں صدی میں اردو ناول۔ ص:409

(2) اردو ناول میں خاندانی زندگی۔ از فخر الکریم صدیقی، ص192

اوپندر ناتھ اشک:

اسی دور کے ایک اہم ناول نگار ''اوپندر ناتھ اشک'' بھی ہیں۔ اشک کا ناول ''ستاروں کے کھیل'' 1942ء میں شائع ہوا اس سے پہلے یہ ناول ہندی میں 1934ء میں شائع ہوا تھا۔ اس لئے اس ناول میں ترقی پسند کم اور رومانیت زیادہ ہے۔ اس اس ناول میں پرانی رسموں کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کر کے دونوں میں توازن کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ پریم چند نے اردو ناول کو جس مقام تک پہنچا دیا تھا۔ ترقی پسند ناول نگاروں نے وہاں اپنا سفر شروع کیا اور اسے سماجی سیاسی معاشی جنسی اور نفسیاتی حقائق اور حالات واقدار کی پیش کش اور ان اقدار میں وقوع ہورہے تفسیر اور تصادم کی عکاسی کا متحمل بتاتے ہوئے موضوعات، مواد اور تکنیک ہر سطح پر نت نئے امکانات سے ہمکنار کیا۔

ترقی پسند ناول نگاروں نے زندگی کے جن مسائل کو موضوع بنایا ہے وہ، غلامی کا کرب، آزادی خواہی اور اس کے لئے جدوجہد کی آرزو، طبقاتی کشمکش، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ انتظام کی زندگی اور غریبوں مزدوروں اور کسانوں کا استعمال عزت، افلاس، بیکاری، سماجی و معاشی انتشار اور اس سے پیدا شدہ بے چینی بے اطمینانی اور محرومی، جنسی گھٹن، محبت پر پابندی، متوسط اور اعلیٰ طبقے کی اخلاقی اقدار اور معاشرتی زندگی کا مذہبی جبر واستحصال اور نفسیاتی اور داخلی کشمکش بدعنوانیاں، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، انسان دوستی دردمندی وغیرہ بے شمار متنوع موضوعات سے اردو ناول کے دامن کو بھر دیا۔ اور اس کے دامن کو وسعت عطا کرنے کی کوشش کی۔ انور پاشا ترقی پسند ناولوں کے موضوع پر اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس عہد کے ناول نگاروں نے اپنے علمی وسماجی وعیاشی اور فنی شعور سے کام لیتے ہوئے بے شمار ایسے موضوعات کو ناول میں داخل کئے جو ان سے قبل یا تو عنقا تھے۔ یا جن کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی تھی چونکہ ترقی پسند تحریک نے ادب اور ادیبوں کو انفرادی، علاقائی اور علاقائی قومی مسائل اور موضوعات کے تنگ نالے سے نکال کر بین الاقوامی موضوعات و مسائل سے بھی جوڑ دیا تھا۔

لہذا اس عہد کے ناولوں میں قومی اور ملکی موضوعات اور مسائل کے ساتھ ساتھ
بین الاقوامی موضوعات و مسائل اور عام انسانی زندگی میں موجود انتشار اور
کشاکش کی بھرپور عکاسی ملتی ہے''۔(1)

اس عہد کے ناول نگاروں کے یہاں جو سب سے پہلا اہم رجحان کم و بیش سب کے یہاں مشترک ہے وہ فرسودہ اور رجعت پسندی، سماجی، تہذیبی، مذہبی اور اخلاقی اقدار نظام سے بغاوت سماج اور تہذیب و تمدن سے متعلق تمام مسائل و اقدار کو سائنس کی روشنی میں دیکھنا۔ اس دور کے ناول نگاروں کا دوسرا اہم رجحان نفسیاتی اور جنسی حقائق کی عکاسی کا ہے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست اس رجحان پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس دور کے ناول نگاروں کا اہم کام یہی رہا ہے کہ انھوں نے عریاں نگاری
سے کام لے کر جنس کے تعلق سے جو غیر ضروری خوف و خجالت کا احساس تھا اس کو
کم کیا اور اس پر وسیع النظری کے ساتھ غور کرنے کا رجحان پیدا کیا۔ فحش اور
عریاں نگاری کے فرق کو ظاہر کرنے کی اس دور کے ادیبوں نے کوشش کی
ہے''۔(2)

اسی دور کا تیسرا رجحان ''اشتراکیت ہے ڈاکٹر یوسف سرمست اس دور کے رجحانات پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''1934ء سے 1947 تک اردو ناول نگاری کے جو رجحانات رہے ہیں
ان ہی میں ان واقعات کے بعد شدت پیدا ہوگئی۔ زندگی کے تعلق سے بے
اطمینانی اور بڑھ گئی۔ تشکیک میں اور اضافہ ہوگیا۔ اخلاقی اور مذہبی قدروں پر
سے اعتقاد اور بھی زیادہ ختم ہوگیا۔ مایوسی اور حرماں نصیبی کی کیفیت اور بڑھ گئی۔
اپنی تنہائی، بے بسی اور بے چارگی کے احساس میں اور اضافہ ہوگیا۔ ذہنی انتشار
اور جذباتی خلفشار میں شدت پیدا ہوگئی بلکہ ان سب چیزوں کے ساتھ ایک اتحاد

---

(1) ترقی پسند اردو ناول، از انور پاشا، ص 34۔

(2) بیسویں صدی میں اردو ناول۔ از: ڈاکٹر یوسف سرمست۔ ص، 314۔

کے ختم ہونے، ایک مشترکہ تہذیب کے مٹے، ایک تمدن کے گذرنے اور ایک دور کے ختم ہو جانے کا احساس شدید صورت میں ظاہر ہوا اور اس کی یاد شدید ہوگئی''۔(1)

اس دور میں نئے رجحانات میں ناول کے موضوعات اور اس کی تکنیک بہت اہم ہے جیسا کہ اس دور میں ''شعور کی رو'' کی تکنیک کا استعمال کیا ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''اس طرح سے دیکھا جائے تو اس دور کے سبھی ناول نگار جو اس تحریک سے وابستہ تھے انھوں نے ڈی ایچ لارنس، فرائڈ اور جیمس جوائس کے نظریات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ ان نظریات اور نظریات اور خیالات کی روشنی میں گئو دان کے بعد جو سب سے اہم ناول لکھا گیا وہ سجاد ظہیر کا ''لندن کی ایک رات'' جس میں شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے''۔(2)

مختصر یہ کہ حقیقت اور سچائی کو پیش کرنا اس دور کے تمام ناول نگاروں کی خصوصیات رہی ہے خواہ وہ کسی جگہ اور مقام ہی کے کیوں نہ ہوں۔ فخر الکریم صدیقی ترقی پسند ادیبوں اور ان کے خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''بہر حال ترقی پسند ادیبوں نے اردو ادب کی روشنی کو بدلنے کی کوشش کی اور حقیقت نگاری کا وہ رجحان جو ساری دنیا میں پھیلا ہوا تھا اردو میں بھی فروغ پایا۔ اب ہمارے ادب میں بعض ایسی تبدیلیاں نظر آنے لگی تھیں جس کی وجہ سے اردو ادب عالمی ادب کے رجحانات کی عکاسی کرنے لگا۔ حقیقت نگاری کے نتیجہ میں ادب میں خارجی اور داخلی دونوں طرح کی زندگیوں کو پیش کیا جانے لگا۔ خارجی زندگی کی پیش کش میں مارکسی کے نظریات کی وجہ سے ماحول اور سماج کا تجزیہ ضروری قرار پایا اور فرائڈ کے اثرات کی وجہ سے داخلی حقیقت پسندانہ عکاسی

---

(1) بیسویں صدی میں اردو ناول۔ از: ڈاکٹر یوسف سرمست۔ ص، 461۔

(2) بیسویں صدی میں اردو ناول۔ ص: 461

کے لئے جدید نفسیاتی علم اور تحلیل نفسی کو مدنظر رکھنا لازمی ہو گیا۔ الغرض کہ سماجی زندگی کی عکاسی کے لئے اس دور کے لکھنے والوں نے صرف جذبے ہی کو اپنا رہنما نہیں بنایا بلکہ اپنے مطالعے، مشاہدے، کو ادب کی اساس قرار دیا۔ سماج کی ترقی اور تنزل کے باریک و پیچیدہ مسائل کو سمجھا۔ سماج کی ساخت اور اس کے ہر جز کی خصوصیات کا عمیق مطالعہ کیا۔ ماضی کے کلچر، انسانی تہذیب کی بہترین روایات کو سماج کے تاریخی پس منظر میں آگے بڑھایا۔ ان باتوں کے اثر سے ادب و فن میں گہرائی نکھار، اور جمالیاتی توانائی پیدا ہوئی''۔ (1)

☆☆☆

(1) اردو ناول میں خاندانی زندگی، از فخر الکریم صدیقی، ص 182۔

تقسیم کے بعد اردو ناول

آزادی کے بعد سارے ملک میں ریاستوں، جاگیروں زمینداروں کا خاتمہ ہوا جس کی وجہ سے سارا جاگیردار طبقہ اور متوسط طبقہ اس کی زد میں آ گیا متوسط اور نچلے طبقے اور بعض غریب طبقوں کی معاشی زندگی پر اس کا اثر بہت گہرا ہوا کیونکہ ان کی ساری زندگی کا محور جاگیرداروں اور زمینداروں سے وابستہ تھا۔ اس لئے اس تباہی میں بہت سے لوگ آ گئے۔ یہی حال سرکاری ملازم پیشہ تاجر اور صنعت کاروں کا حال بھی ہی رہا۔

دوسری طرف تقسیم ملک نے ہندو پاک میں مختلف سیاسی، سماجی فرقہ وارانہ مسائل کو جنم دیا۔ تقسیم کے دوران بھڑ کنے والی فرقہ واریت، پاکستان سے نقل مکانی کر کے آنے والے رفیوجی، ان کی مستقل سکونت کی فکر، فرقہ واریت کی بڑھتی ہوئی دردناک یلغار اور کشمیر صوبہ کو لے کر پیدا ہوئی رنجشوں نے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کڑوا کر دیا۔ 1947ء اور اس کے آس پاس کا زمانہ ہندو پاک دونوں ممالک کی خاطر نہایت دردناک تھا۔ فرقہ وارانہ مار پیٹ، بھائی بھائی کے بیچ خون خرابہ، ہندو پاک دونوں ہی ملکوں میں اقلیت پر غالب اکثریت کے ذریعے اقلیتوں کی جہنم بنتی زندگیاں وغیرہ نے پورے ملک کو انسانیت و مروت کے لئے عبرتناک بنا دیا تھا۔ کچھ ہی مہنوں میں تقریباً پانچ لاکھ لوگ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے اور اربوں روپئے

کے مال وزر کی لوٹ مار نے عوام وخواص کی زندگی کو ترقی، امن وسکون کی راہ سے بہت پیچھے ڈھکیل دیا۔تقریباً سات لاکھ لوگوں کو نقل ومکانی پر آمادہ کیا گیا۔انھیں گھربار، رشتے دار، دوست واحباب سے جدا کر کے زندگی کی جدوجہد میں تنہا بے بس وبے سہارا چھوڑ دیا گیا۔پورا سیاسی، سماجی، معاشرتی،تہذیبی وانسانیت کا ڈھانچہ تتر بتر ہو کے رہ گیا۔ڈاکٹر سید علی حیدر ملک کی تقسیم کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب ''اردو ناول سمت ورفتار میں کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

> ''ملک کی تقسیم نے ہندوستان کو بعض بھیانک حالات سے بھی دوچار کیا۔ ملک دوحصوں میں منقسم ہوا۔خون اور آگ کی ہولی کھیلی گئی انسان انسان کے خون کا پیاسا ہوگیا۔ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ انسانیت سوز برصغیر انسانیت کا جنازہ نکال دیں گے۔آزادی کا پرچم کچھ اس طرح لہرایا کہ اپنے ساتھ تخریب و تعمیر دونوں پہلو لایا۔تخریبی حالات پہلے آئے اور تعمیری بعد میں،اس ہلچل میں زندگی نئے تقاضوں کے سانچے میں ڈھلنے لگی''۔(1)

1947ء کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں کئی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔اس سال نہ صرف ہندوستان کی تاریخ کے صفات بدل دیئے بلکہ ملک نے ایک نئے نظام حیات کی طرف قدم بڑھایا۔جس میں اندازفکر، طرزعمل، محسوسات،شعور اور تخیل سب بدلے نظر آئے سالہا سال کی پرانی قدروں نے دم توڑ دیا اور نئی قدروں نے ان کی جگہ لے لی۔اس پرانی اور نئی قدروں کے تصادم میں جذبات ومحسوسات ایک نئی مشکل میں سامنے آنے لگے۔اور ادب نے بھی ان بدلے ہوئے حالات کی ترجمان اور عکاسی کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔اور پھر ادیبوں اور شاعروں نے ان انسانیت سوز واقعات کو اپنا موضوع بنایا۔قمر رئیس ان حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آزادی کے بعد برصغیر میں سیاست،معیشت معاشرت تہذیب کے ہر

---

(1)اردو ناول سمت ورفتار، ڈاکٹر سید علی حیدر ص 179

> شعبے میں جو دوراس تبدیلیاں آئیں ۔فسادات اور ہجرت کے مصائب اور مسائل نے جو ہیجانی صورت حال پیدا کی اس نے مدت تک ادیبوں کو ذہنی اور تخلیقی تعطل کا شکار بنائے رکھا''۔(1)

1947ء تک اردو ناول میں، رومانیت، سماجی حقیقت نگاری اور فطرت نگاری اور تحلیل نفسی، مارکسی نقطہ نظر طبقاتی کشمکش، جیسے رجحانات ملتے ہیں۔لیکن 1947ء تک آتے آتے اردو ناول ایک ایسے موڑ پر پہنچ گیا۔ جہاں پر ایک طرف ملک کی آزادی اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل، قتل و خون فرقہ وارانہ فسادات، انسانیت سوز مظاہرے، سرحدی جھگڑے رشوت ستانی اور رہائش کی قلت تھی تو دوسری طرف روز بروز بڑھتی ہوئی تہذیبی قدروں کی شکست، معاشی بدحالی وغیرہ ایسے کئی مسائل اردو ناول کے سامنے آئے۔ اور لکھنے والوں کو کافی مواد ملا۔

تقسیم کے بعد کے زمانے میں اردو میں جتنے ناول لکھے گئے ہیں اتنے اردو ناول کی تاریخ کے کسی دور میں بھی نہیں لکھے گئے۔اس دور میں جتنے ناول لکھے اور چھاپے گئے ہیں انھیں دیکھ کر آسانی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ناول ہمارے ادب کے موجودہ دور کی سب سے مقبول صنف ہے۔اس دور میں لکھے گئے سبھی ناول جہاں ایک طرف قارئین کو گہرے شعور اور تجربات سے روشناس کراتے ہیں وہاں دوسری طرف تھکے ہوئے ذہنوں کو تفریح کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔تقسیم کے بعد فسادات کے واقعات کو سبھی ناول نگاروں نے اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ جیسے ایم اسلم کا رقص ابلیس، رشید اختر کا 15 راگست، رامپوری کا خون بے آبرو فردوس، رئیس احمد جعفری کا مجاہد، اور نسیم حجازی کا خاک اور خون، یہ سب ناول تقسیم کے بعد پیدا ہونے والے حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔اس کے ساتھ اس موضوع پر سب سے پہلے رامانند ساگر نے قلم اٹھایا۔ ان کا ناول ''اور انسان مر گیا'' نے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

---

(1) ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، اظہر رئیس، ص 389

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد کافی تعداد میں ناولیں لکھے گئے ہیں اور جن کا موضوع زیادہ تر فسادات پرمبنی ہے 47ء کے بعد ویسے تو سبھی ناول نگاروں نے بہت مقبول ناولیں لکھے اور سبھی ناول نگار قابل ذکر ہیں۔جن میں چند اہم ناول نگار یہ ہیں۔قرۃ العین حیدر،محمد احسن فاروقی،علی عباس حسینی،شوکت صدیقی،حیات اللہ انصاری،عبداللہ حسین ،قاضی عبدالستار،انتظار حسین،ممتاز مفتی،جمیلہ ہاشمی، رضیہ سجاد ظہیر،خواجہ عباس،کرشن چندر،اختر اورنیوی،اوپندر ناتھ اشک،رضیہ صبح احمد،صالحہ عابد حسین وغیرہ۔

قرۃ العین حیدر:

47ء کے اہم ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر سرفہرست ہیں۔قرۃ العین کا حیدر اپنا پہلا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' دسمبر 1948ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع تقسیم ہند ہے۔تقسیم ہند کے موضوع کے ساتھ ساتھ قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں لکھنو کی مٹتی ہوئی زندگی اور معاشرت کی جھلکیان بڑے المیہ انداز میں پیش کی ہے اور لکھنوی تہذیب اور لکھنوی زندگی کی بھرپور عکاسی بھی کی ہے۔اس ناول کی ایک اور خاص بات قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ڈاکٹر یوسف سرمست رقم طراز ہیں:

> ''قرۃ العین حیدر نے شعور کی رو کی تکنیک کے امکانات کو ''لندن کی ایک رات'' کے بعد اور واضح کیا۔اور اس کو کام میں لا کر انسانی شعور اور احساسات اور جذبات کے پردے پر ایک مٹتی اور گذرتی ہوئی تہذیب کے نقوش کو بہترین طریقے سے نمایاں کیا۔اس تکنیک کے ذریعہ قرۃ العین حیدر نے بھی ورجینا وولف کی طرح انسانی جذبات و احساسات پیش کئے ہیں۔'' (1)

اسی طرح نگینہ جبیں نے بھی خواتین ناول نگاروں میں انھیں پہلا مقام دیتے ہوئے ان کی ناول نگاری

---

(1)بیسویں صدی میں اردو ناول،از،ڈاکٹر یوسف سرمست،ص481۔

پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

''خواتین ناول نگاروں میں قرۃ العین وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے اردو ناول کو نئی تکنیک سے روشناس کرایا۔ان کے یہاں موضوع کی بہ نسبت اسے بیان کرنے کا طریقہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں ابتدا ہی سے مشترکہ تہذیب شعور اور وقت (جس میں تاریخ بھی شامل ہے) کو ساتھ رکھنے کی نظر آتے ہیں۔تہذیبی شعور نے ان سے ''آگ کا دریا'' میں ہندوستان کی قدیم تاریخ سے لے کر تقسیم تک کی مختلف تہذیبوں کی تبدیلیوں اور اس میں ہونے والے اتار چڑھاؤ کا جائزہ پیش کرتا ہے۔تقسیم ہند کو قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں کا بنیادی موضوع بنایا اور سب سے پہلے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' دسمبر 1948ء میں لکھا۔یہ ناول ہندوستان کی آزادی کے قبل یوپی کے تعلقہ دارانہ نظام کے عروج وزوال کے ساتھ پورے ملک کے تہذیبی زوال پر روشنی ڈالتا ہے۔''(1)

قرۃ العین حیدر ''میرے بھی صنم خانے'' کے بعد انھوں نے سفینۂ غم دل، اور ''آگ کا دریا'' لکھا۔ ''آگ کا دریا'' ان کا شاہکار ناول ہے ''آگ کا دریا'' 1959ء میں شائع ہوا۔

''آگ کا دریا'' میں ہندوستان کی ڈھائی ہزار سال پرانی تہذیبی تاریخ کا بیان ملتا ہے۔جس میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ، تہذیبی صورتیں اور مذہبی رنگ کے ساتھ عہد قدیم سے 1957ء تک عوامی زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ہندوستان کی قدیم تاریخ کا کوئی بھی واقعہ چاہے وہ سیاسی ہو یا تہذیبی آگ کا دریا میں موجود ہے۔قمر رئیس اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے ایک تاریخی ناول قرار دیتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''قرۃ العین حیدر کا ناول 'آگ کا دریا'' بھی ایک تاریخی ناول کہا جا سکتا

---

(1) اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، 1947ء اور اس کے بعد۔ازنگلینہ جبیں،ص 198-118۔

ہے۔ یہاں ماضی کی تہذیبی میراث اور فکری سرمایہ سے ان کا تعلق کسی احیائی یا ماضی پرستانہ ذہنی رویے کی نشان دہی نہیں کرتا۔ اس کے برعکس وہ ماضی سے حال کو سمجھنے اور سنوارنے کا کام لیتی ہیں مجموعی طور پر ان کا نظریہ تاریخ برسراقتدار طبقے کی استحصالی سازشوں کے خلاف عوام دوست قوتوں، فلسفوں اور تحریکوں کی دریافت سے الگ اپنا وجود نہیں رکھتا''۔(1)

اس ناول کے تین اہم کردار ہیں۔ گوتم، کمال، سرل ان تینوں کرداروں سے ناول کا پلاٹ آگے بڑھتا ہے۔ دراصل قرۃ العین حیدر نے ان تین کرداروں کو تین زمانوں اور تین تہذیبوں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ جو ہندوستان کی تاریخ پر محیط ہیں۔ ان کردار کی زندگی کے حالات اور ان کے واقعات کو پیش کر کے قرۃ العین حیدر نے ہندوستان کی ایک تاریخ سازی کا کام کیا ہے۔ ڈاکٹر سید علی حیدر نے اس ناول اور اس کی خصوصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ناول نگار نے ہندوستان کی تاریخ کے وسیع پس منظر میں تین مختلف ادوار قوموں اور تہذیبوں کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں کرداروں کے ذریعہ قوموں کی معاشرتی، سماجی، مذہبی، سیاسی، حالات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو الگ الگ ادوار کی تہذیبی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ اردو ادب میں ایک انوکھا اور اچھوتا تجربہ ہے اور اردو ناول نگاری کے باب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے''۔(2)

اسی طرح فخر الکریم صدیقی ناول ''آگ کا دریا'' کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے اسے عہد ماضی سے لے کر عہد حاضر تک کی ایک دلچسپ کہانی کہتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''آگ کا دریا، موضوع، ماحول اور کرداروں کے اعتبار سے ایک وسیع تصویر

---

(1) ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، اظہر رئیس 389-388۔

(2) اردو ناول سمت و رفتار، ڈاکٹر سید علی حیدر، ص 185۔

پیش کرتا ہے۔ یہ ناول نہ صرف ان کے فن میں بلکہ اردو ناول نگاری میں ایک نئی منزل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔قرۃ العین نے اس ناول میں ہندوستان کی ڈھائی ہزار سال قبل کی تہذیب کا خاکہ پیش کیا ہے ویدا اور اپنشد کے زمانے کی زندگی، طرز فکر معاشرت اور خاندانی زندگی کا نقشہ ہمارے سامنے ایک خوابناک کیفیت پیدا کردیتا ہے۔''آگ کا دریا''ہندوستان کے عہد ماضی سے لے کر عہد حاضر تک کی دلچسپی ذہنی وتمدنی کہانی ہے۔(1)

محمد احسن فاروقی:

1948ءمیں محمد احسن فاروقی کا ایک ناول''شام اودھ'' بھی خصوصیات کا حامل ہے۔اس ناول میں فاروق نے اودھ تہذیب کے خدوخال بڑی خوبصورت اور حسین پیرائے میں پیدا ہونے والے حالات کو موضوع بنایا گیا ہے۔احسن فاروقی نے اس ناول میں زبان و بیان کے بڑے دل کش نمونے پیش کئے ہیں جس سے ناول میں بڑی جان پیدا ہوتی ہے اور اسی بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ناول نگار کو زبان و بیان پر کتنی مہارت اور عبوریت حاصل ہے۔منظر نگاری اور جذبات نگاری کے بھی بہترین نمونے اس ناول میں ملتے ہیں۔فنی خوبیوں کے اعتبار سے ناول میں تمام خوبیاں موجود ہیں۔

علی عباس حسینی:

اس دور کے اہم ناول نگاروں میں علی عباس حسینی بھی ہیں۔علی عباس حسینی ناول''شاید کے بہار آئی'' 1954ءمیں شائع ہوئے۔اس کے بعد ایک اور ناول''زیٹیوں کا بادشاہ حکیم بابا''1955ءمیں شائع ہوا اور ناول''ندیا کنارے''اگست 1964ءمیں شائع ہوا۔

شاید کے بہار آئی، کتاب دنیا لکھنو سے شائع ہوا۔ جو 210 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ناول آزادی کے بعد ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ اس کا تعلق دیہی زندگی سے وابستہ کسانوں اور

(1)اردو ناول میں خاندانی زندگی، افتخر الکریم صدیقی، ص218۔

مزدوروں کی معاشی دقتوں سے ہے۔نصیر اور برجموہن میں گہری دوستی ہے۔ دونوں اپنے گاؤں رتن پور کی ترقی کے لئے مشترکہ کھیتی کرواتے ہیں اور کسانوں کو متحد کرکے اس کے فوائد بھی بتاتے ہیں۔گاؤں کی عورتوں اور مردوں کی تعلیم کے لئے اسکول کھولتے ہیں جن میں برجموہن کی بیوی انیلا اور نسیر کی بیوی عشرت حصہ لیتی ہیں اس طرح ناول کے سین پر کچھ دیر کے لئے گاؤں کے مزدور اور کسان نظر آتے ہیں۔ناول کا یہ حصہ غالباً ہندوستان میں نئی حکومت کو کوآپریٹو فارمنگ اسکیم کے تحت لکھا گیا ہے۔

زیٹیوں کا بادشاہ حکیم بانا:(1955ء)

زیٹیوں کا بادشاہ حکیم بانا۔علی عباس حسینی کا تیسرا ناول ہے جو پہلی مرتبہ ادارہ فروغ اردو معین آباد لکھنو سے 1955ء میں شائع ہوا جیسا کہ اسکے نام ہی سے واضح ہے کہ یہ ایک غبی آدمی کے واقعات پر مشتمل ناول ہے مصنف نے خود ہی غرض مصنفت میں واضح کردیا ہے کہ ''حکیم بانا'' ایک مضحک کردار ہے جو حد درجہ دروغی، جھوٹا اور زیٹیا تھا۔ ہماری جاگیردارانہ سوسائٹی میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔حکیم بانا کا کردار اس سوسائٹی کی کلچری ذہنیت کو نمایاں کرتا ہے۔جس میں غیبت بھی تھی، رومانیت بھی، حقیقت سے چشم پوشی بھی تھی۔جھوٹے خوابوں کی تعبیروں کی تلاش بھی،حکیم بانا کو ایک طرح سے سرشار کے خوجی کا چربہ سمجھنا چاہئے۔

شوکت صدیقی:

تقسیم ہند کے سلسلہ میں لکھے جانے والے ناولوں میں شوکت صدیقی کے دو ناول ''خدا کی بستی'' اور ''جانگلوس'' کافی مقبول ناولیں ہیں۔

''خدا کی بستی'' پاکستان کے قیام کے بعد شائع ہونے والا پہلا ناول ہے جس میں پاکستانی معاشری کی سچی عکاسی کی گئی ہے۔اس ناول میں تقسیم ہند کے بعد زندگی کے پورے نظام جو درہم برہم ہو چکا تھا۔اسی

حالت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے اور اس کے ساتھ سماجی حقائق نگاری، عصری زندگی کے پیچیدہ حقائق کو پیش کیا ہے ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ''اس دور میں شوکت صدیقی کا ناول خدا کی بستی پہلا ناول ہے جس میں پریم چند کی طرح عصری زندگی کے پیچیدہ حقائق اور سماجی آویزش کو سمجھنے اور پیش کرنے کی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔انھوں نے سماجی حقائق نگاری کی اس اعلیٰ روایت کو نئی وسعت دی ہے جس کی تعمیر پریم چند نے کی تھی ۔ان کا طبقاتی شعور اور انسان دوستی کا تصور ناول میں پریم چند آگے کی راہ دکھاتا ہے''۔(1)

شوکت صدیقی کا دوسرا ناول ''جانگلوس''میں بھی پاکستانی معاشرے کے مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے خاص طور پر پاکستان دیہی معاشرے میں انسان کی صورت حال کو موضوع بنایا گیا ہے۔

حیات اللہ انصاری:

تقسیم ہند کے بعد لکھنے والوں میں حیات اللہ انصاری کا نام بھی اہم ناول نگاروں میں لیا جاتا ہے۔ان کا ناول ''لہو کے پھول'' جو تقسیم ہند کے موضوع پر لکھا گیا ہے تقسیم ہند کے موضوع پر لکھے جانے والے ضخیم ناولوں میں اس ناول کا شمار ہوتا ہے۔ یہ ناول پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔اس ناول میں شمالی ہند کے 1911ء سے 1955ء تک کے سماجی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔اس ناول میں سیاسی حالات کی عکاسی کے علاوہ ہندوستان کی عظمت کا ذکر بڑے خوبصورت انداز میں ملتا ہے اور اس ناول میں منظر نگاری کے اعلیٰ نمونے بھی ملتے ہیں۔اس ناول میں نگاول نگاری کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ ناول نگار نے تاریخی واقعات کو تخلیقی رنگ و آہنگ عطا کر کے فن کاری کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ یہ ایک تاریخی ناول نہ ہونے کے باوجود بھی اس سے اس دور کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ کی ترتیب کے لئے نتیجہ خیز مواد فراہم ہوسکتا ہے۔حیات اللہ انصاری نے ناول کو اس دور کی ہندوستانی سیاسی سرگرمیوں کے اعتبار سے چار

---

(1)بحوالہ۔اردو ناول،سمت و رفتار۔ڈاکٹر سید علی حیدر،188۔

دور میں تقسیم کیا ہے۔الغرض تقسیم کے بعد لکھے جانے والے سبھی ناولوں میں ''لہو کے پھول'' بھی اہمیت کا حامل ہے۔

عبداللہ حسین:

تقسیم ہند کے بعد لکھے جانے والے ناولوں کے سلسلہ میں عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' اپنی گونا گوں خصوصیات کی بنا پر اہم ہے۔عبداللہ حسین نے ''اداس نسلیں'' میں پہلی جنگ عظیم سے لے کر تقسیم ہند تک کے حالات کو اس ناول کا موضوع بنایا ہے۔

ڈاکٹر سید علی حیدر لکھتے ہیں:

> ''عبداللہ حسین کا یہ ناول اردو کا پہلا ناول ہے جس میں پہلی جنگ عظیم سے لے کر تقسیم ہند تک انگریزوں کی سیاسی ریشہ دوانیوں اور تحریک آزادی کے مختصر مراحل میں عوام کی شمولیت کے ساتھ تاریخی واقعات کے عمل اور ردعمل کا خوبصورت سلسلہ ملتا ہے۔پنجاب کے کسانوں اور مزدوروں جیسی تصویریں، اداس نسلیں، میں پیش کی گئی ہیں''۔(1)

اداس نسلیں، میں خاندانوں کی زندگیوں کے مطالعہ سے ہندوستان کے تاریخی اور سیاسی پس منظر میں جاگیردارانہ نظام میں کسانوں اور مزدوروں کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے اور وقت کے ساتھ ان کی بدلتی ہوئی زندگی کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ڈاکٹر سید علی حیدر اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کو ناول کی تاریخ کا ایک روشن عنوان قرار دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

> ''عبداللہ حسین کا یہ ناول اپنی گونا گوں خصوصیات کی بنا پر ایک تاریخی حیثیت کا مالک ہو جاتا ہے جس کے حالات وواقعات تاریخ کا سہارا لے کر آگے بڑھتے ہیں۔دوسری جنگ عظیم کے واقعات جلیان والا باغ کا سانحہ، پرنس آف

---

(1) اردو ناول سمت ورفتار۔ڈاکٹر سید علی حیدر،ص 198

ویلز کا ہندوستانی دورہ، سائمن کمیشن لکھنو آمد، پارلیمنٹ ہاؤز میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی بات چیت ماؤنٹ بیٹن، پنڈت نہرو، جناح اور دوسرے لیڈروں کی بات چیت یہ تمام واقعات اس ناول کو ناول سے زیادہ تاریخ بنا دیتے ہیں۔اور یہ ناول تاریخی بھی ہو جاتا ہے اور ناول کی تاریخ کا ایک روشن عنوان بھی''۔(1)

قاضی عبدالستار:

قاضی عبدالستار کے دو شاہکار ناول ہیں۔ایک ''شب گزیدہ'' اور دوسرا ''پہلا اور آخری خط'' ہے۔ ناول ''شب گزیدہ میں قاضی عبدالستار نے جدید اور قدیم خاندانی نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے خاندانی زندگی میں کیسے روز بروز تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کا بھی اندازہ لگتا ہے کہ کیسے اس ماحول میں ہر خاندان میں ایک جنگ جاری ہے۔ جہاں قدیم روایات جدید ذہنوں سے اپنی بات منوانا چاہتی ہے۔ناول ''شب گزیدہ''میں ہمیں طبقاتی سماج کے رسم ورواج مذہبی عقائد،عشق و عاشقی اور رنگ رلیوں کے ساتھ ملک میں چلتی ہوئی جنگ آزادی کی بھی جھلکیاں ملتی ہیں۔

قاضی عبدالستار کا دوسرا اہم ناول ''پہلا اور آخری خط'' ہے جو 1952ء میں شائع ہوا۔اس ناول میں قاضی عبدالستار آزادی کے بعد اودھ کی مٹتی ہوئی جاگیردارانہ تہذیب کو موضوع بنایا ہے خاص طور پر آزادی سے قبل اودھ کے مسلمانوں تعلقہ داروں کے سیاسی اور سماجی نظم ونسق کو موضوع بنایا ہے اور اسی کے توسط سے خاندانی زندگی کو پیش کیا ہے۔اس ناول کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ قاضی عبدالستار نے اس ناول میں شہر میں رہنے والے تعلقہ دار گھرانوں کی زندگی کو بڑے اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ ناول تعلقہ دار نظام زندگی کا آئینہ ہے، ڈاکٹر سید علی حیدر قاضی عبدالستار کے ناولوں پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''قاضی کے ناولوں میں لٹتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کے لئے ہمدردی

---

(1) اردو ناول سمت ورفتار۔ڈاکٹر سید علی حیدر۔198-199۔

ہے۔ان کے مسائل سے ذہنی وابستگی ہے۔لیکن کسانوں سے اپنی وسیع سماجی بصیرت کی بنا پر دلی ہمدردی رکھتے ہیں اور گاؤں کو اس کے ثقافتی اور تہذیبی پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں قاضی نے تاریخی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے اس سلسلے میں ان کے دو ناولوں صلاح الدین ایوبی اور داراشکوہ کا خاص طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے۔ان دونوں ناولوں میں ماضی کی بازگشت انھوں نے تخیل کی مدد سے ماضی کو پوری جولانیوں کے ساتھ قلم بند کیا ہے اس سلسلہ میں جزئیات نگاری پر توجہ رکھی ہے جس کی بنا پر قاضی کے ناول تاریخی بصیرت کے علاوہ ادبی معیاروں پر پورے اترتے ہیں''(1)

خواجہ احمد عباس:

خواجہ احمد عباس نے اپنے ناولوں میں ایک صحتمند سماج کی تشکیل کی ہے اس سماج میں برابری،محبت اور ایک دوسرے کے خاطر محبت ومروت ہے۔ذات پات اور اونچ نیچ،امیر وغریب،کالے وگورے میں فرق نہیں ہے۔انسانیت ان کرداروں کا محور ہے۔سماج کا وسیع مطالعہ وہ نہایت خلوص اور دردمندی کے ساتھ کرتے ہیں۔خواجہ احمد عباس کی خواہش تھی کہ بدلتے دور کے اعتبار سے ہی سماج اور انسان کو تبدیل ہونے اور ترقی کی طرف بڑھتے رہنا چاہئے مگر حقیقت اس سے بالکل نہیں تو کچھ الگ ضرور ہے کہ زندگی اور اس کی قدروں کی تبدیلی کے باوجود آج بھی فرسودہ نظام حیات کی فرسودہ خیالات کی گرفت میں ہے اور ایک خاص طبقہ پورے سماج پر حاوی ہے اور پسماندہ طبقات ہر شعبہ حیات میں احساس کمتری کے شکار نظر آتے ہیں اور انھیں وجوہات نے ترقی کی راہوں کو منجمد کر کے رکھ دیا ہے۔

خواجہ احمد عباس کے دو شاہکار ناول ہیں ایک''انقلاب''اور دوسرا''چار دل چار راہیں''خواجہ احمد عباس کا ناول''انقلاب''اردو میں 1975 میں چھپا لیکن یہ ناول دوسری زبانوں میں 1955 سے پہلے چھپ چکا

---

(1)اردو ناول سمت و رفتار۔ڈاکٹر سید علی حیدر،ص 202۔

تھا۔ اس ناول میں خالص سیاست کوموضوع بنایا ہے۔ ناول ''انقلاب'' میں 1932ء سے 1949ء تک کے ہندوستان کے سیاسی جدوجہد کی تاریخ ہے۔

خواجہ احمد عباس کا دوسرا ناول ''چار دل چار راہیں'' 1959ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ حقیقتیں انسانوں کے لئے مسرت افزا بھی ہیں اور اداسی و بے بسی کا باعث بھی۔

کرشن چندر:

اردو ناول نگاری میں ترقی پسند تحریک کے خیالات کوفروغ دینے والوں میں کرشن چندر کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے ان کی تخلیقات کا محور بھی زیادہ تر سماج کے کریہہ پہلوؤں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ حالانکہ ان ناولوں میں اکثر رومانی بھی ہیں مگر زیادہ تر پسماندہ اور پست طبقہ کی نمائندگی کرنے والے کرداروں کو انھوں نے اپنے ناولوں کا ہیرو بنایا ہے۔ پریم چند کے بعد ناول کے فن کو مزید وسعت بخشنے میں کرشن چندر کا ایک اہم مقام ہے۔ زندگی اور اس سے متعلق تنوع و مسائل کو ناولوں میں پیش کرنے والوں میں کرشند چندر کا نام اہم ہے۔ فرد اور جماعت کے مسائل اور کشمکش زندگی، جذباتی و اخلاقی رشتوں سے پیدا شدہ مسائل کو انھوں نے نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ کرشن چندر کے ناولوں میں آزادی اور آزادی سے متعلق موضوعات بھی ملتے ہیں۔ چونکہ کرشن چندر کی ذہنیت کی تربیت کا دور ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا اس لئے رومان پسند ذہنیت رکھنے کے باوجود بھی کرشن چندر مارکسی خیالات سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکے۔ یوں بھی ادیب پہلے ہی حساس ہوتا ہے وہ اپنے خیالات واحساسات کو قلم کی زبان بیان کر عام آدمی کو سماج میں موجود ان اشیاء کی طرف متوجہ کرتا ہے جسے عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ حقیقت بیانی ان کے ناولوں کا بھی ایک اہم وصف ہے۔ انھوں نے کشمیری عوام کو اکثر و بیشتر ناول کا موضوع بنایا ہے۔ کشمیریوں کی غریبی، پسماندگی اور استحصال کشمکش سے پر حالات زندگی کا تذکرہ انھوں نے اپنے ناولوں میں موثر انداز میں کیا

ہے۔جاگیرداری اورسرمایہ داری کی لعنتوں کے سماج پر پڑنے والے مضراثرات اوران کی حکومت کی آگ میں جھلتے عوام کے چہروں کوانھوں نے اپنے ناولوں میں باقاعدگی سے بیان کیاہے۔حالانکہ انھوں نے نیچرلزم کواہمیت دی ہے مگر مارکسی نقطہ نظر بھی ان کے قلم کامحور رہاہے۔جاگیردارانہ سماج میں پسماندہ عوام کی کشمکش،قدیم ہندوستان میں مروجہ ذات پاک کی بندش وغیرہ کوکرشن چندر نے اپنے ناولوں کاموضوع منتخب کیاہے۔

1947ء کے بعد شائع ہونے والے کرشن چندر کے ناولوں میں''جب کھیت جاگے''،''ایک گدھے کی سرگزشت''،''ایک گدھے کی واپسی''،''باون پتے''وغیرہ مقبول ناولیں ہیں۔

ناول''جب کھیت جاگے''کرشن چندر کے ناولوں میں ایک منفرد حیثیت رکھتاہےاس ناول میں خالص سیاسی فضاکوموضوع بنایاہے۔''جب کھیت جاگے''کاپس منظر آندھراپردیش کاایک خطہ تلنگانہ ہےاس ناول کو انھوں نے ایک انقلابی ڈھنگ سے پیش کیاہے۔کرشن چندر کاناول''ایک گدھے کی سرگزشت''ایک مزاحیہ اورطنزیہ ناول ہےاس کے ذریعہ کرچن چندر نے ہندوستانی،سیاسی،سماجی اورمعاشی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ ناول''باون پتے''بھی کرشن چندر کے دوسرے ناولوں کی طرح مقبول ناول ہے۔اس ناول میں کرشن چندر فلم انڈسٹری کی زندگی کوموضوع بنایاہے۔

انتظار حسین:

تقسیم ہند کے موضوع پرانتظار حسین کاناول''چاند گہن''ایک منفردمقام رکھتاہےاس ناول کے ذریعہ انتظار حسین ہندوستانی مسلمانوں کی داستان حیات کاالمیہ بیان کیاہے۔اس کے ساتھ ناول میں فرقہ وارانہ فسادات،قتل وغارت گری،عصمت دری،لوٹ مار،وغیرہ ایسی کرب ناک تصویریں پیش کی کہ قاری تڑپ تڑپ اٹھتاہےاورمہاجروں کے کیمپ کی زندگی کرب وملال مایوسی،کسم پرستی کی کیفیتیں شعور پرکاری ضرب لگاتی ہیں۔ان میں مدد کے نام پراپنوں کااستحصال صورت حال کی المناکیوں میں اضافہ کردیاہے۔

اوپندر ناتھ اشک:

اوپندر ناتھ اشک ''گرتی دیواریں'' جو 1948ء میں شائع ہوا۔ ''گرتی دیواریں'' متحدہ خاندانی زندگی کی دشواریوں، مردوں کے ظلم اور عورتوں کے استحصال کی ایسی مثالیں بھی پیش کرتا ہے بیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائیوں میں پنجاب کے متوسط گھرانوں میں عورتوں کی سماجی اور معاشی حقیقت کی ترجمانی کرتی ہیں۔

1947ء کے بعد ''ممتاز مفتی کا ناول ''ایلی پور کا ایلی'' بھی ایک شاہکار ناول ہے۔ اس ناول میں ممتاز مفتی نے انسانی زندگی کے جنسی پہلوؤں کے بعد گوشے بڑے لطیف اور دلکش انداز میں پیش کیے ہیں۔ یہ ناول متوسط طبقہ کے افراد کی تصویر پرکشش انداز میں کرتا ہے۔

1947ء کے بعد خاتون ناول نگاروں میں، جمیلہ ہاشمی، صالحہ عابد حسین، رضیہ فصیح احمد، رضیہ سجاد ظہیر وغیرہ مقبول ناول نگار ہیں۔

رضیہ فصیح احمد کے ناولوں میں '' آبلہ پا'' انتظار موسم گل، اور اک جہاں اور بھی ہے۔ مشہور ناولیں ہیں ان تمام ناولوں کا موضوع سماجی زندگی ہے۔ جن میں پاکستانی سماج اپنی تمام تر رنگینوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ سماجی حالات کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے اس کی سب سے اہم اکائی خاندان کو بھی اپنے ناولوں میں نظر انداز نہیں کیا ہے اس اعتبار سے 'آبلہ پا'' اور اک جہاں اور بھی ہے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔

رضیہ سجاد ظہیر حقیقت میں افسانہ نگار ہیں لیکن انھوں نے چند ناول بھی لکھے اور ترجمہ کئے ہیں ان میں ان کا ناول ''سمن'' خصوصیات کا حامل ہے۔ اس ناول کا مقصد کسی سماجی یا سیاسی مسئلہ کا حل پیش کرنا نہیں ہے بلکہ اپنے دور کے حالات لوگوں کی ذہنیت اور معاشرت کی روداد میں ثقافتی زندگی کی پستی و بلندی کے عناصر تصادم یا امتزاج سے ہمارے شعور کو آگاہ کرنا تھا۔

خواتین ناول نگاروں میں صالحہ عابد حسین خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے ناول زندگی کے مطالبات

اور تقاضوں کے ترجمان ہوتے ہیں اور صالحہ عابد حسین اپنے ناولوں میں زندگی کی اعلیٰ اقدار کی علم بردار اور زندگی کے مسائل کا غیر معمولی ذہانت وبصیرت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ان کی تحریروں سے با مقصد ادب کے تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے۔

صالحہ عابد حسین کے اہم ناولوں میں ''قطرے سے گہر ہونے تک'' راہ عمل، یادوں کے چراغ، اپنی اپنی صلیب ہیں۔غدرا کے بعد قطرے سے گہر ہونے تک لکھا۔یہ ناول ان کے فکروفن کے لحاظ سے کوئی اہم کارنامہ نہیں ہے۔قطرے سے گہر ہونے تک ناول ان کے فنی شعور کے ارتقاء کا سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔

1947-60ء تک لکھنے والے ناول نگاروں میں ایک نام ''اختر اور ینوی'' کا بھی ہے۔ان کا ناول ''حسرت تعمیر'' جو 1960 میں شائع ہوا ہے۔یہ ان کا پہلا اور آخری ناول ہے۔ 1960ء تک اردو ناولوں میں غالباً یہ پہلا ناول ہے جسے موضوع کے اعتبار سے انفرادیت حاصل ہے۔

پریم چند کی طرح انہوں نے غریب اور پسماندہ طبقہ سے متعلق کرداروں کو اپنے ناولوں کا موضوع اور حاصل قرار دیا ہے۔انھوں نے کسانوں مزدوروں، ملوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی اصلی زندگی کی مرقعہ کشی اس ناول میں کی ہے۔اس ناول میں چھوٹا ناگپور کی حقیقی اور فطری آب وہوا میں اپنی سانسیں گننے والے آدیباسیوں کی زندگیوں کو اس ناول میں خوبصورتی سے پیش کیا ہے گیا ہے۔ان کی روزمرہ زندگی، دکھ سکھ اور ان کے رہن سہن، ان کے عادات واطوار اور ان کے تہواروں اور رسموں وغیرہ کا بیان نہایت موثر انداز میں کیا گیا ہے۔موضوع کے اعتبار سے اس ناول کے تین پہلو ہیں۔جس میں پہلا تو اس ناول کے مرکزی کردار محبوب کی زندگی اور آس پاس کے ماحول کو پیش کرتا ہے اور دوسرے اس کے اردگرد موجود سماج و سوسائٹی کا اس کی ذاتی زندگی پر اثر انداز ہونے والی پریشانیوں محرومیوں اور ناآسودگیوں سے پیدا شدہ احساس کمتری کا بیان موثر انداز میں ملتا ہے اور تیسرا اور آخری پہلو چھوٹا ناگپور کے کسان اور مزدور ہیں جن کو اس ناول میں وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔

اردو ناول میں ابتداء سے لے کر 1960ء تک ہمیں زیادہ تر تین طرح کے رجحانات ملتے ہیں۔ لہذا انور پاشا ان رجحانات پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''پہلا حصہ 1857ء کے انقلاب کی ناکامی اور انگریزی حکومت کے تسلط کے سبب پیدا شدہ حالات سے متاثر ہو کر سماجی، معاشرتی مذہبی اور اخلاقی و تعلیمی اصلاح کے نقطۂ نظر سے لکھے گئے ناولوں کا ہے۔ دوسرا حصہ ایسے ناولوں کا ہے جن میں موضوعات تو وہی سماجی اور معاشرتی اصلاح سے متعلق ہیں مگر یہاں رجحان باغیانہ انقلابی اور رومانی ہیں۔ باالفاظ دیگر ان کی اصلاح پسندی کا رجحان جاگیردارانہ اخلاقیات اور فرسودہ سماجی قدروں سے بوجھل اصلاح پسندی کے خلاف ایک احتجاجی رجحان ہے۔ تیسرا حصہ ان ناولوں پر مشتمل ہے جن کا موضوع سیاسی، سماجی اور معاشی بحران اور ہیجان کی عکاسی اور ان میں پوشیدہ تغیر و تبدل کے امکانات کی تلاش اور نشاندہی پر مبنی ہے لیکن یہاں رجحان بجائے باغیانہ اور رومانی ہونے کے حقیقت پسندانہ اور واقعیت سے قریب تر ہے''۔(1)

☆☆☆

(1) ترقی پسند اردو ناول۔ از، انور پاشا۔ ص 127۔

باب سوم

اردو ناول میں عصری مسائل
1960ء کے بعد

اردو ناول میں عصری مسائل 1960ء کے بعد

(1960ء تا 1980ء)

منتخب ناولیں:

1) ایک عورت ہزار دیوانے: کرشن چندر 1960ء
2) تلاش بہاراں: جمیلہ ہاشمی، 1961ء
3) ایک چادر میلی سی: راجندر سنگھ بیدری۔ 1962ء
4) معصومہ: عصمت چغتائی۔ 1962ء
5) آنگن: خدیجہ مستور۔ 1963ء
6) کالا شہر گورے لوگ۔ احسان الحق۔ 1965ء
7) بہت دیر کردی۔ علیم مسرور۔ 1972ء
8) ایوان غزل: جیلانی بانو 1973ء
9) گوری سوئے سیج پر۔ صالحہ عابد حسین۔ 1977ء
10) آخری شب کے ہمسفر۔ قرۃ العین حیدر۔ 1979ء

ناول کوعہد جدید کا رزمیہ کہا جاتا ہے کیوں کہ عہد جدید کی انسانی زندگی جس قدر پیچ وخم، شکست وریخت، تضادو تصادم اور آویزش و آمیزش سے دو چار ہے اس کے اظہار کے لیے جتنی صلاحیت صنف ناول میں ہے اتنی کسی دوسری اصناف میں نہیں پائی جاتی۔ ناول کے ذریعہ کسی بھی معاشرے ملک یا قوم کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کی تصویر کشی بآسانی کی جاسکتی ہے۔ ناول معاشرہ، فرد اور ذات کے خارجی پہلو کے ساتھ ساتھ داخلی تضادو تصادم اور اس کے محرکات کو بھی پیش کرتا ہے۔ اسی لیے ناول کو قوم، ملک یا معاشرے کی فکر اور نظریاتی فضا کا اظہار بھی کہتے ہیں۔

اردو ناول نگاری اپنے ابتدائی زمانے سے ہی اپنے عہد کی آئینہ داری کرتی آئی ہے شروع میں اردو ناول کا دائرہ اخلاقی، مذہبی و معاشرتی اصلاح سے متعلق موضوعات و مسائل تک محدود رہا۔ لیکن جیسے جیسے اردو ناول ارتقاء کی منزل طے کرتا گیا اس کے موضوعات و مسائل کا دامن بھی وسیع ہوتا چلا گیا اور اس کے ذریعہ سماجی، معاشی اور سیاسی وتہذیبی مسائل وموضوعات کی تصویر کشی کی گئی اور یہی تصویر کشی نے اردو ناول میں بنیادی رجحان کی حیثیت اختیار کرلی۔

1947ء کے بعد اردو ناول نگاری ایک نئے موڑ سے آشنا ہوئی۔ مسلسل جدو جہد کے بعد برصغیر انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا۔ لیکن یہ آزادی اپنے ساتھ تقسیم کا المیہ بھی لے کر آئی تقسیم کو لے کر قتل و غارت گری اور خوں ریزی بھی ہوئی بڑی تعداد میں ہندو پاک کے کئی لوگ بے گھر ہو گئے چنانچہ ان حالات اور واقعات نے نہ صرف دیرپا جسمانی، ذہنی، سیاسی اور معاشرتی اثرات قائم کیے بلکہ لاکھوں زندگیاں براہ راست ان واقعات و حادثات سے متاثر ہوئیں اور ادیب و فنکار بھی ان واقعات و

حادثات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انھوں نے تحریک آزادی تقسیم ہند، فسادات، ہجرت اور ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے کئی حالات و کیفیات اور عصری مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا گیا۔ اردو ناول نگاری پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے اور اس طرح سے اردو ناول فکر و فن اور مواد و تکنیک کے اعتبار سے نئے تقاضوں اور نئی جہتوں سے ہمکنار ہوا۔

ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی و ثقافتی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہوئی جس سے کئی مسائل پیدا ہوتے گئے اور ان کے اثرات ادب پر مرتب ہوئے گئے گویا ادب کی دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ اردو ناول نگاری بھی ان تبدیلیوں اور مسائل سے متاثر ہوئی۔ غرض 1947ء سے 1960ء تک جو ناول لکھے گئے ان کے بنیادی موضوعات و مسائل میں تحریک آزادی، تقسیم ہند، فسادات، فرقہ پرستی ہجرت، معاشی بدحالی بے روزگاری کے علاوہ عورتوں کی سماجی حیثیت اور ان کے مسائل، جنسی اور نفسیاتی مسائل وغیرہ رہے ہیں اور اس دور میں جتنے ناول لکھے گئے اتنے اردو ناول کی تاریخ کے کسی دور میں نہیں لکھے گئے ایک طرح سے ہم اس دور کو ناول کی مقبولیت کا زمانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح سے اس زمانے میں لکھے گئے تقریباً تمام ناولوں میں ہندوستان کی آزادی اور اس کے فوراً بعد کے حالات صاف نظر آتے ہیں۔

1960ء تا 1980ء کے درمیان جتنے بھی ناول لکھے گئے تقریباً تمام نمائندہ ناولوں کے موضوعات و مسائل بھی ہندوستان کی آزادی اور اس کے فوراً بعد کے حالات ہی رہے ہیں جیسے جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ اور ان کے مسائل تحریک آزادی، تقسیم ہند، فسادات، ہجرت و مہاجروں کے مسائل خواتین کی سماجی حیثیت اور ان کے مسائل وغیرہ لیکن 1960ء سے 1980 کے دوران نمائندہ موضوعات و مسائل کے علاوہ جو عصری مسائل ہمیں اس دور کے نمائندہ ناولوں میں ملتے ہیں۔

ان میں فحاشی وجنسی مسائل، ذات پات کے مسائل، شناختی کا مسئلہ، مفلسی، معاشی بدحالی، مادیت پرستی، خودغرضی، اخلاقی قدروں کی کمی، جہیز کے مسائل، مشترکہ تہذیب کا مسئلہ، غیر ملکوں میں زندگی گذارنے کے مسائل، وغیرہ اہم ہیں۔

1960ء تا 1980 کے درمیان یوں تو بہت سے ایسے ناول لکھے گئے ہیں جو مذکورہ تمام نمائندہ موضوعات ومسائل کی عکاسی کرتے ہیں لیکن یہاں 60 تا 80 کے درمیان لکھے گئے چند اہم ونمائندہ ناول جیسے کرشن چندر کا ناول ''ایک عورت ہزار دیوانے'' 1960ء، ''تلاش بہاراں'' 1961ء، عصمت چغتائی کا ''معصومہ'' 1962، خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' 1963ء، احسان الحق کا ناول ''کالا شہر گورے لوگ 1965، علیم مسرور کا ''بہت دیر کردی'' 1972ء جیلانی بانو کا ناول ''ایوان غزل''، 1973، صالحہ عابد حسین کا ''گوری سوئے سیج پر'' 1977ء اور قرۃ العین حیدر کا ناول ''آخر شب کے ہمسفر'' 1979ء وغیرہ منتخب ناولوں کے ذریعہ عصری مسائل وموضوعات کو پیش کیا جارہا ہے۔

جاگیردارانہ طبقہ کے مسائل:

تقسیم ہند سے قبل برصغیر میں جاگیرداراور زمینداری، محدود سرمایہ دارانہ نظام کے پہلو بہ پہلو رائج تھی۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں جاگیرداری کا خاتمہ ہونے لگا اور یہ جاگیردارانہ طبقہ کئی مسائل سے دوچار ہونے لگا چنانچہ بعض ناول نگاروں نے اپنے ناول میں اس طبقہ کے زوال کی نوحہ گری کو بھی بیان کیا اس سلسلہ میں جیلانی بانو کا ناول ''ایوان غزل'' قابل ذکر ہے۔ اس ناول میں ایک اہم کردار واحد حسین جودکن کے پرانے جاگیردار ہیں اور ایوان غزل کے بانی ہیں جن کی ساری زندگی جمال پرستی اور شاعری میں گذری ہے۔ ناول میں ایک جگہ واحد حسین کی شخصیت کی تصویر کشی اس طرح کی گئی ہے کہ:

> عورت کے بغیر انھوں نے زندگی کی کسی خوبصورتی کو مکمل نہیں سمجھا تھا ''ایوان غزل'' کے باسی ہمیشہ کسی نہ کسی زلف گرہ گیر کے اسیر رہے تا کہ ان کی شاعرانہ حس بیدار رہے واحد حسین نے بھی اٹھتی جوانی کے ساتھ ہی ادھر ادھر، پھنکنا شروع کر دیا تھا۔ ہر روز وہ ایک نئے محبوب کی عشق میں گرفتار ہوتے ساری رات اُن کے آنسوؤں سے تکیہ بھیگ جاتا اور صبح ہوتے ہوتے ایک غزل تیار ملتی۔(۱)

حیدرآباد دکن یوں تو ہندوستان کی تحریک آزادی سے الگ رہا تھا اور کانگریس کی سیاسی و معاشی تحریک کی ہوائیں یہاں تک نہیں پہنچی تھیں پھر بھی یہاں کے جاگیرداروں میں مستقبل کے بارے میں عدم تحفظ اور تشویش کے آثار موجود تھے چنانچہ ناول ایوانِ غزل سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں جاگیرداروں کے مستقبل اور ان کے عدم تحفظ اور تشویش کے آثار دکھائی دیتے ہیں:

> سنا تھا کہ انگریز اپنا بستر بوریا سمیٹ رہے تھے ایسے وقت ریاستوں میں بڑی کھلبلی مچی ہوئی تھی لیکن اتحاد المسلمین حیدرآباد کے الحاق کے حق میں نہ تھی اور نظام کو اپنی گدی نیچے کھسکتی نظر آ رہی تھی۔ ادھر نہرو سوشلزم کے حامی تھے اس لئے کانگریس راج میں کہاں زمین داری جاگیرداری باقی رہ سکتی تھی؟ سب ہی سوچ رہے تھے۔ ماونٹ بیٹن دہلی میں تھا۔ اس کے باوجود اس نے واحد حسین راشد اور تمام ہندوستان کے نوابوں جاگیرداروں کا چین وسکون جناح اور نہرو کو بانٹنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔(2)

جاگیرداروں کے مختلف مسائل میں ایک اہم مسئلہ انگریز ریزیڈنٹ تھے جو جاگیرداروں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ یہ جاگیردار کبھی اپنی آمدنی وخرچ کے بارے میں اتنا غور وفکر نہیں کیے تھے لیکن جب ان

---

(۱) ایوان غزل، جیلانی بانو ص 68۔

(2) ایوان غزل، جیلانی بانو ص 149۔

پر انگریز ریزیڈنٹ کو مسلط کر دیا تو انہیں اپنی آمدنی وخرچ کا حساب دینا پڑا۔ ایک اقتباس دیکھئے۔

واحد حسین کی باتوں کے اختصار سے پریشان ہوکر دولھے نواب آگے بڑھ گئے تو واحد حسین کمرہ کے پیچھے ہاتھ باندھ کر ہری گھاس پر ننگے پاؤں ٹہلنے لگے۔ بھلا کبھی دولہا نواب کے باپ دادایوں آمدنی اور خرچ کے بارے میں غور کیا ہوگا۔ اس نئے انگریز ریزیڈنٹ نے تو ناکوں چنے چبوا دیئے۔ جاگیرداروں کی ساری جمع وخرچ کا حساب کتاب دیکھنے کی فکر ہر بات کی نگرانی ،خرچ کوئی کرتے فکر کسی کو۔ دولھے نواب کہتے تھے کہ ڈیوڑھیوں کی حرم سرائیں تک چھان ڈالی تھیں۔ ان اجاڑ صورت فرنگیوں نے۔(۱)

جاگیرداروں کا ایک اہم مسئلہ ریاستوں کے الحاق کا تھا اور ان جاگیرداروں کو اس بات کا خوف بھی تھا کہ اگر تمام ریاستیں الحاق ہوگئی تو ان سے تمام جاگیریں چھین لی جائیں گی۔ غرض ناول ایوان غزل سے ایک اقتباس دیکھئے۔ جس میں اس خوف کی عکاسی کی گئی ہے:

سوٹ بوٹ میں ملبوس حیدر علی خاں کو خسر کے سامنے بڑے ادب کے ساتھ سر جھکا کر بیٹھنا پڑتا تھا۔

جی ہاؤ۔ بجا ارشاد فرمایا۔ آپ لیکن دیکھیے تو ابا جان ایک یہی فائدہ ہوگیا تا کہ ہمارے دلوں سے ہر چیز کا خوف نکل گیا۔ غیر ملکی طاقت کا خوف نئے تجربوں کا خوف۔ نئے اقدامات کا خوف اظہار رائے کا خوف، یہ بھی بہت بڑی بات ہوئی ہے۔''اجی کیا با تاں کرتے۔ آپ دولھا بھائی۔ راشد بھی ایک کرسی کھینچ کر ان کے قریب آبیٹھا تھا۔ ویسے اسے پالیٹکس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن شمالی ہند میں جو طوفان

---

(۱) ایوان غزل۔ جیلانی بانو۔14۔

اٹھ رہے تھے ان کا تھوڑا بہت اثر یہاں بھی ہر سمجھدار اور تعلیم یافتہ
انسان پر ہوا تھا۔

اپن تو ایک بات بولتے ہیں دولھا بھائی کہ ریاستوں کا الحاق ہوا تو
اپنے ٹھاٹھ باٹ ہو جائیں گے۔ منصب جاگیریں سب چھن جائیں
گی۔ بڑے بڑے عہدے سب ہندوستانیاں جھپٹ لیں گے"۔(1)

جاگیردار کمیونسٹوں کو کبھی اپنا طرف دار نہیں سمجھتے تھے۔ کبھی کبھار کانگریس اور مسلم لیگ کو اپنے طرف دار سمجھتے تھے لیکن کمیونسٹوں کو تو یہ اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ انگریز تو چلے جائیں گے لیکن یہ کانگریسی اور مسلم لیگی جینے نہیں دیں گے:

ادھر یہ ہندوستانیاں انگریزوں کو نکالنے پر تلے بیٹھے ہیں۔
ہندوستان میں کتنے پل توڑ رہے ہیں۔ ریلوں کو آگ لگائی جا رہی
ہے۔ میرے کو تو یہ کچھ اچھے آثار نہیں لگتے۔

"ہوسنا ہے کہ بس کا پلان نہرو اور جناح نے واپس لوٹا دیا؟"

راشد جانے کہاں اندر کمرے میں بیٹھا تھا مگر اپنے ابا سے بات
کرنے باہر آبیٹھا"مگر ایک بات ہے ابا جان، اگر انگریز چلے گئے تو یہ
کانگریسی اور مسلم لیگی نہیں جینے دیں گے۔ دیکھ لیا نہرو تو وہی روس کی نقل
میں کمیونسٹوں کا راج لے آئیں گے، یہاں۔"

"ہو میاں کانگریس اور مسلم لیگی کبھی تو نہیں بولے کہ جاگیریں ختم
کرو۔ مگر یہ کمیونسٹاں تو اپنے دشمن ہیں۔(2)

جاگیرداروں کے نظر میں کمیونسٹ غنڈے تھے اور وہ ان کمیونسٹ کو کسی بھی طرح قبول نہیں کرتے

---

(1) ایوان غزل۔ جیلانی بانو ص 27,28

(2) اردو غزل۔ جیلانی بانو ص 148

تھے۔ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے کہ کس قدر جاگیرداروں کو کمیونسٹوں سے بیر تھا:

> واحد حسین کا بلڈ پریشر بھی بڑھ گیا تھا۔ان کے لیے یہ بات بڑی پریشان کن تھی کہ خود ان ہی کا داماد ایک جاگیردار گھر کا معزز پڑھا لکھا لڑکا ان غنڈوں میں اوران کی رہنمائی کر رہا تھا۔غصے کے مارے ان کی حیدر علی خان سے بات چیت بند تھی۔(۱)

تحریک آزادی اور حیدر آباد کے الحاق کا زمانہ جاگیرداری نظام کے لیے ہر طرح سے نا قابل قبول رہا ایک طرف یہ سیاسی پریشانیاں تھی تو دوسری طرف جاگیردار طبقہ معاشی بدحالی کا بھی شکار ہو رہا تھا۔جاگیردار گھرانہ کی عورتیں کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے لیکن ان پر معاشی پریشانیوں کا پہاڑ اس قدر ٹوٹ پڑا کہ ان کے گھرانوں کی عورتیں پیسے کمانے کی خاطر باہر نکل پڑتی ہیں جسے واحد حسین کی نواسی ''چاند'' جو ایک آرٹسٹ ہے''چاند'' خود بھی ایک جاگیردارانہ گھرانہ سے تعلق رکھتی ہے اس کے علاوہ واحد حسین اپنی معاشی بدحالی کو دور کرنے کے لیے اپنے لڑکے کی شادی ایک بڑے جاگیردارانہ گھرانے میں کرواتے ہیں جو جہیز میں انہیں بہت ساری دولت ملتی ہے اور یہی دولت کو استعمال کر کے واحد حسین کا بیٹا راشد ایک جاگیردار سے بزنس مین بن جاتا ہے۔چنانچہ جیلانی بانو نے ناول ''ایوانِ غزل'' میں جاگیرداروں کی اس معاشی بدحالی کا خاکہ نہایت ہی تفصیل سے کھینچا ہے:

> چاند صرف نام کی آرٹسٹ نہیں تھی، بلکہ اس کے آرٹ کا دائرہ واقعی بہت وسیع تھا۔میڈیکل کالج سے آکر وہ شام کو حیدر آباد کے مشہور مصور راشد کے پاس پینٹنگ سیکھنے جاتی تھی۔اس طرح اس کا آرٹ اداکاری موسیقی پینٹنگ اور ڈاکٹری کا سنگم بن گیا تھا۔لوگ بے چینی سے منتظر تھے کہ کب وہ ڈاکٹر بن کر لوگوں کے دیکھتے ہوئے بدن پر مرہم رکھا

---

(۱)اردو غزل۔جیلانی بانو ص 142

کرے گی۔جانے کتنے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے فن کاروں کی اس نے اپنی سفارش سے قسمت جگا دی تھی۔کالج کے تمام ہونہار طالب علموں کی ذات کا محور چاندی کی ذات تھی۔جیسے سب پیار سے ڈاکٹر چاندنی کہتے تھے۔یہ سب اس وقت کی باتیں ہیں جب واحد حسین قرض کی آندھی میں گھر کے چکرا رہے تھے۔راشد روپیہ کمانے کے لیے نئے نئے ذریعہ ڈھونڈ رہا تھا کیونکہ احمد حسین نے ایک حرامی لڑکے کا اپنا متبنی بنا کر انھیں انگوٹھا رکھا دیا تھا۔ادھر جائیداد قرض میں ڈوبتی جارہی تھی اور صرف راشد کی ہزار ڈیڑھ ہزار کی آمدنی پر''ایوانِ غزل''وقار ڈگمگانے لگا تھا۔ اس مصیبت سے چھٹکارہ پانے کے لیے انھوں نے راشد کو ایک چیک کسی طرح کیش کررہا تھا اور رضیہ اپنے ساتھ بے شمار دولت لے کر آئی تھی۔واحد حسین کا بس چلتا تو وہ اس روپیہ کو بریانی اور بگھارے بیگن کی تجارت پر لگا دیتے مگر راشد نے اپنے ابا کی طرح تحصیلداری میں عقل نہیں گنوائی تھی۔اس لئے اس نے ملازمت کے ساتھ ساتھ کافی دواؤں اور بیڑی کی تجارت بھی شروع کردی تھی کیونکہ یہ وزمانہ تھا جب ملکی مصنوعات کو فروغ دیا جارہا تھا۔تاجروں کو حکومت بڑی بری مالی مدد دیتی تھی۔دیکھتے ہی دیکھتے چاندی کے سامان سگریٹ اور بیڑی نے پورے ہندوستان میں عالم گیر شہرت حاصل کرلی تھی۔حیدرآباد بہت چھوٹا سا علاقہ تھا۔مگر یہاں کی مصنوعات کی قدر ہندوستان سے باہر بھی تھی۔اس بہتی گنگا میں راشد بھی ہاتھ دھونا چاہتا تھا۔(۱)

---

(۱)اردو غزل۔جیلانی بانو ص111,112

تحریک آزادی:

تحریک آزادی اردو ناولوں میں ایک اہم موضوع کے طور پر ابھر کر آئی چنانچہ اس دور کے بیشتر ناولوں میں تحریک آزادی ایک اہم موضوع بن گئی بعض ناول نگاروں نے تو اسی تحریک کو اپنے ناول میں مرکزی خیال کے طور پر پیش کیا ہے۔اس سلسلہ میں ''تلاش بہاراں''''ایوان غزل''،''آنگن''،''آخر شب کے ہمسفر''وغیرہ قابل ذکر ناول ہیں۔

انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکمت کی تعمیر غلامی ذات پات اور فرقہ وارانہ کشمکش کی بنیادوں پر کھڑی کی تھی کیونکہ انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ ہندوستان ایک دولت مند تجارتی ملک ہے چنانچہ انہوں نے بڑی چابک دستی کے ساتھ ہندوستان میں اپنے قدم جمائے۔غرض قرۃ العین حیدر اپنے ناول آخر شب کے ہمسفر میں ایک جگہ اس ناول کے ایک کردار کی زبانی ان انگریزوں کی دور اندیشی کو اس طرح بیان کیا ہے:

> رحان آپ کو اپنے راستے کے بارے میں مطلق کوئی شب کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے؟ دیپالی نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔نہیں جب اپنے اصل دشمن اور اس کے ایجنٹوں کو ہم پہنچا چکے ہیں تو پھر الجھن کیا ہوسکتی ہے؟ وہ آگے جھک کر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا ''سنو دیپالی ۔یہ یاد رکھو کہ برطانوی سرمایہ داری ہندوستان کے قحط، غلامی، قرضے، ذات بندی اور فرقہ وارانہ کشمکش کی بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے۔تمہیں معلوم ہے یہی کھلنا اور نوا کھالی، جواب ڈاکوؤں اور مفلس ماہی گیروں کا دیس ہے۔مغلوں اور نوابوں کے عہد میں کتنے دولتمند تجارتی علاقے تھے؟ یوروپ میں جو 200 برس تک سب سے زیادہ

خونریز لڑائیاں لڑی گئیں وہ ہندوستان کی تجارت پر قبضہ کرنے کے لیے
لڑی گئی تھیں ۔(۱)

انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی ایک مستحکم حیثیت بنالی اور رفتہ رفتہ ہندوستان میں اینگلو انڈین ، کے نام سے ایک نیا معاشرہ تشکیل دے دیا اور یہ انگریز اپنے ہم وطنی ملازمت کرنے والوں کو ''انڈین سویلین'' کہا کرتے تھے وہیں ایک ہندوستانی ملازم کوکوئی حیثیت نہیں تھی ۔قرض عہدِ غلامی کے ان حالات کوقرۃالعین حیدراس طرح بیان کیا ہے:

یہ مضبوط اور مستحکم اینگلو انڈین معاشرہ یہ کسی لفٹ ونگ ہندوستانی انٹلکچوئیل نے سچ کہا ہے کہ انگریز ہندوستان ان کو کنٹری اسکوائر یازمیندار کی نظر سے دیکھتا ہے ۔ ہندوستانی صوبے گویا ان انگریز حاکموں کی ذاتی زمینداریاں تھیں ۔جس میں ہم پلہ لوگ یا انسان دوسرے یوروپین تھے ۔اہلِ برطانیہ ہندوستان میں ملازمت کرنے والے اپنے ہم وطنوں کو''انڈین''انڈین سویلین ۔یا انڈین آفیسر کہتے تھے ۔ہندوستانی محض نیٹو تھا ۔اوراس قابل نہ تھا کہ اس کا تذکرہ کسی مہذب سیاق وسباق میں کیا جائے ۔(2)

ہندوستان میں انگریزوں نے رفتہ رفتہ اتنا مقام حاصل کرلیا کہ ہر ہندوستانی ان پر اعتبار کرتا۔ یہاں تک کہ عدالت میں ایک ہندوستانی اپنے ہم وطن جج کے فیصلے کے مقابلے میں انگریز جج کے فیصلے کوترجیح دیتا تھا۔اس حقیقت کوقرۃالعین حیدر نے اس طرح پیش کیا ہے لکھتی ہیں:

''اور گو یہ حقیقت تھی کہ اہل ہندو برٹش راج کی برکتوں کے معترف تھے اور ایک عام ہندوستانی عدالت میں ایک ہندوستانی جج کے فیصلے

---

(۱) آخرِ شب کے ہمسفر ۔قرۃالعین حیدر۔ص 114۔
(2) آخرِ شب کے ہمسفر ۔قرۃالعین حیدر۔ص:305

کے مقابلے میں انگریز جج کے فیصلے کو ترجیح دیتا تھا۔مگر یہ بھی واقعہ تھا کہ
غدر کے بعد ہنری لارنس نے کہا تھا کہ ہندوستانی اپنے دیوانے
بادشاہوں کے زیرِ نگین خوش نہیں۔(۱)

غرض رفتہ رفتہ ہندوستانیوں پر انگریزوں کا ظلم وستم بڑھتا گیا اور جب یہ ہندوستانی اپنی آزادی کے لیے تحریک آزادی شروع کردی تو انہیں جانی و مالی بہت نقصان ہوا چنانچہ اس دور کے نمائندہ ناول نگاروں نے تحریک آزادی کے حالات کو بھی اپنے ناولوں میں مؤثر انداز میں پیش کیا ہے تحریک آزادی کے زمانے میں عام زندگی میں انتشار اور بے چینی اتنی بڑھ گئی تھی کہ زندگی ایک تحریک کی مانند ہوگئی تھی۔ لہٰذا ایک عام زندگی میں پھیلے اس انتشار کو جمیلہ ہاشمی نے اپنے ناول ''تلاش بہاراں'' میں اس طرح پیش کیا ہے:

''ہماری زندگی کا مجموعی انتشار اور بے چینی سیاستوں کی تحریکیں
ملک کی آزادی کی تحریکیں ہندو مسلم فساد کی تحریکیں۔ہمارا ملک ایک مجسم
تحریک بن کر رہ گیا تھا۔ایک ایسا اضطراب تھا جو کنول کماری ٹھاکر کے
گرد چکر لگاتا تھا مگر کنول کو چھین نہیں پاتا تھا۔کیا وہ اس ساری زندگی کا
محور تھی جو قائم ہے حرکت نہیں کرتا اور اپنی جگہ پر مستقل ہے۔(2)

تحریک آزادی کے زمانے میں زندگی میں کوئی لطف نہیں تھا،بس لوگ زندہ رہنے کے لیے جیے جا رہے تھے۔ان کی زندگی میں کوئی خوشی یا تکمیل آرزو کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ایسی زندگی کا خاکہ کھینچتے ہوئے جمیلہ ہاشمی نے لکھا ہے:

''صدیوں سے ملک میں اکٹھے رہتے رہتے نئی نئی جماعتیں معرض

---

(۱) آخر شب کے ہمسفر۔قرۃ العین حیدر۔ص:206

(2) تلاش بہاراں۔از:جمیلہ ہاشمی۔ص:142

وجود میں آ رہی تھیں غیر ملکی شعور سکھا رہتے تھے۔کانگریس اور نئی نئی جماعتوں کے زیر قیادت ملک کو آزادی اور غارت گری کا سبق پڑھا چکے تھے عام زندگی کے بہاؤ میں وہ روانی تو نہ تھی پھر بھی اس کیچڑ میں سب کو کلبلانا پڑتا تھا۔اگر بڑے سمندر پر زندہ رہنے کے لیے ایک انسان ہاتھ پاؤں مارتا ہے کہ کہیں وہ ڈوب نہ جائے تو لجلجے پڑتے ہوئے مادے میں زندہ رہنے کے لیے بھی کلبلانا پڑتا ہے۔یہ اُصول ہے یہی زندگی ہے وجود کے اندھیرے غاروں میں عام گیتوں کی صدائے بازگشت گونجتی ہے۔(۱)

تحریک آزادی میں قومی لیڈروں نے اپنا سب کچھ لُٹا دیا تھا۔ بڑے بڑے رئیس گھرانوں کو بھی غریبی اور مفلسی نے گھیرے رکھا تھا۔کیونکہ ان رئیس گھرانوں کے لوگ اپنی آزادی کے لیے سر بلند ہو کر آواز اُٹھاتے جس پر انہیں انگریزوں کے ظلم و ستم کا سامنا کرنا پڑتا اور کبھی کبھار جیل وغیرہ بھی ہوتی جس کی وجہ سے ان کے گھر والوں کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا تھا چنانچہ قرۃ العین حیدر نے ان حالات کو بہت مؤثر انداز میں بیان کیا ہے لکھتی ہیں:

''تھوڑے سے رشتہ دار ہیں، وہ غفار گاؤں میں چھوٹی موٹی سرکاری ملازمتیں کرتے ہیں، بابا کے ایک چچازاد بھائی ہیں۔وہ بھی ڈاکٹر ہیں۔ چند سال ہوئے وہ بڑی نیڈاڈ ہجرت کر گئے، وہاں ہزاروں کما رہے ہیں۔بس کوئی نہیں۔ٹھاکر ماں کا پچھلے سال انتقال ہو گیا۔میر یماں کا میکہ سراج گنج میں ہے وہ بھی ملازمت پیشہ لوگ ہیں۔اور کیا بتاؤں۔ ہاں......! یہ ''چندر گنج'' ہماری کوئی کنبے کی خوشحالی کے زمانے میں ٹھاکر دانے بنوائی تھی۔ٹھاکر دا کی زندگی ہی میں بابا اور کا کا قومی تحریک میں

---

(۱)تلاش بہاراں۔جمیلہ ہاشمی۔ص:439,440

شامل ہوکر جیل یاترا کے لیے چلے گئے تھے۔اس زمانے میں ہمارے یہاں ایسی غربت چھائی کہ بعض دفعہ رات کو مٹی کا تیل خریدنے کے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے۔صرف اسی اُمید نے ہم سب کو زندہ رکھا کہ انگریز سے چھٹکارا ملنے کے بعد دیس کے ان سارے اندھیرے گھروں میں اُجالا ہو جائے گا۔

ایسا ضرور ہوگا۔دیپالی ''ایسا ضرور ہوگا''۔اومارائے نے آہستہ سے کہا۔

''تم مایوسی کا شکار کبھی نہ ہونا''۔

''میں مایوس بالکل نہیں ہوں اُومادی''۔ دیپالی نے دفعۃً ہنس کر کہا''۔(۱)

اسی طرح ناول ''آنگن'' میں بھی تحریک آزادی سے وابستہ لوگوں کی حالت زندگی کو اور ان کے مختلف مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔جیسے ناول آنگن کے اہم کردار بڑے چچا جو کہ ایک کانگریس کے بڑے کارکن ہیں اور قوم کے بےلوث خادم بھی ان کی سیاسی وابستگی اور خاکساری کی تصویر کشی مصنفہ نے ان الفاظ میں کی ہے:

''تھوڑے دنوں میں عالیہ کو گھر کے سارے حالات معلوم ہو گئے ۔ بڑے چچا نے جاگیر بیچنے کے بعد کپڑے کی دو بڑی بڑی دکانیں کھول لی تھیں جن کی نگرانی کسی زمانے میں وہ خود کرتے تھے، انہوں نے یہ خوبصورت سا گھر بڑے چاؤ سے بنوایا تھا۔گھر میں مثالی خوشحالی تھی مگر جب وہ بڑی سرگرمی سے سیاست میں حصہ لینے لگے تو دکانیں اسرار میاں کی نگرانی میں شتم پشتم چلنے لگیں، وہ بھی ان کی آمدنی چندوں اور

---

(۱) آخرِ شب کے ہم سفر۔قرۃ العین حیدر۔ص:40-41

سیاسی ورکروں پر خرچ ہو جاتی۔ بڑے چچا کئی بار جیل جا چکے تھے۔ انہیں قید تنہائی اور بیڑیاں پہننے کی سزا بھی مل چکی تھی ان کے پیروں میں موٹے موٹے سیاہ گٹھے پڑے ہوئے تھے پاؤں دھوتے ہوئے وہ ان سیاہ گٹھوں کو بڑے فخر اور پیار سے دیکھا کرتے وہ اس قدر کٹر کانگریسی تھے کہ خالص مسلمانوں کی کسی بھی جماعت کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ انہیں تو ان کے مسلمان ہونے پر بھی شبہ رہتا۔ کانگریس کے سوا ہر جماعت کے لوگ ان کی نظر میں ملک کے غدار تھے"۔ (ا)

تحریک آزادی اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کی جھلک جیلانی بانو کے ناول "ایوان غزل" میں بھی موجود ہے مصنفہ نے تحریک آزادی کو حیدرآباد کے مقامی حالات کے پس منظر میں پیش کیا ہے، جہاں اس تحریک کے اثر موجود تو تھے لیکن اسی کی وہ حیثیت نہ تھی جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں خصوصاً شمالی ہند کے صوبوں میں تھی۔ ریاست حیدرآباد میں نظام سرکار کی گرفت زیادہ مضبوط تھی۔ جس کی سبب تحریک آزادی کی لہر زیادہ زور نہ پکڑ سکی تھی۔ اس کے علاوہ ریاست حیدرآباد میں آزادی کا وہ تصور بھی نہ تھا جو سارے ملک میں تھا لیکن پھر بھی۔ یہاں کی مختلف سیاسی جماعتوں کی وجہ سے عام زندگی میں ایک انتشار سا پھیلا ہوا تھا۔ اور اس انتشار کے ماحول میں یہاں کی عام زندگی کئی مسائل سے دوچار ہو رہی تھی غرض ایوان غزل سے ایک اقتباس دیکھئے:

"ابھی حیدرآباد میں قوم پرستی کی کوئی لہر ابھری نہیں تھی اتحاد المسلمین کا کوئی پتہ نہ تھا، لیکن بہادر یار جنگ کی سیاسی اہمیت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ حیدرآباد کے وفاق کے سخت مخالف تھے اور حیدرآباد کو ایک خودمختار حکومت دیکھنا چاہتے تھے۔

(ا)۔ آنگن۔ خدیجہ مستور۔ ص:95

اس کے برعکس حیدر علی خاں جیسے با شعور لوگوں کا بھی حلقہ تھا جو یوروپ کی سیاسی تحریک کا مطالعہ کر چکا تھا پنڈت نہرو کی بنائی ہوئی کانگریس کی پالیسی کو پسند کرتا تھا، یہ لوگ فاشزم کے خطرے کو سروں پر منڈلاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ یوں تو ہندوستان میں ہٹلر اور میسولینی کے خلاف عوام متحد تھے، مگر ابھی حیدرآباد کے عوام دنیا کی سیاست سے بہت کم واقف تھا.........لیکن شمالی ہند میں جو طوفان اٹھ رہے تھے ان کا تھوڑا بہت اثر یہاں کے ہر سمجھدار تعلیم یافتہ انسان پر ہوا تھا''۔

[1]

تحریک آزادی کا زمانہ بڑا ہی تکلیف زدہ تھا اس تحریک سے جڑے ہوئے لوگوں کی زندگی میں کئی ایک مسائل تھے۔ لیکن ان مسائل کی پروا کیے بغیر یہ لوگ اپنی آزادی کے لیے جدو جہد کر رہے تھے صرف اس اُمید پر کہ ایک دن ہمارا ملک آزاد ہو جائے گا اور ہمارے زندگی کے تمام مسائل اور تکالیف دور ہو جائیں گی۔ چنانچہ ناول آنگن میں بڑے چچا کا بھی یہ معاملہ تھا گھر کی انہیں کچھ فکر نہیں رہتی تھی بس گھر میں وہ جتنی دیر رہتے سیاسی گفتگو میں گذارتے اور جب ان کو گھر کی خستہ حالی کے بارے میں کہا جاتا تو یہ گھر والوں سے کہتے کہ ایک دن ملک آزاد ہو جائے گا اور ہماری تمام مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔ غرض ایک اقتباس دیکھیے:

''بڑے چچا جب تک گھر میں رہتے بڑی چچی اور کریمن بوا مہمانوں کے کھانے کے انتظام میں سارا دن گذار دیتیں۔ بڑے سے پتیلے میں بڑا گوشت سرسوں کے تیل میں پکایا جاتا، ہندوؤں کے لیے دکان سے پوری ترکاری خریدی جاتی۔ کریمن بوا ڈھیروں روٹیاں پکاتے ہوئے بڑ

---

[1] ایوان غزل، جیلانی بانو۔ ص:27۔25

> بڑاتی رہتیں، خالص گھی کی خوشبو یاد کر کر کے ان کی آنکھوں میں آنسو آتے رہتے پھر بھی یہ گھر چل رہا تھا۔ سب کو پیٹ بھر روٹی ضرور مل جاتی۔ بڑے چچا سے جب گھر کی ضرورتوں کا ذکر کیا جاتا تو وہ سرخ پڑ جاتے، جانے کیوں جھینپ جھینپ کر سب کی طرف دیکھتے، اپنے بڑھے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور پھر بڑی امنگ سے سب کو سمجھانا چاہتے۔ جب ملک آزاد ہو جائے گا تو سب تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔ تم لوگ ذرا گہرائی میں جا کر سوچو"۔ (۱)

اس طرح آگے ایک جگہ تحریک آزادی کے زمانے میں عوام کی خستہ حالی کو یوں پیش کیا گیا ہے:

> "گھر کی حالت بڑی خراب ہوگئی تھی، جمیل بھیّا نے ملازمت کی کوشش ہی نہ کی سارا دن مسلم لیگ کے دفتر میں کام کرتے اور تھوڑا سا معاوضہ دے کر وہ سارے مہینے کے لیے بے خبر ہو جاتے اور سارا مہینہ بڑی چچی سے انتقام لے لے کر گذر جاتا۔
>
> ان دنوں بڑے چچا کے پیروں میں فریکچر ہو گیا تھا۔ آج یہاں کل وہاں انگلستان کی لیبر وزارت نے ہندوستان کو آزاد کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اماں نے یہ خبر اس طرح سنی تھی جیسے چنڈو خانے سے اڑائی گئی ہو"۔ (۲)

جدو جہد آزادی کے دوران آزادی کے مجاہد اپنی تو کیا اپنے گھر والوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے ہر دم انگریزوں کے خلاف کچھ نہ کچھ اقدام اٹھاتے جس کی وجہ سے انہیں جیل ہو جاتی اور اس طرح سے ان مجاہدوں کے گھر والوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے یا یوں کہیں کہ ایک طرح سے ان کی زندگی

---

(۱) ۔آنگن۔خدیجہ مستور۔ص:96

(۲) ۔آنگن۔خدیجہ مستور۔ص:291

تباہ و برباد ہو جاتی چنانچہ ناول آنگن سے ایک اقتباس دیکھئے جس میں عالیہ اور جمیل کی آپسی گفتگو کے ذریعہ آزادی کے ان مجاہدوں کی زندگی کی تباہ کاریوں کا ذکر کیا گیا ہے:

> ''اچھا تم ہی بتاؤ عالیہ بیگم کہ ہمارے ابا یہاں جس دنیا کو بنانے کی فکر میں ہیں کیا ہم اس کے باشندے نہیں ہیں۔ آخر ہمیں کیوں تباہ کیا جائے؟ اور مظہر چچا جو ایک انگریز کا سر پھاڑ کر جیل چلے گئے تو انہوں نے کون سا کارنامہ انجام دیا؟ کیا انہوں نے تم سب کو تباہ نہیں کیا؟ اب تم کو اس گھر میں کتنی تکلیف ہوگی تم لوگوں نے کتنے ٹھاٹ کی زندگی گذاری تھی، ابھی تو میں بھی کسی لائق نہیں ورنہ............''۔[1]

غرض ان آزادی کے مجاہدوں کی زندگی اسی طرح کی تباہیوں میں گذری ان کے ساتھ ساتھ ان کے گھر والے بھی اس مصیبت میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ جیسے ناول آنگن میں عالیہ اور اس کے چچا کے گھر کی حالات کے ذریعہ مجاہدوں اور ان کے گھر والوں پر ٹوٹنے والی مصیبتوں کا ذکر کیا ہے کہ عالیہ کے والد کو انگریز کا سر پھوڑنے پر سات سال کی قید ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے عالیہ اور اس کی ماں پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں:

> ''اماں بی کے کمرے کے دروازے بند کر دو، کہیں وہ رونی آواز سن لیں''۔ بڑے چچا نے عالیہ کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر اماں سے مخاطب ہو گئے ''مظہر کی دُلہن، صبر سے کام لو یہ سات سال بھی گذر جائیں گے اور یہ بھی ہوسکتا ہے مظہر ایک سال بھی جیل میں نہ رہے کیا پتہ ہم آزاد ہو جائیں۔
>
> ''سب بے کار باتیں ہیں بڑے بھیا۔ انہوں نے بھرا گھر اُجاڑ دیا۔ اب سات سال کون گذارے گا۔ ہائے سات سال نہیں گذرتے''۔

---

[1] ۔ آنگن ۔ خدیجہ مستور ۔ ص:109

اماں بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

''ارے حاکموں نے نہیں دیکھا اس گھر کا زمانہ، انہیں پتہ نہیں یہ کس کا بیٹا ہے اپنے مالک مرحوم تو لوگوں کو پھانسی کے تختے سے اُتر ڈالتے تھے۔ حاکم ان کی ڈالیوں پر جیتے تھے پر اب زمانہ بگڑ گیا''۔ گذرا زمانہ یاد کر کے کریمن بوا کا منہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ روتی ہوئی اماں کو پٹائے کمرے میں لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''ہم اُجڑ گئے، تباہ ہو گئے، انہیں مجھ سے کون سی دشمنی تھی جو یہ سب کر دیا''۔

اماں بے قابو ہو کر اپنے کو چھڑا رہی تھیں''۔ [1]

عالیہ اپنے والد کے جیل جانے کے بعد وہ اپنی ماں کے ہمراہ اپنے بڑے چچا کے پاس رہنے لگتی۔ لیکن عالیہ کے بڑے چچا بھی آزادی کے مجاہد ہیں۔ اور ایک دن انہیں بھی جیل ہو جاتی ہے۔ اور پھر سے عالیہ اور اس کی ماں کے ساتھ ساتھ اس کے بڑے چچا کے گھر والے بھی پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اقتباس دیکھئے:

''صدر دروازے کی زنجیر بڑے زور سے کھڑکی تو وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ ''ٹھہر جاؤ تم مت جاؤ میں دیکھ لوں گا''۔ بڑے چچا باہر جا کر فوراً ہی پلٹ آئے بری چچی برآمدے میں تخت پر بیٹھی ڈلیا سامنے رکھے پالک کے پتے چُن رہی تھیں۔ بڑے چچا ان کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے ''میرا بلاوا آ گیا ہے'' ان کی پیشانی پر ہلکی سی فکر تھی۔

''کہاں کا؟''

''انگریز بہادر کا، چار چھ مہینے بعد واپس آ جاؤں گا، تم میرا سامان

---

[1] ۔ آنگن ۔ خدیجہ مستور ۔ ص:114

ٹھیک کروں' عالیہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ بڑی چچی ڈلیا پھینک کر ایک دم اُٹھ پڑیں کریمن بوا میلے برتنوں کے ڈھیر سے اُبھریں اور ٹکر ٹکر سب کا منہ تکنے لگیں۔

بڑی چچی کمرے میں جا کر بڑے چچا کے کپڑے بکس میں ٹھونسنے لگیں "بھلا ان حرام زادوں کا کیا بگاڑا ہے کسی نے جو روز روز پکڑتے ہیں، کیا کرلیں گے پکڑ کر بھلا کسی کی زبان بھی بند کی ہے کسی نے" بڑی چچی اماں کی طرف دیکھ کر کہہ رہی تھیں اور اماں اس نئی مصیبت پر چچا کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے سخت حقارت سے دیکھ رہی تھیں۔" بڑے بھیّا اب تو توبہ کرلو۔ اپنا گھر اپنے بچے سنبھالو۔ سب تباہ ہوگیا"۔ اماں نے نصیحت کی مگر بڑے چچا کچھ نہ بولے۔ برآمدے کے کونے میں کھڑی ہوئی چھڑی اُٹھا کر ایک ہاتھ میں سوٹ کیس تھام لیا۔" کیا ساری زندگی اسی لیے مصیبت جھیلی ہے میں نے، کہ یہ توبہ کرلیں، جو کیا بڑا کام کرتے ہیں"۔ بڑی چچی غصّے اور غم سے رو پڑیں"۔ [1]

تحریک آزادی کے زمانے میں جہاں ایک طرف سماج میں معاشی بد حالی پھیل رہی تھی دوسری طرف سماج میں کچھ ایسے خیالات کے لوگ بھی تھے جو فرقہ پرستی کو بڑھاوا دے رہے تھے جیسے ناول آنگن میں ایک ہی خاندان میں کانگریس اور مسلم لیگ دو خیال کے لوگ تھے۔ کچھ مسلم لیگ کے طرفدار ہندو فرقے کے متعلق منفی نظریہ رکھتے تھے۔ جس کو اس ناول میں چھمی جمیل اور عالیہ کی ماں کے کردار کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ جیسے عالیہ کی ماں کسم دیدی کے گھر والوں سے نفرت کرتی ہے۔ کیونکہ کسم دیدی کے والد انگریزی راج کے خلاف تھے۔ چنانچہ کسم دیدی کے گھر والوں کے بارے میں عالیہ کی ماں کے خیالات دیکھئے:

---

[1] ۔آنگن۔خدیجہ مستور۔ص:126

''امّاں ہر وقت غصّے میں بھری رہتیں'' یہ سب بے کار لوگ ہیں
انہیں دنیا کا کوئی کام نہیں ہے، یہی دن رات گاتی ہے اور باپ سیاست
بگھارتا ہے.........''نفرت کی سے بڑی وجہ تو یہی تھی کہ ان کے پتا جی
انگریزی راج کے خلاف تھے اس پر ظلم یہ کہ وہ ہندو تھے اور ان کی بیوہ
بیٹی گاتی بجاتی رہتی تھی''۔ ۱؎

اسی طرح عالیہ کی والدہ بھی ہندو فرقے کے سلسلے میں تعصب جیسے خیالات رکھتی ہیں چھمی اور جمیل کے پاس بھی تعصب کا رجحان صاف نظر آتا ہے چھمی اپنے بڑے چچا کو کافر کہا کرتی تھیں کیونکہ وہ کانگریس پارٹی کے کارکن تھے اور ان کے دوست احباب میں ہندو بھی تھے۔ بڑے چچا ہرن اپنے سیاسی دوستوں کے ساتھ اپنے گھر میں سیاسی مسائل پر بات چیت کرتے چھمی بھی اپنے چچا کو نیچا دکھانے کے لیے اپنے ہی گھر میں مسلم لیگ کے جلسے کیا کرتی تھیں گھر کے لوگ جب سے ڈراتے کہ بڑے چچا ناراض ہوں گے تو وہ فوراً اس طرح کا جواب دے دیتی کہ:

''وہ کون ہوتے ہیں ناراض ہونے والے میں کیا انھیں منع کرتی
ہوں کہ کافروں کے جلسوں میں نہ جایا کریں۔ بس میں مسلمان ہوں
اس لئے مسلم لیگی ہوں۔ وبڑے فخر سے ہنسی...... چھمی اتنے سے روپے
آئے ہیں اور تم کو پورا مہینہ گذارنا ہے، کیوں خواہ مخواہ یہ حرکتیں کرتی ہو۔
عالیہ واہ پیسے روپے کی کیا بات ہے، میں تو اپنی جان تک نچھاور کروں
مسلم لیگ پر پھر ہمارے کافر چچا کو پتہ چلے۔(۲)

تحریک آزادی کے زمانے میں ہر مذہب ہر فرقہ اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہا تھا لیکن کچھ لوگ انگریزوں کی حمایت میں بھی تھے جیسے بنگالی، عیسائیوں کا کہنا تھا کہ انگریز ہی وہ قوم ہے جس کی وجہ

۱؎ ۔آنگن ۔خدیجہ مستور ۔ص:28
(۲) آنگن ،خدیجہ مستور ،ص 104

سے ہندوستان ترقی کر رہا ہے اور یہی قوم کی وجہ سے یہاں کے باشندے جنگلی سے انسان بنے ہیں۔ چنانچہ ان کا یہاں رہنا ہندوستان کے باشندوں کے لیے مفید ہے۔ خاص طور پر یہاں کے عیسائیوں کے حق میں تو بہتر ہوگا کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ ہندوستان میں عیسائیوں کو انگریز آنے کے بعد ہی انصاف ملا ہے۔ اگر یہ چلے گئے تو پھر سے ان کے ساتھ بربریت بے ایمانی اور بے انصافی ہوگی۔ غرض عیسائیوں کے اس خیال کو قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول ''آخر شب کے ہمسفر'' میں پیش کیا ہے جب ریونڈ بنرجی کی بیٹی روزی تحریک آزادی سے جڑ جاتی ہے تو ریونڈ بنرجی روزی سے کہتے ہیں کہ تم ان غداروں سے جاملی ہو جو ہمارے کرم فرماؤں کو اس ملک سے نکالنا چاہتے ہیں پھر اس سے کہتے ہیں کہ یہ ہندوستانی ہمیشہ ظالم رہے ہیں۔ چاہے وہ مسلمان ہوں یا ہندو غرض روزی اور اس کے باپ ریونڈ بنرجی کی گفتگو دیکھیے جس کے تحریک آزادی کے تعلق سے عیسائیوں کے خیالات کا پتہ چلتاہ ہے۔

اچانک ریونڈ بنرجی کو ایک خیال آیا۔ یونیورسٹی تو اس بد بخت بغاوت کی وجہ سے بند ہو چکی ہے۔ یہ پھر مجھے دقیانوسی احمق بڈھا سمجھ کر بے وقوف نہیں بنا رہی؟

روزی ادھر آؤ۔ انھوں نے کڑک کر کہا۔

وہ ٹھٹھک گئی

بیٹھ جاؤ۔ انہوں نے حکم دیا

وہ اطمینان سے واپس آ اکر کرسی پر بیٹھ گئی

تم پھر ان......ان غداروں سے جاملی ہو؟

اس نے نفی میں سر ہلا دیا

روزی۔ ریورنڈ بنرجی نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر ٹوٹی ہوئی آواز میں ایک بار پھر کہنا شروع کیا۔ جس سرکار نے ہمیں جنگلی سے

انسان بنایا۔ بت پرستی کے جہنمی راستے نکال کر......"

"وہ تو پاپا......ٹوٹ اگیں......" روزی نے یک لخت جھنجھلا کر میز پر مکہ مارا پانی کا گلاس چھلک گیا۔ ایلیتھر بنر جی نے جھاڑن اٹھا کر پھرتی سے میز صاف کرتے ہوئے اسے ڈانٹا۔ "روزی" "سوری ماما" پھر وہ اپنے پاپا کی طرف مڑی۔ پاپا سنئے سی ایف اینڈ ریوز تو نہ صرف پکے عیسائی تھے بلکہ اصل نسل انگریز بھی تھے۔ اور آپ سے کہیں زیادہ بڑے پادری۔ آپ نے جا کر کبھی ان کو یہ سب کیوں نہ سمجھایا؟ اس نے نہایت ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہا

"کوئٹ انڈیا کوٹ انڈیا" پادری بنر جی طیش کے عالم میں کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ احمقوں۔ گدھو۔ انگریز چلا گیا تو ہم پھر اسی بربریت، بے ایمانی اور بے انصافی کے دور کی طرف لوٹ جائیں گے۔ جس سے انھوں نے ہمیں نجات دی۔ روزی نے دوبارہ ذرا پریشانی سے گھڑی پر نظر ڈالی پادری بنر جی اب ایک کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھ کر نہایت برافروختہ آواز میں اس سے مخاطب تھے۔ کوئٹ انڈیا کی بچی، ہندوؤں اور مسلمانوں کی جھوٹی ڈینگیں پڑھ پڑھ کر پاگل ہو گئی ہے۔ ہندوستان کی سنہری قدیم تہذیب، سنہری قدیم تہذیب یہ تھی کہ منتیں پوری کرنے کے لے ہندو اپنے بچوں کو گھڑیالوں کے سامنے پھینک دیتے تھے۔ ہندو لڑکیوں کو مار ڈالا جاتا تھا۔ مسلمان ٹھگ مسافروں کا گلا گھونٹتے تھے۔ انڈین کلچر انڈین کلچر! کتنے انگریز مشنریوں نے زندہ عورتوں کو چتا سے نکالا اور جب وہ ان بدنصیبوں کو بچانے کی کوشش کرتے، عین وہیں شمشان گھاٹ پر فساد ہو جاتا تھا۔ خود میری پردادی کو...... جانتی ہے احمق؟ میری اپنی پادری کو ستی ہونا پڑا۔

ہندو کلچر......ہندو کلچر......

روزی کو باپ کا اس قدر شدید غصہ دیکھ کر بے اختیار ہنسی آگئی۔اس نے آہستہ سے کہا "مگر پاپا۔آپ کے مذہب تچی یورپ میں بھی تو ہزاروں بے گناہ عورتوں کو جادوگرہ کے الزام میں صدیوں تک زندہ جلایا جاتا رہا اور جس زمانے میں ہندوستان میں ہندو مسلمان مزے سے اکھٹے رہ رہے تھے اس وقت آپ کے چہیتے یورپ میں Inqurtion ہو رہا تھا۔ہاہاہا۔(۱)

تقسیم ہند:

1947 کو غیر ملکی قوم سے ہندوستانیوں کو آزادی تو ملی لیکن اس آزادی کے ساتھ ساتھ تقسیم کی آندھی بھی آئی، تقسیم ہند کا واقعہ 20 ویں صدی میں برصغیر کے لیے آزادی کے حصول کے ساتھ دوسرا اہم واقعہ تھا۔تقسیم ہند کی حقیقت تاریخ میں محض ایک دستاویز نہیں ہے بلکہ تقسیم کے واقعہ نے عام زندگیوں پر براہ راست اپنے اثرات مرتب کئے۔تقسیم کے نتیجہ میں ایک نئے ملک کی بنیاد پڑی اور اس نئے ملک پاکستان کی عمارت فرقہ واریت پر کھڑی کردی گئی،جس کی وجہ سے فرقہ وارانہ فسادات بڑے پیمانے پر ہوئے اور بے شمار افراد کو ترک وطن کے لیے مجبور ہونا پڑا غرض تقسیم اور اس کے بعد پیدا ہونے والے حالات واقعات کے نتیجہ میں ہندو پاک کے عوام کی زندگی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی، علاقائی اور نفسیاتی اعتبار سے بے حد متاثر ہوئی اور اس طرح سے ہزاروں زندگیوں پر تقسیم کے واقعات کے اثرات پڑے چنانچہ ادیب وفنکار بھی ذاتی طور پر تقسیم کے اس واقعہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔یہی وجہ ہے کہ 1947ء کے بعد کے بیشتر ناولوں میں تقسیم کے حادثہ کو ایک اہم موضوع بنا دیا گیا۔

---

(۱) آخر شب کے ہمسفر۔قرۃ العین حیدر،ص 175۔

یوں تو تقسیم ہند اور اس سے پیدا شدہ مسائل کو موضوع بنا کر اس دور میں بے شمار کامیاب ناول لکھے ہیں۔ ان میں سے چند نمائندہ ناولوں میں آنگن، آخر شب کے ہمسفر، ایوان غزل، تلاش بہاراں، ایک عورت ہزار دیوانے وغیرہ قابل ذکر ہیں جن میں تقسیم کے اس المناک حادثے سے ہونے والی تباہ کاریوں کا نقشہ بے حد موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ناول ''آخر شب کے ہمسفر'' میں بعض جگہوں پر تقسیم ہند کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہوئے ہندوستان کی قومی اور سیاسی تحریکات میں شعوری یا غیر شعوری طور پر موجود ان قوتوں کا تجزیہ بھی کیا جو اپنے اندر تقریب کی چنگاریوں کو بھی چھپائے ہوئے تھیں۔ غرض قرۃ العین نے ہندوستان کی مختلف قومی و سیاسی تحریکوں کو نہ صرف تقسیم ہند کے تناظر میں محدود کر کے دیکھا ہے بلکہ انھوں نے اسی پس منظر اور تسلسل میں تقسیم پاکستان اور قیام بنگلہ دیش کو بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ناول ''آخری شب کے ہمسفر'' سے ایک اقتباس دیکھئے:

> اگر جناح صاحب نے پاکستان نہ بنایا ہوتا تو آج بنگلہ دیش بھی نہ ہوتا پھر وہ خاموش اور سوچنے لگی۔ مدر انڈیا کا تصور بھی باقی ہندوستان کے قوم پرستوں کو دہشت پسند ہندو بنگالیوں نے دیا تھا۔ جو تقریب پسند کالی کے روپ میں شکتی کی پوجا کرتے تھے اور دیہی ماں کے قدیم دراوڑی تصور کے پرستار تھے اور ان اولین دہشت پسندوں میں جس کو انگریزوں نے Terrorist کہا اور ہنوستانیوں نے انقلابی کافی اینٹی مسلم بھی تھے اور بنکم چندر کا ''آنند مٹھ'' ان کا آدرش تھا اور بھدرا لوگ کی سیاست مسلم اشرافیہ کی سیاست کے cross carrents نے پاکستان بنایا اور پاکستان کی سیاست نے بنگلہ دیش۔(۱)

خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' بھی تقسیم پر آکر ختم ہوتا ہے۔ خدیجہ مستور نے ''آنگن'' کے پس

(۱) آخر شب کے ہمسفر، ص 332

منظر میں اس عہد کے ہندوستان کی دو بڑی سیاسی جماعتوں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ کی کش مکش اور اس کے نتیجہ میں تقسیم کے لیے تیار ہورہی فضا کی نشاندہی کی ہے۔ ناول آنگن سے ایک اقتباس دیکھئے جس میں جمیل جو مسلم لیگ کا سیاسی کارکن ہے مطالبہ پاکستان کی حمایت کرتے ہوئے کہتا ہے:

''مطالبہ پاکستان پر کانگریسی لاکھ روڑے اٹکائیں مگر کچھ نہیں کرسکتے۔ دس کروڑ مسلمانوں کے اس مطالبے کو کون روک سکتا ہے''۔(۱)

جمیلہ ہاشمی کا ناول ''تلاش بہاراں'' بھی تقسیم ہند کے ضمن میں قابل ذکر ہے۔ اس ناول میں جمیلہ ہاشمی نے تقسیم کے حادثہ کو ایک المیہ کی شکل میں پیش کیا ہے جمیلہ ہاشمی نے تقسیم کو ایک غیر فطری اور غیر انسانی عمل قرار دیا ہے۔ ناول کے مطالعے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنفہ دو قومی نظریے کی قائل نہیں ہے۔ اپنے ناول کے ایک اہم کردار شوبھا کے خط کے ذریعہ وہ اس مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کرتی ہیں:

ہمارے دشمن سوچی سمجھی تجویزوں کے تحت دوستوں کے بھیس میں ہمارے درمیان گھومتے اور ہمیں بتاتے ہیں کہ تباہی سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ ملک کے حصے بخرے ہورہے ہیں تو ہونے دیئے جائیں۔ مسلم اور ہندو وجود کے الگ الگ حصے ہیں۔ ان کو الگ الگ ہونا چاہئے اور مجھے یہ سب باتیں سن کر اپنا جسم سوتا ہوا، اپنا دل بجھتا ہوا لگتا ہے۔ اپنے جوگی مہاراج نے مجھے اپنے میکے کے گھر سے اپنے سسرال کے آنگن میں اگے ہوئے پیپل سے الگ کردیا تھا۔ اب کوئی مجھ کو میرے خوابوں سے الگ کردے گا مجھے معلوم ہے کہ ہم مرکر بھی

---

(۱) آنگن، خدیجہ مستور، ص 293۔

ہندو مسلم نہیں ہو سکتے، ہم صرف انسان ہیں یہ ہمارا پیارا سا گھر ہے اور اس کی تباہی اگر چہ یقینی ہو پھر بھی بہت تکلیف دہ اور قاتل ہوگی۔(۱)

اسی طرح ناول تلاش بہاراں میں آگے ایک جگہ مصنفہ نے تقسیم ملک کا غم اپنے ناول کے ایک اہم کردار بینا کے ذریعہ پیش کیا ہے۔اقتباس دیکھئے:

آج کل جلسے خوب زوروں پر ہیں بابا بینا نے پھر کہا ملک کی آزادی کا دن قریب آنے والا ہے اور پھر ملک کے دو حصے ہونے والے ہیں کہتے ہیں سب لوگ الگ الگ ہو جائیں گے۔ مسلمان ایک طرف ہندو دوسری طرف مجھے تو اس بات کا بڑا دکھ ہے بابا۔ آپ کچھ کر نہیں سکتے کہ یہ کھنڈت نہ پڑے اور میری ساری سہیلیاں اتنی اچھی لڑکیاں ہیں۔ عائشہ چلی جائے گی تو میں کیا کروں گی۔ بلقیس کے بنا میں جی نہیں سکتی۔ ہائے رام میں کیا کروں بابا۔ آپ ہی کچھ کیجے نا۔ وہ پھر اداس ہوگئی۔

میں نے کہا تمہاری پرنسپل کیا کہتی ہیں۔ ان سے کہو وہ کوئی علاج کریں۔ بابا بینا نے پھر کہا۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں وہ بچاری عورت ہیں کیا کریں گے آپ اخبار کے ذریعہ حکومت پر زور کیوں نہیں دیتے کہ وہ ایک دم ایسی باتیں بند کردے۔ جو لوگ آزادی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں ان کو بتانا چاہئے کہ بٹ کر ملک کی شکتی کم ہو جائے گی۔ ہم دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کمزور ہو جائیں گے۔ اور پھر ہم تو صدیوں سے اس میں اکھٹے رہتے آئے ہیں بابا۔(۲)

---

(۱)تلاش بہاراں، جمیلہ ہاشمی ،ص 583

(۲)تلاش بہاراں۔ جمیلہ ہاشمی ،ص 591,592

جمیلہ ہاشمی نے ناول تلاش بہاراں میں پوری طرح سے انگریزوں کو ہی تقسیم ہند کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے ان کے خیال میں تقسیم انگریزوں کی ہی سازش کا نتیجہ تھی۔ ورنہ ہندو اور مسلمان آپس میں ہمیشہ اتحاد اور بھائی چارگی کے ساتھ رہے ہیں، ناول سے ایک اقتباس دیکھئے جس میں ہندوستان کی تقسیم روایت اور آپسی بھائی چارگی کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان متحدہ ہندوستان کے باشندوں کی آپسی پھوٹ اور نفاق کا نقشہ بڑے موثر انداز میں کھینچا ہے:

> غیر ملکیوں نے اپنا داؤ چلا لیا تھا ان کا وار خالی نہیں گیا۔ صدیوں سے ملک میں رہنے والے پھوٹ کی وجہ سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ مسلمان اور ہندو کا سوال روایتوں کا سوال۔ الگ تمدن کا سوال، الگ ملک کا سوال درپیش تھا اور جذباتی عوام اس کو ایک مذہبی رنگ دے رہے تھے۔ راجپوتانے کے شوربیروں نے اکبر اور نگ زیب کے درباروں میں داد شجاعت دینے کے بعد انعامات حاصل کئے تھے۔ مغلوں کے درباروں میں ہندو اور مسلمان سر جوڑ کر حکومت کے مسائل پر غور کرتے رہے تھے۔ پھر غلامی کا ایک دور آیا۔ انگریزوں نے ملک کو تباہی کے بیج بو کے کاٹنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ ہر روز جلسے ہوتے جلوس نکالے جاتے اور مادر ہند کے حصے بخرے کرنے کے لیے تیاری ہونے لگی۔ صدیوں کے بھائیوں کو ایک دوسرے کے خلاف شکایت ہونے لگی۔ ریزولیوشن۔ نعرے اشتعال انگیز تقریریں جذباتی حد بندیاں اور سب اتنے دکھ سے منتظر تھے۔ بظاہر مطمئن دلوں کے ساتھ ہم لوگ مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے ایک دوسرے کا نہیں اپنا۔ ہم اپنے آپ کو اپنے وجود سے اپنے خول سے باہر نکل کر ایک فاصلے پر ملنا چاہتے تھے تا کہ جذبات ہمیں اندھا نہ کردیں حکومت کی ریشہ

دوانیاں ہمیں ایک چٹان کی طرف کھینچے لئے جاتی تھی ۔ہم اندھا دھند بھاگ رہے تھے موت یقینی تھی ۔اگر موت نہیں تو کم از کم ایک عرصے کے لیے ہمارے دست و بازو تو ناکارہ ہونے والے تھے۔ ہمارے ارد گرد ابھی امن تھا۔مگر باہر سے خبریں آرہی تھیں ۔فسادات ہو رہے تھے ۔جگہ جگہ سے لوگ ایک دوسرے کے گلے کاٹتے گھروں کو آگ لگاتے ہیں ہجوم کی صورت میں بڑھ رہے تھے۔مسلمان اور ہندو دونوں جاتیوں کے لیڈر سوچ رہے تھے روز خبروں سے گھبرا کر اپنے بیانات دیتے اور پھر بھی حالات اس سے جاری تھے حکومت امن کروانے کی کوشش میں درپردہ وہ اپنے تنخواہ دار ملازموں کے ذریعہ واقعات کو ہوا دے رہی تھی اور ہم سب سوچ رہے تھے شاید امن ہو جائے ۔شاید ہم لوگ مرنے سے بچ جائیں ۔باپ کے مرنے پر جس طرح جائیداد کے حصے بخرے کیے جاتے ہیں کچھ وہی حالت ہماری تھی ۔ہمارے دماغ معطل ہو چکے تھے ۔سوچ اور مصیبت کے احساس نے ہمارے ذہنوں کو کند کر دیا تھا اور اس کے باوجود بظاہر ایک سکون تھا۔ پر جسم کے ایک حصے کو اگر کوئی تکلیف پہنچے تو سارا جسم درد کو محسوس کرتا اور بے چین ہوتا ہے ویسی ہی حالت ہماری تھی۔اس کے باوجود کہ سب کام ابھی اسی سلامتی سے چل رہے تھے۔دل کھو کھلے ہو چکے تھے۔مگر چہروں پر ہنسی تھی۔(۱)

تقسیم کے مسئلہ کو لے کر ملک بھر میں انتشار پھیلانے لگا اور دن بہ دن ملک کی حالت خراب ہونے لگی۔ مختلف سیاسی تحریکوں کے اختلافات نے ذاتی مفاد پرستی کو جنم دیا اور ہر کوئی اپنے اپنے فائدے کے بارے میں سوچنے لگا۔انسانیت محض نام کے لیے رہ گئی۔غرض تقسیم کے اس مسئلہ سے پیدا

(۱)تلاش بہاراں، جملہ ہاشمی،ص 535 تا 537

شدہ ناگزیر حالات کو جمیلہ ہاشمی نے ناول تلاش بہاراں میں اس طرح بیان کیا ہے:

ملک کی حالت اتنی دگرگوں ہے ہندو مسلم فسادات ہونے والے ہیں۔جلوس نکلتے ہیں۔کانگریسی اور مسلم لیگی انتخابات کیا کوئی ایسا نہیں ہے جو ان حد بندیوں سے بلند ہو کر محض انسانیت کے لیے کام کرے کیا کوئی ایسا نہیں ہے جو اپنے ذاتی مفاد کو نظر انداز کر کے صرف انسان بن کران سارے اختلافات کو مٹانے کی کوشش کرے۔ میں اکیلی ہوں اور عورت ہوں۔ میں جو کچھ کرنا چاہتی ہوں حالات اس کے خلاف ہیں۔یہ کام مرد کر سکتے ہیں۔(۱)

تقسیم ہند کو لے کر بعض لوگوں کا خیال تھا کہ تقسیم مسلمانوں کے لیے بہتر ثابت ہوگی۔لوگ یہ بھی سمجھتے تھے کہ تقسیم ہند کی وجہ سے مسلمانوں کی معاشی اقتصادی حالات میں سدھار آئے گا۔ چنانچہ ناول آخر شب کے ہمسفر، سے ایک اقتباس دیکھئے۔جس میں ناول کی ہیروئن دیپالی نواب صاحب سے تقسیم ہند اور مسلمانوں کے حالات پر گفتگو کر رہی ہے:

دیپالی چونک پڑی۔پھر اس نے کہا'' کاکا۔آپ کیوں چاہتے ہی کہ ملک تقسیم ہو جائے؟''

نواب صاحب چند سیکنڈ تک پیچوان گڑگڑاتے رہے اور پھر امان سے کہا''بیٹی تم کو یہ معلوم ہے کہ سارے ہندوستان کے مسلمان تباہ حال ہیں؟ ایک وقت تھا کہ اسی بنگال کا مسلمان خوش حال اور آسودہ تھا۔ صرف اس صوبے میں ایک لاکھ اسلامی مدارس تھے۔بیٹی......ایک لاکھ مدرسے اب یہاں مسلمانوں کی اقتصادی پسماندگی اور ان کے ساتھ سماجی بے انصافی کا اعتراف کر چکے ہیں۔

---

(۱)تلاش بہاراں، جملہ ہاشمی،ص 577۔

> مگر کا کا...... آزاد متحدہ ہندوستان میں بھی تو مسلمان خوش حال
> ہوسکتے ہیں۔متحدہ ہندوستان میں؟ ہرگز نہیں......انھوں نے گہرا سانس
> لے کر کہا۔اور ہندوستان متحد کب تھا۔اسے انگریزوں نے متحد کیا۔(۱)

اس طرح اس ناول کا ایک اور اقتباس دیکھیے جس میں نواب صاحب دیپالی کو مسلمان کی صورت حال سے واقف کررہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ بنگال کے مسلمانوں کو اس تقسیم سے فائدہ ضرور ہوگا کیوں کہ بنگال کے کئی مسلمان ہندو مہاجن اور ہندو زمینداروں کے پنجے میں پھنسے ہوئے ہیں۔اگر یہ تقسیم ہوگی تو ان مسلمانوں کو نجات حاصل ہوگی۔اس کے علاوہ نواب صاحب دیپالی سے کہتے ہیں کہ بنگال کے کلچر میں مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن بنگال کے ہندوؤں نے کبھی اس بات کا اعتراف نہیں کیا۔ان کا کہنا ہے کہ بنگلہ ادب اور تہذیب صرف ہندوؤں کا ورثہ ہے۔غرض متحدہ ہندوستان کے باشندوں کی اس آپسی پھوٹ اور اتفاق کو دیپالی اور نواب صاحب کی گفتگو کے ذریعہ بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے:

> ہم 1904ء کی تقسیم بنگال سے خوش تھے کیونکہ اس میں ہمارا
> قتصادی فائدہ تھا۔تم لوگوں نے اسے اپنی سیاسی عزائم پر ضرب کاری
> سمجھا اور اس کو ختم کرنے کے لیے تشدد کی تحریک شروع کردی۔اور بم
> پھینکنے لگے۔ بم پھینکنے والے تمہارے ہیرو قرار پائے۔بٹی معاف
> کرنا۔تم نے ہی یہ ذکر چھیڑا ہے اور تم کہتی ہو کہ تم اب بڑی ہوگئی ہو اور
> سمجھ دار ہو۔اس لئے میں تم سے کہہ رہا ہوں۔اسی ڈھاکے میں تقسیم کے
> خلاف احتجاج کرنے کے لیے انگریزوں پر بم پھینکنے والوں کے پاس
> پانچ سو خفیہ گروہ تھے۔
>
> پانچ سو......کاکا؟ دیپالی نے آنکھیں پھیلا کر دہرایا اور سوچا۔میں

---

(۱) آخر شب کے ہمسفر۔قرۃ العین حیدر۔ص 132۔

اس بم پھینکنے والے خفیہ گروہ کی روایت کی پیروہوں ۔ اور نواب قمرالزماں چودھری مخالف کیمپ میں ہیں ۔ایسا کیوں ہوا؟ بنگال کی مسلم اکثریت کا۔یقیناً اس تقسیم سے فائدہ تھا۔تم نے تو بٹی گاؤں میں ہندومہاجن اور ہندوزمیندار کے پنجے میں پھنسے مسلمان کسان کی حالت نہیں دیکھی ۔

کا کا میں صرف یہ کہہ رہی تھی ۔دیپالی نے اب ذرا غیر یقینی لہجے میں کہا کہ بٹوارے کے بجائے اتحاد کی بھی کوشش کی جاسکتی ہے۔

اتحاد......اتحاد کہاں ہے؟ پنجاب کا آریہ سماج اور مہاراشٹر اور بنگال کی ہندو تجدید پرستی اتحاد کی نشانیاں ہیں؟

میں دوسرے صوبوں کے متعلق تو نہں جانتی کا کا۔مگر ہمارے بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا کلچر تو بالکل ایک ہے ۔

مانتا ہوں بھائی...... یہاں کا کلچر ایک ہے یہاں کی لوک سنگیت ، لوک ساہتیہ ہر چیز میں مسلمانوں کا کتنا بڑا حصہ ہے ۔مگر ہندوؤں نے کبھی اس کا اعتراف کیا؟ بنگالی کلچر سے ان کی مراد محض ہندو بنگالی کلچر ہوتی ہے۔پچھلی صدی میں تو زوروشور سے یہ بحث چھیڑ گئی تھی کہ بنگلہ مسلمانوں کی زبان ہی نہیں ۔ بنگلہ ادب اور تہذیب صرف ہندوؤں کا ورثہ ہے ۔کیا ہم اتحاد نہیں چاہتے تھے؟ خدا کی قسم ہم اتحاد چاہتے تھے اور پچھلے آٹھ سو سال کی تخلیق شدہ بنگالی لوک سنگیت اور ادب اس کا مکمل ثبوت ہے۔مگر اب مسلمانوں سے اتنی نفرت ۔ان کے لیے حقارت کا ایسا رویہ......تم نے آنند مٹھ پڑھا ہے؟

دیپالی نے نفی میں سر ہلایا۔

لیکن بنگال کے مسلمان پسماندہ اور مفلس کسان اور ماہی گیر اور

ملاح اور کاریگر ہیں ۔اپنی مدافعت میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔تمہارا ہندو
بنگالی پر میں نواب سرسلیم اللہ کو انگریز کا پٹھو کہتا ہے اور یہ جواتنے بنگالی
ہندو نائٹ ہیں یہ انگریز کے پٹھو نہیں؟

دیپالی خاموش رہی ۔نواب صاحب نے ذرا جوش سے بات
جاری رکھی۔''تم بنگالی کلچر کے اتحاد کی بات کرتی ہو۔بالکل صحیح ہے۔
سو ڈیڑھ سو سال قبل تک یہ کلچر واقعی ایک تھا۔راجہ رام موہن رائے عربی
اور فارسی کے عالم تھے۔نوابین مرشد آباد کے دور تک ہندو شرفا فارسی
پڑھتے تھے۔تمہارے گرو دیو، جن کا خاندانی نام انگریزوں نے ٹھاکر
کے بجائے ٹیگور کردیا۔ٹھاکر کا یہ خطاب اس خاندان کو بنگال کے
مسلمان نوابوں ہی نے دیا تھا۔تم یہ بات جانتی ہو؟''

دیپالی نے پھر نفی میں سر ہلایا

''ایک زمانے میں یہ ٹھاکر خاندان پیرعلی برہمنوں کا گھرانا کہلاتا
تھا کیوں کہ انھوں نے قنوجی برہمنوں کی ذات پات کی قیود توڑ کر
مسلمان نوابوں کے یہاں ملازمت کرلی تھی۔خود اپنا نام دیکھو۔سرکار
مجموعہ دار،مزمدار،تعلقہ دار اور قانون گو۔یہ سب بنگالی کاسبھوں کے مغل
عہدے تھے، جواب تمہاری ذات بن چکے ہیں''۔نواب صاحب نے
پیچوان کے سامنے ایک طرف رکھ کر لمبی سانس لی۔(۱)

تقسیم ہند کے المیہ نے متحدہ ہندوستان کے باشندوں کے دلوں سے بھائی چارہ ختم کردیا۔ہندو مسلمان ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے۔غرض ہندوستان کے ہندو و مسلمانوں کے اس غیر اخلاقانہ فعل کی تصویر کشی ان لفظوں میں کی اقتباس دیکھئے:

پاکستان بن گیا۔لیگی راہ نما کراچی دارالحکومت جاچکے تھے۔پنجاب

---

(۱) آخر شب کے ہمسفر،قرۃالعین حیدر،ص 133 تا 136

میں خون کی ہولی کھیل جارہی تھی۔ بڑے چچا اس صدمے سے جیسے
نڈھال ہوگئے تھے۔بیٹھک میں بیماروں کی طرح وہ ہر ایک سے پوچھتے
رہتے۔ یہ کیا ہورہا ہے؟ یہ کیا ہوگا؟ یہ ہندو مسلمان ایک دم ایک
دوسرے کے ایسے جانی دشمن کیسے ہوگئے؟ یہ انہیں کس نے سکھایا ہے؟
ان کے دل سے کس نے محبت چھین لی؟ (۱)

اس طرح آگے خدیجہ مستور نے ہندو مسلمان کے اتحاد کے زمانے کو یاد کرتے ہوئے موجودہ تقسیم سے پیدا ہونے والی نفرت کو اس طرح بیان کیا ہے:

زمانے زمانے کی بات ہے وہ بھی زمانہ تھا جب ہندو اپنے گاؤں
کے مسلمانوں پر آنچ آتے دیکھتے تو سر دھڑ کی بازی لگا دیتے اور مسلمان
ہندو کی عزت بچانے کے لیے اپنی جان نچھاور کردیتا۔ایسا بھائی چارہ تھا
کہ لگتا ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔ پر اب کیا رہ گیا۔
دونوں کے ہاتھوں میں خنجر آگیا ہے۔(۲)

تقسیم کے واقعہ نے اپنوں کو اپنوں سے جدا کردیا ایک ہی گھر کے افراد ایک دوسرے الگ رہنے پر مجبور ہوگئے اور اس طرح سے لوگ گھر سے بے گھر ہوتے گئے۔ چنانچہ ناول آنگن سے اقتباس دیکھئے جس میں تقسیم کے بعد ایک گھر کے ٹوٹتے ہوئے حالات کو بیان کیا گیا ہے:

تم اتنی دیر تک باہر نہ رہا کرو، شام سے گھر آجایا کرو جانے کب
یہاں بھی گڑبڑ ہوجائے۔بڑی چچی نے کہا۔

رہنا تو پڑتا ہے۔مسلمان ڈرے ہوئے ہیں۔انہیں سمجھانا ہے کہ وہ
یہاں ڈٹ کر رہیں اور یہاں کی فضا کو پرامن رکھیں، گھر میں بیٹھ کر تو

---

(۱) آنگن۔خدیجہ مستور۔ص 304

(۲) آنگن۔خدیجہ مستور۔ص۔305

کام نہ چلے گا''۔''تو بہ اب ملک آزاد تو یہ کام شروع ہو گئے، خیر مجھے کیا، تم نے تار پر پتہ ٹھیک لکھا تھا نا؟''

اماں نے پوچھا۔

''آپ اطمینان رکھیں، پتہ ٹھیک تھا''۔

''خیر سے ہم تو پاکستان جا رہے ہیں، مگر اب تم اپنے گھر کی فکر کرو جمیل میاں کیا بری حالت ہو چکی ہے ۔ اپنی ماں کی طرف بھی دیکھو۔

اماں نے ہمدردی سے بڑی چچی کی طرف دیکھا۔

کون جا رہا ہے پاکستان؟ بڑے چچا نے صحن میں قدم رکھتے ہی بوکھلا کر پوچھا۔انھوں نے اماں کی باتیں سن لی تھیں ۔

''میں اور عالیہ جائیں گے،اور کسے جانا ہے''۔اماں نے لڑاق سے جواب دیا۔''کوئی نہیں جا سکتا میری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں نکال سکتا،کس لئے جاؤ گے پاکستان؟ یہ ہمارا ملک ہے ہم نے قربانیاں دی ہیں اور اب ہم اسے چھوڑ کر چلے جائیں؟ اب تو ہمارے عیش کرنے کا وقت آ رہا ہے۔

بڑے چچا سخت جوش میں تھے ۔

ماشاءاللہ، آپ بڑے حق دار بن کر آ گئے، نہ کھلانے کے نہ پلانے کے،کون سا دکھ تھا جو یہاں آ کر نہیں جھیلا ،میرے شوہر کو بھی آپ ہی نے چھین لیا۔آپ ہی نے انہیں مار ڈالا ۔میری لڑکی کو یتیم کر دیا اور اب حق جتا رہے ہیں ۔مارے غصے کے اماں کی آواز کانپ رہی تھی ۔

یہ انگریز جاتے جاتے بھی چال چل گیا ۔لوگوں کو گھر سے بے گھر کر گیا ۔پھر بھی تم مت جاؤ بیٹی،اپنی ماں کو سمجھا لو،اب تمہارے سکھ کا زمانہ آ گیا ہے۔''

"بڑے چچا میں تو اماں کا واحد سہارا ہوں" میں انہیں کس طرح
چھوڑ دوں وہ ضرور جائیں گی مگر آپ کو نہیں معلوم کہ یہ گھر چھوڑ کر میں
کس طرح تڑپوں گی۔آپ......آپ تو......" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ
چھپا کر سسکنے لگی۔(۱)

تقسیم ہند کے بعد ایک مسئلہ شہریت کا تھا۔یعنی کچھ لوگ پاکستانی تھے۔اگر وہ کسی وجہ سے ہندوستان چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تو انہیں یہاں کی شہریت نہیں ملتی تھی اسی طرح ہندوستانیوں کی حالت پاکستان میں تھی۔غرض تقسیم کے بعد ابھرنے والے اس اہم مسئلہ کو کرشن چندر نے اپنے ناول "ایک عورت ہزار دیوانے" میں پیش کیا ہے کہ اس ناول کا ہیرو گل جو پاکستانی ہے اس کی محبوب لاچی جو ایک خانہ بدوش ہے ہندوستان میں رہتی ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد گل اپنی محبوبہ کے ساتھ رہنے کی خاطر ہندوستان کا شہری بننے کے لیے درخواست دیتا ہے لیکن اس کی درخواست اس بنا پر رد کردی جاتی ہے کہ وہ پٹھان ہے اور پاکستان کا رہنے والا ہے۔اقتباس دیکھیے:

"گل کیا بات ہے؟" لاچی اک دم گل کے قریب آگئی اور گل کا منھ
اپنی طرف پھیرتے ہوئے بولی
کیا بات ہے؟ بتاؤ گے نہیں؟
گل نے آہستہ سے کہا "میری درخواست نامنظور ہوگئی ہے"
"کون سی درخواست؟"
"ہندوستان کا شہری بننے کی درخواست"
لاچی یکا یک کھلکھلا کر ہنس پڑی
"نامنظور ہوگئی تو کیا ہوا؟ اس میں اتنا منھ لٹکا کر بات کرنے کی بات

(۱) آنگن۔خدیجہ مستور۔308,309

ہے ہم خانہ بدوشوں کو دیکھو، ہم تو کہیں کے شہری نہیں۔ جہاں جی چاہتا چلے جاتے ہیں"۔ "تمہاری بات اور ہے میں پٹھان ہوں۔ پاکستان کے ملک کا رہنے والا ہوں" "ملک کیا ہوتا ہے؟" لاچی نے پوچھا۔

"ملک......؟" گل بولتے بولتے رک گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے اس نے بھی اپنے آپ سے پوچھا......واقعی ملک کیا ہوتا ہے؟ اور جب اسے اس کا معقول جواب نہ سوجھا تو تو اس نے اٹکتے رکتے کہا" مک تو ملک ہوتا ہے، جیسے ایک ایک ملک پاکستان ہے۔ ایک ہندوستان ہے، ایک ملک چین ہے۔ ایک جاپان ہے یہ سب ملک ساری دھرتی کے الگ الگ حصے ہیں۔

"مگر ہم خانہ بدوشوں کے لیے تو یہ ساری دھرتی ایک ہے۔

"مگر اس دنیا کے انسانوں کے لیے ایک نہیں ہے"۔

"مگر اس دنیا کے انسانوں کے لیے ایک نہیں ہے۔ گل نے ذرا تلخی سے کہا"انھوں نے جو اپنے آپ کو انسان، مہذب اور ترقی یافتہ کہتے ہیں اس دھرتی کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے ہیں اور اسے مختلف خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ یہ تیرا، وہ میرا، وہ اس کا!(۱)

فسادات:

تقسیم ہند برصغیر کی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ دوقومی نظریہ کی بنیاد پر کی گئی اس تقسیم نے کئی مسائل کو جنم دیا۔ کروڑ افراد اپنے گھروں کو چھوڑ کر اجنبی دیاروں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے مذہب کے نام پر لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی، معصوم بچوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ بیویوں کے سہاگ اجاڑ دیئے گئے گھروں کو شعلوں کی نذر کردیا گیا۔ آدمی سے اس کی

(۱) ایک عورت ہزار دیوانے، کرشن چندر، ص 177

انسانیت چھین لی گئی ملک بھر میں ہر طرف قتل وخون وفسادات کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تعصب کے شکار لوگ مذہبی جنون میں ایک دوسرے کے خون سے اپنے اپنے دامن کو رنگنے لگے غرض ان فسادات میں انسان نے جس پیانے پر بربریت کا مظاہرہ کیا تھا اس کی دوسری مثال برصغیر کی پوری تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ چنانچہ ایسے میں ادیبوں اور دانشوروں نے اپنے قلم اور ضمیر کی آواز کو انسانیت کی حمایت میں اور بربریت کے خلاف بلند کیا۔

ادب کی دوسری اصناف کی طرح اور ناول میں بھی تقسیم کے نتیجہ میں بھڑ کے فرقہ وارانہ فسادات کو موضوع بنایا اکثر وبیشتر ناول نگار ذہنی نفسیاتی اور جذباتی طور پر اس واقعہ سے متاثر ہوئے اور فسادات کی درندگی ان کے دلوں پر گہرے اثرات مرتب کیے لہٰذا ہمارے ناول نگاروں نے فرقہ وارانہ تشدد اور خونریزی کی مذمت کرتے ہوئے انسانیت اور انسان دوستی کے اقدار کی حمایت میں آواز بلند کیا۔ اس ضمن میں 1960-80 کے درمیان لکھے جانے والے نمائندہ ناولوں مں 'ایوان غزل'' تلاش بہاراں، آنگن، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جیلانی بانو نے اپنے ناول ''ایوان غزل'' میں تقسیم ملک کے وقت پورے ملک میں پھیلے فسادات کی لہر اور اس کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ اگرچہ ناول ''ایوان غزل'' موضوع حیدرآباد تک ہی محدود ہے اور حیدرآباد تقسیم ہند کے فسادات کی خونریزی اور درندگی کا شکار نہیں ہوا تھا وہاں فرقہ وارانہ سطح پر فضا ابھی پرامن تھی لیکن ہندوستان کے دیگر صوبوں میں ہوئے فسادات کے اثرات حیدرآباد پہنچ رہے تھے کیونکہ مہاجرین اور فسادزدہ لوگ پناہ لینے کی غرض سے حیدرآباد کا رخ کر رہے تھے چنانچہ ناول نگار نے اس جانب اس ناول میں اس طرح نشاندہی کی ہے:

> رات کو جب سب فرصت سے بیٹھے تو رضیہ اخبار اٹھا کر بی بی اور
> کوہر پھوپو کو ہیبت ناک خبریں سناتی تھی۔ سب کے دل دھڑ کنے لگے۔

اتنا دنگا فساد ہر طرف ہو رہا تھا۔

ارے تو بیچ بچاؤ کرنے والے سب مر گئے کیا۔

پھوپو نے گھبرا کر پوچھا "سنا ہے گاندھی بہت سمجھا رہے ہیں۔ وہ تو فساد کی جگہ خود جا کر مسلمانوں کو مارنے سے روکتے ہیں"۔ رضیہ نے راشد سے سنی ہوئی باتوں کو دہرانا شروع کیا۔ "اونہ۔ یہاں تو سب چین ہے۔ کہیں لڑنے والے یہاں نہ آجائیں"۔ بی بی نے گھبرا کے کہا۔ دن بھر آنکھیں بند کیے واحد حسین آرام کرسی پر لیٹے خبریں سنتے رہتے تھے، ریڈیو بند کرتے تو اخبار اٹھا لیتے سارے ہندوستان میں فسادات ہو رہے تھے بہت سے لوگ پناہ لینے حیدرآباد آ گئے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حیدرآباد ہر ایک کو محبت کے ساتھ اپنے دل میں جگہ دیتا ہے۔ یہ دہلی کے معزز خاندانوں کے افراد تھے جو اپنی وضع داری اور آن بان کے لیے جان کی پروا نہ کرتے تھے۔ مگر آج ان کی عورتیں اپنے بچوں کی جان بچانے کے لیے دوپٹے سے منہ ڈھانپے ہاتھ پھیلائے سڑکوں پر ماری ماری پھر رہی تھیں۔ شہر میں جگہ جگہ مہاجرین کیمپ کھل گئے تھے۔ لوگ بڑھ چڑھ کر چندے دیتے کپڑے اور اناج تقسیم کرتے۔(۱)

جمیلہ ہاشمی کے ناول "تلاش بہاراں" کا اختتام بھی فسادات کے واقعہ پر ہوتا ہے۔ مصنفہ نے فسادات کی ہولناکی کو بڑی اثر انگیزی کے ساتھ پیش کیا ہے:

شہر میں جانا نہ ممکن تھا۔ باہر کی خوشی کے مقابلہ میں اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ اندر کوئی کرفیو نہ تھا ایک قیامت تھی۔ آگ کے شعلے بارش کے باوجود بلند ہو رہے تھے۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ عورتیں چھتوں سے چھلانگیں لگا رہی تھیں۔ عورتیں ننگے سر ننگے پیر بھاگ رہی تھیں۔ مرد

---

(۱) ایوان غزل۔ جیلانی بانو۔ ص 177

روتے ہوئے آگ کے شعلوں میں پھینکے جا رہے تھے۔ بچوں کو چیختے
اور چلاتے بچوں کوں کو نیزوں پر لٹکایا جا رہا تھا۔ ان کو زندہ ہی آگ پر
بھنا جا رہا تھا۔ تیل کے بڑے بڑے کھولتے کڑھاو تھے ان میں لڑکیوں
کو برہنہ کر کے دھکا دے دیا جاتا۔ عورتیں بال بکھرائے وحشت سے
آنکھیں کھولے بھاگ رہی تھیں۔ نازک اندام سفید لڑکیاں ننگی پتھرائی
ہوئی شکلوں سے برستی بارش میں قطاروں میں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ مرد
انہیں دیکھ کر ہنستے اور شراب سے مدہوش ہو کر جس کو جی چاہتا کھینچ لیتے۔
ان لڑکیوں کے آنسو کہاں تھے؟ خدا کہاں تھا بھگوان کہاں تھا وہ مقدس
نام کہاں تھے جن کے سہارے انسان زندہ تھا۔ رحم دل حکیم پاکباز مرد
کہاں تھے اور یہ سب وحشیانہ ہنستے وحشیانہ قہقہے لگاتے چیختے چلاتے کون
تھے۔ کیا یہ پرانے زمانوں کی روحیں تھیں۔ جن کو ابلیس نے دفعتاً آزاد
کر کے دنیا میں ڈھکیل دیا تھا۔ رام رام کرتے نعرے لگاتے جیسے جے
کار کرتے ہجوم تلواریں گھماتے چیختے ہنسے بڑھ رہے تھے۔ انسان کی پناہ
گاہ ہس انسان کے آسرے اور سہارے کہاں تھے۔(۱)

جمیلہ ہاشمی نے تقسیم کی طرح فسادات کے لیے بھی انگریزوں کو ہی ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے متعلق ایک غیر ملکی کردار ڈان وارٹن کو راوی یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ آج تک ہمارے ملک میں مذہب کے نام پر اتنا فساد نہیں ہوا ہمارے ملک میں تو ہم ہندو مسلمان سے زیادہ انسان بن کرر ہے ہیں۔ ہمارے اتحاد کی مثالیں دی جاتی رہی ہے۔ چنانچہ اقتباس دیکھیے:

ہمارے ہاں مذہب کے نام پر ایک دو آدمیوں کا خون تو بہایا گیا ہے
پر یوں کبھی نہیں ہوا بھائی میں سچ کہتا ہوں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ہم تو ہندو

---

(۱) تلاش بہاراں، جمیلہ ہاشمی ص 718

> مسلمان سے زیادہ انسان تھے ہم نے صدیوں اس گہوارے میں ایک دوسرے کے دوش بدوش آزادی کی جنگوں میں حصہ لیا ہے ہم نے یہاں اپنی تمناؤں کو پھلتے پھولتے دیکھا ہے اور جب تم نے ہمیں دیکھا ہمارے قریب ہوئے تو ہم مرد ہی تھے ہماری آرزوؤں کا خون بیڑی بن کر ہمارے پاؤں میں رچا تھا۔کاش تم ایک صدی چند سال پہلے آئے ہوتے پر حسرتیں حسرتیں ہی رہیں میرے بھائی اور میں ایک پاگل کی طرح تم کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جو کچھ ہوا وہ ایک غلطی تھی۔ ہمارا مقصد آخری لمحے تک یہ نہ تھا۔ہم جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔سمجھے ہم شکار کئے گئے ہیں۔گھات میں چھپے شکاری کی گولی تھی۔جس نے ہمیں خاک وخون میں تڑپایا ہے۔(۱)

تقسیم کے فرقہ وارانہ فسادات نے ہندوستانی عدم تشدد اور امن و اتفاق کے قدیم اصولوں کا خون کردیا امن و دوستی کے یہ اصول ہندوستان میں صدیوں سے جاری و ساری تھے جسے یہاں کے باشندے انسانیت کے رشتوں کے سہارے ہمیشہ روشن رکھا تھا۔ چنانچہ جمیلہ ہاشمی نے فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعہ ہندوستانی عدم تشدد اور امن و آشتی کے اصولوں کے خون کی داستان اس طرح بیان کی ہے:

> ہندوستان میں لوگوں نے اہنسا پرمودھرما کے اصولوں کے باوجود ایک دوسرے کے گلے کاٹے، دوسرے مذہب کی عورتوں کو ذلیل کیا۔ بچوں کو نیزوں پر لٹکایا، مردوں کو سرعام ہنس ہنس کر عذاب سے مارا اور ایسے وحشیانہ کام کیے سارا یورپ کانپ گیا۔(۲)

---

(۱)تلاش بہاراں۔جمیلہ ہاشمی،ص 680۔

(۲)تلاش بہاراں،جمیلہ ہاشمی،ص 682

فرقہ وارانہ فسادات کے حالات میں لوگ پوری طرح سے انسانیت کو بھول گئے تھے۔ انہیں صرف اپنا مذہب عزیز تھا۔ اگر کوئی شخص ان فسادیوں کو انسانیت کا سبق دینا بھی چاہتا تھا اس پر ظلم وستم کرتے یا اس کو قتل کر دیا جاتا۔

غرض جمیلہ ہاشمی نے اس حقیقت کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

جس نے انسانیت کے نام پر آواز اٹھائی اس کا گلہ دبا دیا جاتا تھا، اسے ہی قتل کر دیا جاتا تھا، ایک پاگل پن اور جنون مذہب کے نام پر پھیل گیا تھا۔ کوئی حکومت نہ تھی، انقلاب اور درندگی کا راج تھا، ہندوستان نے ایسے پریشان خواب کا ہے دیکھے ہوں گے''۔(۱)

اس طرح اس ناول سے ایک اور اقتباس دیکھیے جس میں ایک کردار جو انسانیت کا درس دے رہا ہے تو لوگ اس کو جان کی دھمکیاں دے کر گھر میں مقید کر رہے ہیں:

اور ہماری سچائی سے بھی اسکیموں کی لہریں ٹکرا گئیں۔ اس دن میں اپنے آپ کو اپنے گھر میں مقید پایا۔ لوگوں نے مجھے دھمکیاں دیں کہ تم اگر اپنی انسانیت اور انسان پرستی کا جھنڈے لے کر باہر نکلے تو قتل کر دیے جاؤ گے۔ تم نکل نہیں سکتے تم کہیں جا نہیں سکتے۔ نرو پما بھی ایک ظالم کی طرح میرے خلاف ہوگئی۔ وہ ہنستی تھی اور کہتی تھی۔ اپنا دھرم سب سے اچھا ہے ہم پرماتما کے نام کی بلندی کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ ہم سب مسلمانوں کو ختم کر دیں گے...... میرے دروازے پر چار سپاہی حفاظت کی خاطر ہے مگر اصل میں مجھے گھر سے باہر جانے سے روکنے کے لیے تعینات کر دیئے گئے تھے۔ میرے کمرے سے ٹیلیفون اٹھا لیا گیا۔ میں بے دست وپا پرندے کی طرح تھا۔(۲)

---

(۱) تلاش بہاراں، جمیلہ ہاشمی، ص 712

(۲) تلاش بہاراں، جمیلہ ہاشمی، ص 711

فرقہ وارانہ فسادیوں نے جس قدر بربریت کا مظاہرہ کیا اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ فسادات میں جہاں گھروں کو شعلوں کی نذر کر دیا گیا۔ معصوم بچوں کو مار دیا گیا۔ وہیں عورتوں اور لڑکیوں کی آبرو کو بھی خاک میں ملا دیا گیا ان عورتوں اور لڑکیوں کی حفاظت کرنے والے انسانیت کا نام لے کر ان لڑکیوں کی عزت بچاتے بچاتے دم توڑ دیئے لیکن ان کی مدد کے لیے کوئی نہیں آیا۔ ناول تلاش بہاراں سے ایک اقتباس دیکھیے:

> ''اس دن سے میرا دل ہر بار ہر گھڑی ہر دھڑکن کے ساتھ کہتا ہے کنول ٹھاکر کنول ٹھاکر مگر بینا کے زور دینے کے باوجود میں نے اسے کوئی پیغام نہیں بھیجا میں اسے دیکھنے نہیں گیا اور نیرا نے مجھے بتایا ہے کہ کنول خواب میں چلنے اور رونے والوں کی طرح اپنی بیہوشی کے عالم میں بھی کہتی ہے۔''انسانیت کو بچاؤ'' کوئی میری ''بچیوں کو بچاؤ'' کوئی میری آن اور عزت کا نام لیتی رہی وہ ہندوستان میں عورت ننگی ہے عورت کی عزت اور آن خاک میں مل چکی ہے۔ عورت کہیں نہیں ہے۔ صرف دشت کے رنگوں کے ہیولے ہیں۔ عورت کیا مذاق ہے یہ نام؟(۱)

جہاں ایک طرف سارے ملک میں قتل و خونریزی کا بازار گرم تھا اور انسانیت دم توڑ چکی تھی وہیں دوسری ایسی قوتیں بھی موجود تھیں جو اس فرقہ وارانہ فسادات کے افراتفری کے دور میں محبت و اخوت اور انسان دوستی کا درس بھی دے رہی تھیں اور یہ قوتیں امن شانتی کی شمع روشن رکھنے کی ہر ممکن کوشش میں لگی ہوئی تھی اور کچھ تو قوتیں انسانیت کی حفاظت کے لیے اپنی جان بھی قربان کر رہی تھیں۔ چنانچہ ناول تلاش بہاراں میں کردار کنول کماری ٹھاکر کے ذریعہ ناول نگار نے ان سماجی قوتوں کی طرف اشارہ کیا

---

(۱) تلاش بہاراں، جمیلہ ہاشمی، ص 725

ہے جو اس فرقہ وارانہ طوفانی دور میں اپنی جان کی پروا کیے بغیر انسانیت کی حفاظت کرتے ہوئے لوگوں کو محبت و اخوت اور مذہبی ہم آہنگی کا درس دے رہے تھے غرض کنول ٹھاکر کا کردار ایسی ہی سماجی قوتوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

> ان دنوں بینا نے مجھے بتایا کہ کنول ہر صبح لڑکیوں کو سمجھاتی کہ تم ملک کی صحیح بیٹیاں بنو۔ تم اس زہر کو پھیلنے سے روکو، ہم محض اور صرف انسان ہیں۔ خدا بھی اتنا ہی رحیم و کریم ہے جتنا بھگوان کرشن ہے۔ بھگوان بھی وہی پیغام لائے تھے جو مسلمانوں کے مذہب کی بنیاد ہے۔ مذہب کا رنگ جدا ہے مگر بنیادی اصول وہی ہیں، مورتی اور کعبے میں وہی شکتی براجمان ہے، محبت ہی زندگی ہے، انسان محبت کے مذہب کی تبلیغ کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ پرماتما بھی وہی ہے، جو خدا ہے۔ انسان کی ایک دوسرے محبت اور لگاؤ دراصل انسانیت کا تقاضہ ہے، سب مذہب سچ ہیں۔ جو مذہب نفرت کا پرچار کرے وہ جھوٹا ہے۔ اس میں آتما اور روح کو بچانے کی کوئی اصلیت باقی نہیں رہتی۔(۱)

تقسیم کے بعد میں آئے فسادات اور خوں ریزی کی جھلک ہمیں خدیجہ مستور کے ناول آنگن میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ خدیجہ مستور نے آنگن میں فسادات کے حالات کا ذکر کو بے حد کرب کے ساتھ پیش کیا ہے:

> کہاں ہوگا میرا شکیل؟ بمبئی میں فساد کی خبر سن کر بڑی چچی بلکنے لگیں۔ تمہارا پاکستان بن گیا جمیل، تمہارے ابا کا ملک بھی آزاد ہوگا، پر میرے شکیل کو اب کون لائے گا۔(۲)

---

(۱) تلاش بہاراں، جمیلہ ہاشمی، ص 672

(۲) آنگن، خدیجہ مستور، ص 305

اس طرح ایک اور اقتباس دیکھیے:

> دو تین موٹی موٹی سرخیاں دیکھنے کے بعد ایک خبر پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔مشہور مسلمان کانگریس لیڈر کو کسی شخص نے مار دیا۔نہرو کا اظہار افسوس،مرحوم کے خاندان کے لیے تین ہزار روپیہ کا عطیہ ہندو مسلمان منافرت کی شدید مذمت۔(۱)

ناول آنگن کے کردار بڑے چچا جو کانگریسی لیڈر تھے اور وہ ہمیشہ ہندو مسلمان کے اتحاد کی بات کرتے لیکن ان فرقہ وارانہ فسادات میں انھیں بھی مار دیا جاتا ہے ان کے مرنے کی خبر جب عالیہ اپنی ماں کو سناتی ہے تو اس کی ماں کن لفظوں میں اظہار افسوس کرتی ہے، دیکھیے:

> بڑے چچا کو کسی ہندو نے چپکے سے مار دیا...... ہے ہے، ساری زندگی ہندو کی غلامی کرنے کے بعد یہ بدلہ ملا۔(۲)

ہجرت کے مسائل:

تقسیم اور فسادات کا فوری نتیجہ ہجرت کی صورت میں ظاہر ہوا۔بڑے پیمانے پر مسلمانوں نے ہندوستان سے پاکستان کو ہجرت کی اور غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد پاکستان سے ہندوستان منتقل ہوئی۔اس ہجرت نے دونوں ملکوں کو کئی جہتوں سے متاثر کیا۔اجتماعی اور انفرادی زندگی پر اس کے اثرات کئی اعتبار سے مرتب ہوئے کسی بھی شخص کے لیے ترک وطن ایک بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے لیکن اس مسئلہ میں شدت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب اس کے پیچھے حالات کا جبر کارفرما ہوتا ہے۔وہ سرزمین جس میں کسی شخص نے ہوش سنبھالا ہو اور جہاں اس کی جڑیں پیوستہ ہوں اسے چھوڑ کر جانا اور پھر ایک نئی زمین کو اپنا وطن بنانے کا تصور عام طور پر شدید نفسیاتی دباؤ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

---

(۱) آنگن،خدیجہ مستور،ص324

(۲) آنگن،خدیجہ مستور،ص324

ایک نئی سرزمین اپنے آبائی وطن کی جغرافیائی، معاشرتی اور تہذیبی فضا اور ماحول سے مختلف ہوتی ہے۔ سوائے مذہب کے کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جو ان مہاجروں کا رشتہ اس نئے ماحول سے جوڑے، چنانچہ ترک وطن کر کے پاکستان جانے والے مہاجرین یا پاکستان چھوڑ کر ہندوستان آنے والے مہاجرین اپنا گھر، زمین، رشتے اور ماحول قانونی طور پر ترک کر چکے تھے۔ مگر یہ مہاجر اپنے آبائی وطن سے جذباتی اور ذہنی رشتہ برقرار رکھا۔ غرض ہجرت کے اس کرب کو اور مہاجروں کی نفسیاتی تموج، شکست خوردگی اور آبادی میں ویرانی کے احساس کو موضوع بنایا۔ بے شمار ناول لکھے گئے جیسے اداس نسلیں ''آنگن'' ''زمین'' ''دوگز زمین'' خواب رو وغیرہ یہاں ہمارے مطالعہ میں صرف ناول آنگن ہے جس میں ہجرت کے کرب کو شدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان کے اکثر متوسط گھرانوں کی یہ صورتحال تھی کہ ایک ہی گھر کے کچھ افراد کانگریسی تو کچھ مسلم لیگی بن گئے تھے کچھ لوگ ملک کی آزادی کے بعد سرزمین ہند کی آبیاری کا عظیم مقصد دل میں لیے جی رہے تھے تو کچھ اپنی زمین سے اس قدر بے زار تھے کہ پاکستان کے علاوہ انہیں کوئی اور خطہ زمین امن اور ترقی کا گہوارہ نظر نہیں آتا تھا۔ جیسے ناول آنگن میں بڑے چچا کانگریسی ہیں تو ان کا بیٹا جمیل مسلم لیگی اور بھتیجی مسلم لیگی، جب یہ لوگ اپنے اپنے گھروں میں اپنے نظریات کا اعلان کرتے اور دوسرے کے نظریہ کو مضحکہ خیز ٹھہراتے تو پھر گھر پر ہی ایک محاذ کھل جاتا آپسی دلیلوں اور بحثوں میں یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ ایک اقتباس دیکھیے:

> مگر تمہارے مسلم لیگی ہونے سے کیا فائدہ ہوگا؟'' عالیہ کو دکھ ہو رہا تھا کہ یہاں تو سب پاگل ہیں
>
> ''کچھ نہیں ہوتا۔ بس مسلمان ہوں اس لئے مسلم لیگی ہوں۔ وہ بڑے فخر سے ہنسی۔

بتاشے بٹیں گے بجیا۔
ٹھیک رہے گا نا؟''
چھمی اتنے سے روپے آئے ہیں اور تم کو پورا مہینہ گذارنا ہے، کیوں
خواہ مخواہ یہ حرکتیں کرتی ہو۔عالیہ نے اسے پھر سمجھانا چاہا۔
''واہ پیسے روپے کی کیا بات ہے میں تو اپنی جان تک نچھاور کر دوں
مسلم لیگ پر، پھر ہمارے کافر چچا کو پتا چلے''۔وہ جیسے کچھ یاد کر کے
تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی نیچے چلی گئی''۔ [1]

یہ بات سچ تھی کہ قیام پاکستان کے حوالے سے عوام کے پاس کوئی واضح تصور نہیں تھا بلکہ ایک عجیب کش مکش کی صورت حال تھی،صرف ایک بات واضح تھی کہ پاکستان مسلمانوں کا ملک ہوگا۔اس ملک کے شہری کون کون لوگ ہوں گے،کون کون سے خطے اس کے جغرافیائی حدود میں شامل کیے جائیں گے کیا ہندوستان کے سارے مسلمان پاکستان چلے جائیں گے؟غرض ایسے کئی سوالات تھے جس کے جواب کسی کے پاس نہ تھے۔لیکن سیاست دانوں کو اس کا علم تھا لیکن یہ سیاست داں عوام کو لاعلم رکھنا چاہتے تھے۔کیوں کہ ان کے مفادات کو خطرہ لاحق تھا غرض ایک اقتباس دیکھئے تصور پاکستان کے حوالے سے عوام کے ذہنوں میں کیسی کش مکش تھی۔

''تو کیا سارے مسلمان پاکستان جا کر رہیں گے بڑی چچی نے پوچھا
''واہ اس کی کیا ضرورت پڑے گی؛ جو جہاں ہے رہیں گا۔مگر ہندو
ہمیں رہنے کیوں دیں گے،وہ نہیں کہیں گے کہ اپنے ملک جاؤ''۔
''ان کے ہندو جو ہمارے پاکستان میں ہوں گے ہم ان سے کب
کہیں گے کہ جاؤ''۔
جمیل بھیا کی دلیل بری چچی کی سمجھ میں آ گئی تو انہوں نے اطمینان

---

[1] ۔آنگن،خدیجہ مستور،ص: 103 تا 104

کی سانس لی۔

"ہاں جمیل میاں یہ جانے والے کی بات بری ہے میں بھی یہ گھر نہیں چھوڑ سکتی"۔ (۱)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہجرت کے لیے بخوشی راضی ہونے والے مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ لیکن جنھوں نے پہلے سے ہی ہجرت کا ارادہ کیا تھا وہ تو فوراً اُڑ کر پاکستان پہنچ جانا چاہتے تھے۔ جیسے عالیہ کی ماں جو پاکستان جانے کے خیال سے بے حد خوش ہوتی ہے۔ اقتباس دیکھئے:

"شام سب لوگ خاموش بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ماموں کا خط آ گیا، انہوں نے اماں کو لکھا تھا کہ انہوں نے اپنی خدمات پاکستان کے لیے وقف کر دی ہیں اور وہ جلد ہی جا رہے ہیں"۔ اگر آپ لوگوں کو چلنا ہو تو فوراً جواب دیجئے اور تیار رہئے"

بس ابھی تار دے دو جمیل میاں، ہماری تیاری میں کیا لگے گا ہم تو بس تیار بیٹھے ہیں .... مارے خوشی کے اماں کا منہ سرخ ہو رہا تھا.........مگر آپ کیوں جائیں گی چھوٹی چچی؟ آپ یہاں محفوظ ہیں، میں آپ کے لیے اپنی جان دے دوں گا.........."میں نہ جاؤں تو کیا ہندوؤں کے نگر میں رہوں پاکستان میں اپنوں کی تو حکومت ہوگی"۔(۲)

غرض اس نظریے کے اسیر لوگوں کو تو پاکستان جانا ہی تھا اور موقع ملتے ہی وہ لوگ چلے گئے۔ اس کے علاوہ چھمی اور جمیل جیسے لوگ جنھوں نے ساری زندگی مسلم لیگ کی حمایت کی لیکن، جب فیصلے کا وقت آیا تو ہندوستان میں ہی رہ جانے کو ترجیح دی۔ چھمی کے میاں نے تو اسے صرف اس وجہ سے طلاق

---

(۱) آنگن، خدیجہ مستور، ص:293

(۲) آنگن، خدیجہ مستور، ص:305

دے دیا کہ وہ کراچی جانے کے لیے آمادہ نہیں ہوئی:

> ''بڑی چچی کا خط سامنے پڑا تھا اور وہ نئے حادثے پر ملول بیٹھی تھی۔
> اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ اب چھمی کی زندگی کا کیا بنے گا۔آخر اس
> نے اپنی ساس اور اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان آنے سے انکار کیوں
> کیا۔آخر اسے یہ کیا سوجھی تھی۔جس پاکستان کے لیے وہ ہاتھوں اچھل
> اچھل کر نعرے لگاتی تھی اس پاکستان میں وہ کیوں نہ آئی''۔
>
> اس نے ایک بار پھر خط اُٹھالیا اور اس حصے کو پڑھنے لگی جس میں
> چھمی کے متعلق لکھا تھا...... چھمی نے اپنے میاں کے ساتھ پاکستان
> جانے سے انکار کردیا اور جب اس سے ضد کی تو لڑائی پر آمادہ ہوگئی۔
> جھگڑا یہاں تک بڑھا کہ چھمی نے اپنی ساس کو بال پکڑ کر خوب مارا اور
> اس کی ساس نے اپنے بیٹے سے اسی دم طلاق دلوا کر مع لڑکی کے یہاں
> بھجوادیا''۔ [1]

غرض قبل تقسیم کے سیاست دانوں نے لوگوں کے ذہن و دل میں ایسے ایسے تضادات پیدا کردئے تھے کہ جب فیصلے کی گھڑی آئی تو متعلقہ افراد نے عجیب وغریب اقدامات اٹھائے۔جنھیں پاکستان کے نام سے نفرت تھی وہ پاکستان جا پہنچے،اور جنھیں ہندوستان میں ایک پل رہنا بھی گوارہ نہیں تھا وہ اپنے گھر بار کو کسی صورت میں چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

ابتداء میں ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان جانے والوں میں زیادہ تر مفاد پرست طبقہ شامل تھا جو اعلیٰ ملازمتوں،اونچی تجارتوں اور سرکاری مراعات کے لالچ میں اپنا وطن چھوڑ گیا تھا۔اس کے علاوہ مہاجروں کا دوسرا طبقہ وہ تھا جو ہندوستان میں جاگیریں اور زمینداریاں ہاتھ سے نکل جانے پر

---

[1] آنگن،خدیجہ مستور۔ص:339

اور ہندو مسلم فسادات کے خوفزدہ ہو کر ترکِ وطن کر گیا تھا۔ عالیہ اور اس کی ماں ہندوستان سے ہجرت کر لاہور چلے آئے ہیں، لیکن انہیں یہاں کئی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تین چار دن عالیہ اور اس کی ماں اپنے ماموں کے ساتھ سرکاری کوٹھی میں گذرتے ہیں۔ سارا سارا دن عالیہ کو بیگانگی کا احساس ستانے لگتا ہے اکیلے سارا دن ایک چھوٹے سے کمرے میں بند پڑی رہتی:

> ''لاہور آ کر تین چار دن ماموں کے ساتھ ان کی سرکاری کوٹھی میں گذارنے پڑے وہ بھی اس طرح کہ عالیہ سارا دن ایک چھوٹے سے کمرے میں بند پڑی رہتی۔ وہ ہر وقت یہ سوچتی رہتی کہ اس بیزار کن ماحول میں کس طرح زندگی گذارے گی، ہاں اماں بہت خوش تھیں۔ بھائی اور انگریز بھاوج کے ساتھ رہنے کی بڑی پرانی آرزو اب پوری ہوئی تھی انہوں نے زندگی بھر ساتھ رہنے کے پروگرام بنا لئے تھے اور عالیہ سے خفا تھیں کہ وہ سب سے الگ تھلگ پڑی رہتی ہے اور کچھ نہیں تو اپنی ممانی سے فر فر انگریزی بولنے کی مشق ہی کرے مگر اس نے تو ان چار دنوں میں صرف ایک ہی کام کیا تھا کہ بڑی چچی اور بڑے چچا کو کئی کئی صفحوں کے خط لکھے تھے۔
>
> پانچویں دن ماموں نے ایک چھوٹی سی کوٹھی کا تالا تڑوا کر اماں کو ان کے گھر جانے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے اماں کو چپکے چپکے سمجھایا کہ انگریز عورتیں تو اپنی ماں کے ساتھ بھی رہنا پسند نہیں کرتیں''۔ [1]

جب عالیہ کے ماموں نے اک ہندو کی متروکہ کوٹھی کا تالا توڑ کر ان دونوں کو بسا دیتے تو عالیہ کی ماں تو بہت خوش ہوتی ہے لیکن عالیہ کے دن بڑے بے کیف گذرنے لگتے ہیں دور اپنوں کی یادیں اس کو ڈسنے لگتے ہیں، یہ حال تمام مہاجروں کا تھا گھر گھر مہاجروں کی مدد کے لیے امدادی کمیٹیاں چکر لگاتی

---

[1] ۔آنگن، خدیجہ مستور، ص: ۳۱۸

پھرتیں تھیں غرض مہاجروں کے اس تکلیف اور اذیت ناک حالات کی تصویر پر کشی خدیجہ مستور نے بڑے موٴثر انداز میں کی ہے، اقتباس دیکھیے:

''دن بڑے بے کیفی سے گذر رہے تھے بیکار بیٹھے بیٹھے اُکتا گئی تھی۔اس کے خطوں کے جواب بھی نہ آئے تھے۔کون کہتا ہے کہ دورہ کریادیں بہت اذیت ناک ہوجاتی ہیں، اسے تو سب بھول گئے۔ یادیں صرف اس کے لیے اذیت ناک ہورہی ہیں۔شامیں عذاب کی طرح کٹتیں، امدادی کمیٹیاں گھر گھر چکر لگاتی پھرتیں، اپنے مہاجر بھائیوں کی مدد کرو، قافلے آرہے ہیں مدد کرو، اور اماں بڑی رقّت سے بتاتیں کہ ہم تو خود مہاجر ہیں۔لوگ چلے جاتے مگر عالیہ کا جی چاہتا کہ وہ اماں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر سب کچھ انہیں دے دے۔

[1]

پاکستان میں جہاں ایک طرف غریب مہاجروں کی مدد کی جاتی تھی دوسری طرف غریب مہاجروں پر پولیس والوں کا ظلم بھی ہوتا۔اس صورت حال کی تصویر کشی خدیجہ مستور نے اس طرح کی ہے:

''اچانک پھاٹک زور سے کھلا اور کوئی بے تحاشہ بھاگتا ہوا اندر آگیا

''کون''؟اس نے گھبرا کر پوچھا۔

بھاگنے والا ایک لمحے کو رک گیا۔

آپ میری ماں ہیں، میری بہن ہیں مجھے چھپ جانے دیجئے، میں غریب مہاجر ہوں، وہ ظالم پولیس مجھے خواہ مخواہ پکڑ رہی ہے، میں ابھی چلا جاؤں گا''۔آدمی دوڑ کر بیچ کے پیچھے چھپ گیا۔

---

[1] ۔آنگن،خدیجہ مستور۔ص:319

عالیہ خوف کے مارے کرسی پر جم کر رہ گئی اس نے اماں کو آواز دینا چاہی مگر ساری جان کا زور لگانے کے بعد بھی وہ ہوں تک نہ کر سکی۔
اسی لمحے اماں نے آ کر برآمدے کا بلب روشن کر دیا۔ ''کھانا کھا لو آ کر''۔اماں کے لہجے میں اب تک تختی تھی۔
روشنی میں اس نے ہر طرف دیکھا پھر بھی اس نے کچھ نہ بولا گیا۔
ماں پھر چلی گئیں اور وہ ہاتھ بڑھا کر رہ گئی۔اس نے اُٹھ کر اندر بھاگنا چاہا تو پیروں نے جواب دے دیا''۔ ۱؎

کسانوں اور مزدوروں کے مسائل:

اردو ناول نگاری کے ہر دور میں کسانوں اور مزدوروں کے مسائل کو خاص اہمیت دی گئی ہے، چنانچہ 1960ء کے بعد بھی ہمیں چند ایسے ناول ملتے ہیں جن میں مزدوروں کے مسائل اور ان پر ہونے والے ظلم و ستم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔جن میں ایوان غزل، تلاش بہاراں، ایک چادر میلی سی ،وغیرہ اہم ہیں۔غرض ناول ''ایوان غزل'' سے ایک اقتباس دیکھئے جس میں ایک مزدور غلام رسول کے حوالے سے مزدوروں کی صورتحال پر روشنی ڈالی گئی ہے:

''احمد حسین تو یہ سمجھتے تھے کہ اب یہ بلا زندگی بھر کے لیے گلے پڑ جائے گی مگر واحد حسین نے بڑی ہمدردی سے کام لے کر فاطمہ بیگم کی ماں کو کچھ ماہانہ مقرر کر دیا کہ لاوارث بے سہارا عورتوں کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے اور پھر بارہ تیرہ برس کی فاطمہ بیگم کا عقد احمد حسین کے ایک کھیت مزدور غلام رسول سے کر دیا۔ یہ شادی انہوں نے اپنے خرچے سے کی تھی۔مگر اتنے بڑے جاگیردار کی منہ بولی بہن کو بیاہنے کے لیے غلام رسول کے باپ کو کچھ پیسے کی ضرورت پڑی

۱؎ ۔آنگن،خدیجہ مستور،ص:333

اس لیے اس نے احمد حسین کے ہاں اپنے بیٹے کو پانچ سو روپے کے عوض رہن رکھ دیا۔

اس وقت گاؤں میں کھیت مزدوروں کو بڑی آسانی سے رہن رکھا جاتا تھا۔مقررہ معیاد تک مزدور دن رات مالک کا کام کرتا تھا۔اس میں اس کا کھانا اور کپڑا شامل نہیں ہوتا ۔اس دوران اسے مالک کے پیسے لوٹا دینے ہوتے ۔ ورنہ رہن کی معیاد اور بڑھ جاتی تھی ۔اور کوئی مزدور معاہدے کی خلاف ورزی کر کے کہیں بھاگ جاتا تو گاؤں میں اس کی کوئی عزت باقی نہ رہتی کیونکہ انسان کی زبان ہی تو سب سے زیادہ قابل بھروسہ شئے ہے ۔ جو شخص اپنی زبان سے پھر جائے اسے کون عزت دے گا، یہ بھی گاؤں کا ایسا قانون تھا جو دوسرے قوانین کی طرح ہر ایک کو قبول کرنا پڑتا ۔اس لیے غلام رسول بھی دن بھر واحد حسین کے کھیتوں میں کام کرتا ۔وہاں کام نہ ہوتا تو اجالا بیگم ڈیوڑھی میں دوسرے کاموں میں لگوا دیتیں ۔لکڑیاں پھوڑنا ۔سرکار کے پاؤں دبانا بیگم صاحبہ کے کپڑے دھونا ، کوڑی پھیرا بازار کا کرنا ۔ یہ اور دوسرے سارے چھوٹے موٹے کام تھے ۔ فاطمہ بیگم بھی چلی جائیں تو ایک ماما اور ایک چھوکری کو اجالا بیگم اور نکال دیتیں"۔ [1]

اسی طرح ناول تلاش بہاراں سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے ۔ جس میں موہن نام ایک کردار مزدوروں کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کس طرح کر رہا ہے:

"شاہ جہاں کے وقت تو بہت پہلے گذر گئے اور مزدوروں پر تو ہر دور میں ظلم ہوتا رہا ہے تاج کی عظمت اس لیے کم نہیں ہوسکتی کہ اسے ایک خود مختار بادشاہ نے بنوایا تھا۔اور اس پر بے انداز روپیہ خرچ ہوا ہے"۔ میں

---

[1] ۔ایوانِ غزل، جیلانی بانو۔ص:32

نے جوش سے کہا۔

موہن زور سے ہنس پڑا بولا ”یہی تو کمی ہے دماغ میں خیالات ہوں
ہر شئے کو ایک خاص سطح پر لاکر دیکھنے سے سارا لطف جاتا رہتا ہے“۔
ارے بھائی مزدوروں کو کون پوچھتا ہے ان پر ظلم نہ کیا جائے تو دنیا کا
نظام درہم ہو جائے“۔(۱)

راجندر سنگھ بیدی کا ناول ”ایک چادر میلی سی“ بھی مزدور طبقہ کے مسائل کی عکاسی کرتا ہے جہاں عورت اور مردوں رات دن محنت کرنے پر بھی زندگی خوشی سے نہیں گذار پاتے اور اپنی چھوٹی چھوٹی مسرتیں اور سہولیات حاصل کرنے کے لیے وہ چور دروازوں سے جھانکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس ناول کے دو کردار حضور سنگھ اور اُس کی بیوی جنداں دوا یسے ہی مجبور اور قابل رحم انسان ہیں جو اپنے بیٹے تلّو کے سہارے عمر کے آخری دن گذار رہے ہیں۔تلو کے کا ذریعہ معاش یکہ بانی ہے۔اور تلو کے ہر روز شراب نوشی میں بتلا رہتا ہے اس کی بیوی رآنو ہر دن اپنے شوہر کی شراب نوشی کے خلاف احتجاج کرتی ہے لیکن نتیجہ میں صرف رانو کو شوہر کے ہاتھ سے مار کھانے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ رانو پر اُس وقت مزید مصیبتیں ٹوٹ پڑتی ہیں جب اس کے شوہر تلو کے کا قتل ہوتا ہے،شوہر کے قتل کے بعد رانو معاشی پریشانی کا شکار ہو جاتی ہے۔

عورتوں کی سماجی حیثیت اور ان کے مسائل:۔

اردو ناول نگاری میں ابتداء سے ہی خواتین کی سماجی حیثیت اور ان کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے اور معاشرے میں موجود عورتوں کے مختلف طبقات اور ان کے مسائل،ان کی سماجی و معاشی حیثیت کو الگ الگ پہلو سے دیکھا اور اسے پیش کیا ہے ان میں طبقہ اشرافیہ اور جاگیردارانہ ماحول و معاشرت کی

(۱) تلاش بہاراں۔جمیلہ ہاشمی۔ص:165 - 164

عورتوں کی زندگی بھی ہے، نچلے طبقے کی عورتوں کے مسائل بھی ہیں۔طوائف عورتوں کی بے بسی کی کہانی بھی ہے۔غرض 1960ء کے بعد بھی اردو ناولوں میں خواتین کے مسائل ایک اہم موضوع رہا ہے جیسے، ہمارے معاشرے میں ایک عرصہ تک لڑکی کا پیدا ہونا منحوس سمجھا جاتا رہا ہے یہاں تک کہ کوئی عورت اگر لڑکی جنم دیتی تو اس کے ساتھ نہایت بے رحمی کا سلوک کیا جاتا تھا چنانچہ ناول ''ایوان غزل'' سے ایک اقتباس دیکھئے جس میں لڑکی کی پیدائش کے تعلق سے اظہار خیال کیا جارہا ہے''۔

> ''ہماری ساس تو پہلے جتا دیتی تھیں کہ دیکھو دلہن مجھے پوتا چاہئے۔ اگر چھوکری ہوئی تو میکے میں پھنکوادوں گی۔میں ساس کی نصیحت سنی تھی اور اس پر عمل کرتی۔بتول کی ساس کہہ رہی تھیں۔
>
> '' کیسے؟ بشیر نے حیرانی سے پوچھا تو اللہ کے اختیار میں ہے خالہ جان کے وہ بیٹا دے یا بیٹی۔اور پھر ہماری بتول بیگم کے تو ماشاءاللہ پہلے سے دو بیٹے موجود ہیں۔
>
> ''اس سے کیا ہوتا ہے''؟ وہ بگڑ کے بولیں۔''مرشدوں کی بیٹی سے کوئی شادی نہیں کرتا۔بیٹا ہو تو سب اس کے ہاتھ چومتے ہیں عزت کرتے ہیں۔مجھے تو تیرا بھی پوتا ہی چاہئے۔میں دلہن بیگم کو جتارہی ہوں''۔
>
> ''انہوں نے انگلی اٹھا کر بڑی قہر آلود نظروں سے بتول بیگم کو گھورا اور باہر چلی گئیں۔بشیر بیگم کو یوں لگا جیسے بتول کی ساس کوئی جادوگرنی ہیں جو شہزادیوں کو کیتا بنا دیتی ہے اور شہزادے اس کے سحر سے پتھر بن جاتے ہیں۔ [1]

اسی طرح جب ساس کے خلاف توقع بتول بیگم کو لڑکی ہوتی ہے تو دیکھئے بتول کی ساس اور اس کا

---

[1] ۔ایوان غزل۔جیلانی بانو۔ص:44

شوہر ہمایوں لڑکی پیدا ہونے پر کس طرح ماتم کرتے ہیں:

''ہانپتی کانپتی پسینے میں شرابور اس کی بڑی سالی بشیر بیگم کمرے سے باہر نکلی۔ ''مبارک ہو ہمایوں میاں۔ آپ کی صاحبزادی تو شیریں سے بھی زیادہ خوبصورت ہے'' اور ہمایوں کے کلیجے پر کسی نے فرہاد کا تیشہ کھینچ مارا۔ اس نے یوں سالی کو دیکھ جیسے اس نے ایک لاکھ کی تھیلی بے ایمانی سے چھپالی ہو۔ پوتی مبارک ہو۔ پوتی مبارک ہو۔ یہ خبر ''الف لیلیٰ'' میں یوں پھیلی جیسے ایک بھیانک آندھی چراغ بجھاتی چلے۔ باہر نوبت نقاروں والوں نے پیدائش کی خبر تو بغیر سوچے سمجھے تڑا تڑ نوبت پر ہاتھ مارنا شروع کر دیئے۔

''اوئی یہ میری موت پر نقارے کیوں بج رہے ہیں؟''

ہمایوں کی ماں بیچ آنگن میں دل تھام کر بیٹھ گئی۔ ''الف لیلیٰ'' میں جب بیٹی پیدا ہوئی تو اپنے ساتھ ستر بلائیں لاتی ہے''۔

''خالہ جان داماد مبارک'' بشیر بیگم نے اقبالی مجرموں کے انداز میں خالہ جان کو داماد کے خوش آئیند تصور سے خوش کرنا چاہا۔ پھر بھیانک خاموشی چھا گئی۔

ہمایوں کی بہن جلدی جلدی ہجڑوں کو چپ کرانے لگی۔ اور دیوار کے اس پار سے قہقہے بلند ہونے لگے جس طرف ہمایوں کی سوتیلی مائیں رہتی تھیں۔

خانقاہ کے اندھیرے کمرے میں دونوں ہاتھوں میں سر کو تھامے مسکین شاہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ اس لڑکی کا بر کیسے

ملے گا۔مرشدوں کی بیٹی کو بیاہنا بڑا مشکل کام تھا۔[1]

معاشرے میں بعض جگہوں پر عورت کو صرف ضرورت کی چیز سمجھا جاتا جو عورتوں کے ساتھ یہ ایک زیادتی اور ظلم ہے اور جتنی خوبصورت ہوگی معاشرے میں اس کی اتنی عزت وقدر کی جائے گی جب اسی میں دلکشی ختم ہوجاتی ہے تو کسی کی توجہ اس کی طرف مبذول نہیں ہوتی۔ چنانچہ عورتوں کے تعلق سے معاشرے میں رائج اس خیال کو علیم مسرور، اپنے ''ناول'' ''بہت دیر کردی'' میں سلطانہ اور داؤد کی گفتگو کے ذریعہ یوں پیش کیا ہے:

''تم واقعی بہت خوبصورت ہو......!''

'' یہ بات مجھ سے بہت مرد کہہ چکے ہیں اس لیے اب اچھے نہیں لگتی''!۔

''حُسن اس دنیا کی سب سے پرانی چیز ہے اور حسن کی تعریف اس دنیا کی سب سے پرانی رسم......!''

''یہ رسم میرے لیے بہت بار نبھائی جا چکی ہے اس لیے اب میرے لیے اس میں کوئی دلکشی نہیں''۔

''لیکن اس دنیا میں ایسی بے شمار لڑکیاں ہیں جو اس بات کی منتظر رہتی ہیں کہ کوئی مرد اُن سے کہے کہ تم بہت خوبصورت ہو اور شاید وہی دن ان کی زندگی کا بہترین دن ہوتا ہے''۔

''ہاں یہ رسم مرد بڑے جوش وخروش سے نبھاتے آئے ہیں!''

''بتاؤ! جب پہلے مرد نے تم سے کہا تھا کہ تم بہت خوبصورت ہو تو تمہیں کیسا لگا تھا؟''

''میں نے اپنی قیمت بڑھا دی تھی!''

---

[1] ۔ایوان غزل ۔جیلانی بانو۔ص:48

''سچ ہے۔ جب عورت خوبصورت لگتی ہے تو بہت قیمتی ہوجاتی ہے!''

''میرا خیال ہے کہ جب مرد کو عورت کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ خواہ مخواہ خوبصورت لگنے لگتی ہے!''۔

''عورت ہی کیوں، ہر چیز اپنی ضرورت کے وقت بڑی خوبصورت دکھائی دیتی ہے!''اس لیے جب عورت کی دلکشی ختم ہوجاتی ہے تو اٹھا کر پھینک دی جاتی ہو!''

''عورت کی دلکشی کبھی ختم نہیں ہوتی اس لیے کہ ہر مرد کو عورت کی ضرورت بار بار پڑتی ہے۔ وہ کبھی اچھی نہیں لگتی ہوگی تو کبھی بہت اچھی لگتی ہوگی؟''۔ [1]

سماج میں خواتین کو اونچا مقام و مرتبہ دینے کے لیے ہر دور میں جدوجہد کی گئی اور خواتین کو سماج میں اونچا درجہ ملا بھی لیکن آج میں بعض اوقات عورت کو صرف ایک ضرورت کی چیز سمجھا جاتا ہے جو ایک طرح سے خواتین برادری کے ساتھ ناانصافی ہے چنانچہ علیم مسرور کی ناول ''بہت دیر کردی'' سے ایک اقتباس دیکھئے جس میں عورت کو شراب کی بوتل سے تشبیہ دی گئی ہے:

''اس نے مسودہ ٹیبل پر رکھ دیا اور اٹھ کر آہستہ سے ساری کا لٹکتا ہوا پلو اٹھا کر سلطانہ کا سینہ ڈھانک دیا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ کر ناول پڑھنے لگا۔ کچھ دور آگے چل کر لکھا تھا۔

''عورت شراب کی بوتل ہے۔ ایک مرد جب شراب پی لیتا ہے تو بوتل کو پھینک کر بہکتا ہے۔ ہنگامے مچاتا ہے دنیا جانتی ہے کہ اس نے شراب پی ہے لیکن اسے کچھ نہیں کہتی۔ اس کی باتوں میں لذت لیتی ہے

---

[1] ۔ بہت دیر کردی۔ علیم مسرور۔ صفحہ: 18

اس سے کھیلتی ہے ہنستی ہے اور چلی جاتی ہے۔شراب کی خالی بوتل کچھ نہیں کہتی خاموش رہتی ہے دوسرا جب اس خالی بوتل کو دیکھتا ہے تو چیختا ہے اور شراب کی خالی بوتل یہاں کہاں سے آئی" وہ اسے ٹھوکر مار کر یا تو کنارے کر دیتا ہے یا ہاتھ سے اٹھا کر کوڑے خانے میں ڈال آتا ہے اور اپنا ہاتھ دھولیتا ہے شراب کی خالی بوتل پھر بھی چپ رہتی ہے۔ کچھ نہیں کہتی"۔ [1]

سماج میں ایک عورت بیک وقت ماں، بیٹی، بہن، بیوی ہے پھر بھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عورت صرف مرد کی جنسی بھوک کی تسکین کے لیے دنیا میں پیدا کی گئی ہے اس لیے مرد ایک عورت کو بیک وقت بیوی بھی بناتا ہے اور داشتہ بھی چنانچہ کسی مرد نے آج تک عورت کو اُس کا ہی مقام ومرتبہ نہیں دیا۔غرض اقتباس دیکھئے:

"ہاں تو ماں، بیٹی، بہن کے علاوہ کچھ اور قابل احترام رشتوں نے جنم لیا۔اس کے بعد ایک مرد کے لیے دنیا کی ہر عورت زمین کے دستر خوان پر اس لیے چن دی گئی کہ کوئی مرد ان سے اپنی جنسی بھوک کی تسکین کر سکے یا کوئی عورت اپنی جنسی اشتہا کی تسلی کے لیے کسی مرد کے آغوش میں چلی جائے۔

بس مسئلے کا الجھاؤ یہیں سے شروع ہوتا ہے مرد نے بیک وقت عورت کو بیوی بھی بنایا اور داشتہ بھی۔ نہ تو مرد نے عورت کو اس کا صحیح مقام بتایا۔نہ ہی عورت نے اپنے صحیح کو پہچانا"۔ [2]

سماج میں عورت کے تعلق سے آج بھی یہ بدگمانیاں ہیں کہ عورت صرف ایک بکاؤ مال ہے گھر ہو یا

---

[1] ۔بہت دیر کر دی۔علیم مسرور۔ص:102

[2] ۔بہت دیر کر دی۔علیم مسرور۔ص:225

بازار کبھی خود بک جاتی ہے تو تو کہیں بیچ ڈالی جاتی ہے غرض علیم مسرور نے اپنے ناول میں عورت کے تعلق سے اس بدگمانی کو مؤثر انداز میں بیان کیا ہے:

"مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کی ہر عورت ایک بکاؤ مال ہے وہ چاہے
گھر میں بکے یا بازار میں وہ کہیں بات کے عوض بکتی ہے کہیں پیسوں کے
بدلے کہیں خود بک جاتی ہے اور کہیں بیچ ڈالی جاتی ہے!"
"بکی ہوئی چیز بھی بیچ ڈالی جاتی ہے؟"
"ہاں......!"
"وہ کیوں؟"
"خریدار خرید کر دوکان ہی پر چھوڑ دے اور نہ لے جائے تو دوکاندار
کب تک اسے اپنے پاس رکھے گا!"
"تمہاری باتوں سے بدگمانی جھلکتی ہے"
"جہاں تک میرا سوال ہے میں کسی سے بدگمان نہیں، لیکن جب
عورت کا سوال آتا ہے تو میں ہر مرد سے بدگمان ہونے لگتی ہوں!" [1]

اس سماج میں عورت کے استحصال کی داستان کرشن چندر کے ناول "ایک عورت ہزار دیوانے" میں بھی ملتی ہے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے جس میں ناول کی ہیروئن لاچی اور ایک ضمنی کردار دل آرا کے بیچ گفتگو ہو رہی ہے جس میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ سماج میں عورتوں کو کس قدر بکاؤ مال سمجھا گیا ہے:

"میں جب سات سال کی تھی تو پہلی بار بیچی گئی تھی۔ خود میرے ماں
باپ نے مجھے آٹھ سو روپوں میں بیچ دیا تھا۔ تم یقین نہیں کروگی"۔
"کر سکتی ہوں"۔ لاچی بولی "ہمارے یہاں یہی ہوتا ہے، خود مجھ

---

[1] ۔بہت دیر کردی۔علیم مسرور۔ص:275

سے ہو چکا ہے'' سات سال سے سترہ سال تک میں دس بار بیچی گئی ہوں۔ہر سال میرا باپ بدل جاتا تھا۔ہر سال میرا ایک نیا خریدار مجھے خریدا کرتا تھا ہر سال میری قیمت بڑھ جاتی تھی۔کیونکہ میں بہت خوبصورت ہوں نا......؟!''

''ہاں تم بہت خوبصورت ہو'' لاچی نے کہا، بالکل گڑیا معلوم ہوتی ہو''۔دل آرا بولی،''جب میں چھوٹی تھی تو میرے خریدار میرے ماں باپ بن جاتے تھے جب میں بڑی ہوئی تو وہی میرے شوہر ہونے لگے۔جب میں فلم میں آئی تو کوئی ماں نہ رہی، کوئی باپ نہ رہا۔کوئی شوہر نہ رہا، سب سب دلال بن گئے۔کیا یہ دھوکا نہیں؟ اور اخلاق کیا ہے اس کا مجھے پتہ نہیں''۔[1]

کرشن چندر نے اپنے ناول ''ایک عورت ہزار دیوانے'' میں عورت کے استعمال کی کہانی بہت ہی کرب کے ساتھ بیان کی ہے ناول کی ہیروئن لاچی کو اُس کے ماں باپ اپنے قبیلہ کے سردار کو ساڑھے تین سو میں بیچ ڈالتے ہیں ناول سے ایک اقتباس دیکھئے جس میں لاچی کا عصمت کس طرح سودا کیا جارہا ہے:

''دمارو پھر چلّایا''

''میرا دف لے لو چھانجھر لے لو!'' نامن کی بیوی بولی۔

دو مارو حقارت سے ہنسا۔

''میرا خنجر لے لو جس پر چاندی کی مٹھی ہے''

''مارو شرارت سے ہنسا۔بولا:

''میں تو سونے کے بالوں والی لاچی لوں گا''

---

[1] ۔ایک عورت ہزار دیوانے، کرشن چندر،ص:148

''صرف پچاس روپے میں؟ ناممکن!'' مامن نے سر ہلا کے کہا۔

سنو دمارو نے جیب سے پچاس روپے اور نکالے اور بولا۔

''وہ پچاس روپے معاف کیے پچاس اور دیئے اب بولو''؟

سو روپے بہت ہوئے ہیں۔مامن کا جی ہلچا گیا۔اُس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا بیوی نے انکار میں سر ہلا دیا۔مامن نے دمارو کو دیکھ کر انکار میں سر ہلا دیا۔

''ایک سو پچاس!''

دمارو نے پچاس اور بڑھا دیئے۔

دوسو روپے اب مامن کے سامنے پڑے تھے اُس کے ہاتھ کی انگلیاں بے تاب ہونے لگیں اُس نے بہت بے چینی اور مضطرب نگاہوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا،لیکن اس کی بیوی نے پھر انکار میں سر ہلا دیا۔

''ڈھائی سو!'' دمارو غصّے میں چلایا۔آج تو لاچی کو لے کر ہی جاؤں گا''۔

ڈھائی سو کی رقم دیکھ کر مامن سے نہ رہا گیا،اس نے ہاتھ آگے بڑھا ہی دیا۔لیکن اُس کی بیوی نے پھر اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔

دمارو نے جیب ٹٹول کر سو کا آخری نوٹ نکالا۔سو کا ہرا نوٹ دیکھ کر مامن اور اس کی بیوی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔دمارو اس کے قبیلے کا سردار تھا۔لیکن یہ معلوم نہ تھا،اتنا امیر ہے۔وہ تو بظاہر بالکل انہیں کی طرح دکھائی دیتا تھا مامن کی بیوی نے ہتھیار ڈال دیئے۔مامن نے ساڑھے تین سو کے نوٹ اُٹھا کے اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈال لیے۔

اتنے میں پیچھے سے کسی نے کہا

''ٹھہرو..........؟''

گھوم کے دیکھا تو لاچی کا باپ رگی کھڑا تھا،

اس کے تابنا رنگ رخساروں پر ایک معنی خیز شرارت جھلک رہی تھی۔

اپنی طرف سب کی متوجہ دیکھ کر بولا

''سودا تو اچھا ہوا ہے کولی!'' رگی نے طنز آمیز نگاہوں سے اپنی پہلی بیوی کی طرف دیکھ کر کہا'' آپ اپنی بیوی کو ستر روپے میں ہار گیا۔ بیوی نے اپنی بیٹی کے ساڑھے تین سو روپے وصول کرائے''۔

''پھر..........؟!''

مامن کی بیوی زور سے چلائی۔

اس کی آواز میں ایک خطرناک چیلنج تھا۔

رگی نے بڑی نرمی سے کہا۔

''میں لاچی کا باپ ہوں ٹھیک ہے میں نے اس کی پرورش نہیں کی۔ مگر اس کی رگوں میں خون تو میرا ہے!''

''کون کہہ سکتا ہے؟''

مامن کی بیوی زور سے ہنسی۔

رگی نے سُنی ان سُنی کر کے کہا

''مجھے میرا حصہ ملنا چاہئے''۔

''لے بیس روپے تو بھی لے!''

دمارو نے اپنی جیب سے بیس روپے دیتے ہوئے کہا۔ وہ لاچی کے معاملے میں کسی طرح کا جھگڑا نہیں چاہتا تھا۔ رگی نے بیس روپے اپنی

جیب میں ڈالتے ہوئے دمارو کی طرف شک کی نظروں سے دیکھا۔

بولا۔

"اتنے روپے تو خانہ بدوشوں کی ملکہ کے پاس بھی نہ ہوں گے تمہیں

کہاں سے ملے؟"

"جعلی نہیں ہیں" دمارو نے جواب میں بڑی نخوت و کہا "جسے جی

چاہے دکھا کے تسلی کر لے زیادہ پوچھنے کا تمہیں کوئی حق ہے؟"

"نہیں سردار......!"

رگی نے یکا یک بری حلیمی سے کہا۔

"تو سودا پکا......؟"

"دمارو نے ایک بار پھر سب سے پوچھا۔

"پکا......؟"

سب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ [1]

مذکورہ اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سماج میں آج بھی کہیں نہ کہیں عورت کو بکاؤ مال سمجھا جاتا ہے مانا کہ وہ لڑکی ایک خانہ بدوش قبیلہ سے تعلق رکھتی ہے مجبور اور بے بس ہے لیکن ہے تو عورت ہی سماج میں اس کو اتنی ہی عزت ملنا چاہیئے جتنی دوسری طبقہ کی عورتوں کو ملتی ہے۔غرض جب لاچی کا سودا پکا ہو جاتا ہے تو وہ گھر آ کر اپنی ماں سے پوچھتی ہے کہ مجھے کسی نے بیچا ہے اس وقت لاچی کی ماں کیا کہتی ہے دیکھئے:

"کس نے بیچا ہے مجھے؟"

لاچی نے ہاتھ میں خنجر اُٹھا کے پوچھا۔

"رگی" ماسن دمارو، تینوں چپ رہے۔رگی نے اپنے پاؤں اِدھر

---

[1] ۔ایک عورت ہزار دیوانے ۔کرشن چندر۔ص:25 تا 27

اُدھر کیے مامن نے اپنی نگاہیں پھیر لیں، دمارو البتہ بالکل مبہوت ہو کر

لاچی کی طرف دیکھتا رہا لیکن تینوں میں سے کوئی نہ بولا

لاچی کی ماں بولی۔

''عورت، گھوڑی اور زمین ہمیشہ بکتی ہے، تجھے سردار دمارو نے خرید

لیا ہے''۔ [1]

جمیلہ ہاشمی کا ناول ''تلاش بہاراں'' بھی عورتوں کی سماجی حیثیت اور ان کے مسائل کی عکاسی کرتا ہے اس ناول میں کنول کماری کے مرکزی کردار میں عورت کا ایک آدرش روپ ملتا ہے جو معاشرے میں عورت کے لیے مساوی اور استحصال سے ماورا حیثیت حاصل کرنے کی خواہش کا غماز ہے عورتوں کی مظلومیت ان کے استحصال، ان کی بیکسی اور مجبوری کا مصنفہ کو شدت سے احساس ہے۔ وہ اس ناول میں ان حالات میں اصلاح کے لیے خواتین کو خود اپنی صلاحیتوں قابلیتوں اور اپنے اندر موجود جوہر کو جلا دینے کی تلقین کرتی ہیں۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ عورتیں کسی معاملے میں مردوں سے کم نہیں ہیں۔ بشرطیکہ وہ اپنے اندر چھپے جوہر اور اپنی صلاحیتوں کو پہچان لیں۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت اس ناول میں ایک مثالی کردار کنول کماری ٹھاکر کو سنوارا اور نکھارا ہے۔ اس کردار میں صلاحیت، قابلیت، قوم پرست، مصلح، انصاف پرور، دردمند، بے لوث، باہمت بے خوف غرض یہ سب کچھ خوبیاں اس کردار میں موجود ہیں۔

اس ناول میں تحریک آزادی نسواں کے مسئلے پر بھی مختلف نقطہ ہائے نظر کا اظہار ملتا ہے ناول میں ایک جگہ ہندوستانی عورتوں کی مظلومیت کی صورت حال کی عکاسی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''عورت کی عزت! کیا کہتی ہے پگلی، جذباتی کون سی عزت کا نام

لیتی ہے، ہندوستان میں عورت ننگی ہے عورت کی عزت اور آن خاک

---

[1]۔ ایک عورت ہزار دیوانے۔ کرشن چندر۔ ص:29

میں مل چکی ہے عورت کہیں نہیں ہے، صرف گوشت کے رنگوں کے
ہیولے ہیں ۔عورت کیامذاق ہے یہ نام؟''۔ ۱

اسی طرح ایک جگہ جمیلہ ہاشمی نے عورت پر مرد کی زیادتی کو اس طرح بیان کیا ہے:

''کم ازکم ہر دور میں مرد عورتوں سے یہی توقع رکھتے ہیں نسائیت یہی ہے کہ خطرے کے ذکر پر عورتیں ذرد ہو جائیں گھبرا کر مردوں سے مدد کی درخواست کریں ۔اور پھر مرد اپنی مردانگی اپنی برتری پر فخر محسوس کر کے سینہ پھلا کر چلے اور خدا کی بہترین مخلوق ہونے کا جو دعویٰ وہ صدیوں سے کرتا آیا ہے اس پر اور زیادہ پختگی سے یقین کرے''۔ (۲)

جمیلہ ہاشمی نے جہاں اس ناول میں عورتوں پر مرد کی زیادتی کی طرف توجہ دلائی ہے وہیں وہ مشرقی معاشرت میں عورتوں کی حیثیت اوران کے سماجی کردار کو پیش کرتے ہوئے مرد اور عورت کی ذمہ داریوں، ان کے حقوق اور آپسی تعلقات کی جانب اشارے کیے ہیں۔اور یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ مرد اور عورت دونوں معاشرے کے لیے لازم وملزوم ہیں، اور دونوں کی فلاح و بقا کا راز ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک اور تعاون میں ہی پوشیدہ ہے اقتباس دیکھئے:

''پر ماتما نے عورت کو گھر سدھارنے اور زندگی کے ان سوتوں کی حفاظت کے لیے بنایا ہے جو عام حالات میں مرد کو ان پھیلے ہوئے سمندروں پر آگے ہی آگے بڑھاتیں پھر ایسے وقت جب سیاسی ریشہ دوانیاں اور گتھیاں الجھ گئی ہوں عورت کیا کر سکتی ہے، عورت کو ہر قدم پر مرد کی ضرورت ہے اور مرد کو عورت کی، اس کام کو کوئی بھی بنا ایک دوسرے کے نہیں کر سکتا''۔(۳)

---

۱ ۔تلاش بہاراں ۔جمیلہ ہاشمی ۔ص:725

۲ ۔تلاش بہاراں ۔جمیلہ ہاشمی ۔ص:23

(۳)۔تلاش بہاراں ۔جمیلہ ہاشمی ۔ص:605

جمیلہ ہاشمی نے ناول میں ایک طرف ہندوستانی عورت مظلومیت، بے بسی، اور قربانیوں تصویر کشی کی ہے اور ان حالات کو تبدیل کرنے کا خواب دیکھا ہے تو دوسری طرف وہ مغربی مما لک کی تحریک آزادی نسواں اور اس کے نظریات سے مغلوب نہیں ہیں۔ بلکہ اسے آزادی کے پُر فریب دھوکے سے تشبیہ دی ہے، کنول کماری مغربیت زدہ اپنے بھائی کو ایک خط میں لکھتی ہیں:

''تمہارے یہاں ہندوستان میں عورت ایک اندھی، بہری گونگی، بجلی ہے۔ جو کبھی کبھار گرتی ہے۔ میں تمہیں بتاؤں، تم مغرب کی روشنیوں میں پھنس گئے تھے۔تم بھٹک گئے تھے۔اپنے آدرش اور اپنے راستے اب بھی سچے ہیں۔ہم اب زندگی کے نزدیک ہیں بدیسی عورت چمک سکتی ہے نشہ بن کر گر سکتی ہے وہ اندھیارے کو روشن نہیں کر سکتی''۔ [1]

اس طرح کنول کماری ٹھاکر کے روپ میں جمیلہ ہاشمی نے مشرق کی روشن روایتوں کو نئے سرے سے زندہ کرنے اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کے عزم کی طرف اشارے بھی کیے ہیں جس میں عورت سرخ رو اور باوقار زندگی جی سکے۔اسی طرح ایک اور اقتباس دیکھیے، جس میں مصنفہ کے عزم کی مزید وضاحت ہوتی ہے:

''اور دیکھو تو سہی میں ان دنوں جس شاہراہ پر ہوں وہاں تمہاری غیر ملکی بیوی کب ہے؟ تم دھرم بھگوان اور خاندان کو بکھیر چکے ہو، میں نے پریشان زندگی کو پھر سے اکٹھا کرنے اور ریتیوں کو بلند کرنے، شعور کی اندھی راہوں سے بھاری پتھر ہٹانے کا راز دریافت کیا ہے۔میری زندگی کا آخر لمحہ میرے خون کا آخری خطرہ مشرق کی بھولی بسری روایتوں

---

[1] ۔تلاش بہاراں۔جمیلہ ہاشمی۔ص:730

کو دوبارہ زندہ کرنے اور انہیں قابل عمل بنانے میں صرف ہوگا، ہمارے یہاں زندگی کی تصویر بہت سادہ ہے اس میں گھر ہے، سکون ہے، دور تک پھیلے ہوئے کھیت ہیں اور عورت کے خواب ہیں۔ میں ان باتوں کو پھر سے جگاؤں گی عورت کے خوابوں نے ہمیشہ ہندوستانی زندگی کو نئے آدرشوں کی طرف پرانی راہوں سے دھکیلا ہے، عورت دیکھ سکتی ہے، پیڑا سہتی ہے اور زمین بن کر تخلیق کرتی ہے، دشواریوں سے دوچار ہوتی ہے۔ میرے سینے میں یہ تخلیق نئے خیالات اور پرانے آدرشوں کی ہے ....کبھی کبھار میں آنکھیں بند کر کے سوچتی ہوں تو لگتا ہے یہ سب بچیاں اور ارادوں کی یادیں اس آزادی کا سنگ بنیاد بنیں گی ۔ جب عورت ماں ، بہن، بیٹی، بیوی سے اونچی ہوگی۔ جب عورت صرف عورت ہوگی، عورت اکیلی طاقتوں سے سمان اپنے سہارے خود ہی اڑ سکے گی جب عورت کمزور نہ ہوگی۔ جب تم اسے پھر ستونتی کہہ سکو گے، جب اس کی رائے کی مضبوطی تم کو پھر اُڑا لے جائے گی۔ [1]

جمیلہ ہاشمی مشرقی اقدار کی برتری کے قائل بھی ہے لیکن وہ اسے مکمل طور پر قبول نہیں کرتیں۔ وہ ان پرانی روایتوں اور اقدار کی مخالف بھی ہے جو عورت کی حیثیت کو مسخ کرتی ہیں۔ خصوصاً مردوں کی برتری والے سماج کی رسم و رواج جن سے معصوم عورتوں کی زندگیاں جہنم بن جاتی ہیں۔ ایسی رسوم و رواج کے حوالے سے جب وہ مغرب کی عورتوں کو دیکھتی ہیں تو وہ ان کی برتری اور مغرب کی سماجی و مذہبی اقدار کی اچھائیوں کا اعتراف بھی کرتی ہیں:

''یہ یورپ کی زندہ قوموں کا طریق ہے میری ششما بھابی اگر ودھوا ہوجاتی ہیں تو انہیں دھتکار دیا جاتا ہے۔ روتھ کی ممی بھی اگر بیوہ ہوجاتی

---

[1] ۔تلاش بہاراں۔ جمیلہ ہاشمی ۔ص:32-731

ہیں تو مسیح کا پیغام لے کر دنیا کے کناروں پر گھومنے لگتی ہے" بتاؤ عورت کا ایمان کون کرتا ہے۔ دھتکارنے والا یا اسے روشنیوں سے آشنا کرنے والا"۔ [1]

اس طرح سے جمیلہ ہاشمی نے اس ناول میں عورت کو مشرقی تہذیب و ثقافت کا ایک بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ حقیقت بھی ہے کہ اگر ہماری سے عورت کو نکال دیا جائے و زندگی بے رونق ہو جائے گی۔ اگر ہمارے ساتھ عورت ہے تو ہم زندگی کے تمام مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں۔ غرض زندگی میں عورت کے مقام و مرتبہ کی طرف ناول "تلاش بہاراں" میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے۔

انسان اپنے کو سمجھنے سے عاجز ہے وہ دوسروں کو کیا سمجھے گا ور پھر عورت ہماری زندگی سے اگر عورت کی نرمی نکال دی جائے اس کے چہرے کا حسن نفی کر دیا جائے اور اس کی عطا کردہ ہمت اور محبت الگ کر دی جائے۔ اگر اس کا عزم چھین لیا جائے تو باقی کیا رہ جائے گا۔ مجھے آج اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد اا رہا ہے۔ گلی محلوں میں جھگڑا بھی ہو جاتا ہے اور پھر یہ گلی محلے اگر گاؤں کے ہوں اور معاملہ عزت کا ہو تو عورتوں کو دل بڑھانے کے لیے مرد کے پس منظر کام کرنا پڑتا ہے۔ میں ان دنوں ننھیال گیا ہوا تھا۔ گاؤں کی زندگی میں سب طرف سکون ہوتا ہے۔ درختوں کی چوٹیوں پر آسمان ہوتا ہے۔ اپنے خواب دیکھا ہوا۔ پگڈنڈیاں سوئی ہوئی اڑتی ہوئی راہ گذاروں کی خاک میں چھپی ہوئی۔ ریت پانی۔ میلوں تک پھیلے ہوئے کھیت مویشیوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی شنائیں اور نیم خوابیدہ شامیں۔ میرے ساتھ وینا بھی تھی۔ زمین گاؤں والوں کی دولت ہے۔ پر کبھی کبھار لے دے بھی مچتی ہے۔

---

[1] ۔تلاش بہاراں۔ جمیلہ ہاشمی۔ص:250

ہمارے گھر کے قریب دو خاندانوں مں جھگڑا ہو گیا۔ دونوں طرف سے آدمی لٹھ لے کر نکل آئے میں بھی تماشا دیکھ رہا تھا۔ میں بہت چھوٹا ہوں پر پھر بھی مجھے یاد ہے کہ ایک عورت اپنے بھائی کو ایک لمبا بانس پکڑاتے ہوئے کہہ رہی تھی تیزی سے باہر نکلو جاؤ یہ مرد کی شان نہیں کہ وہ گھر میں بند رہے یہ لفظ میری یاد میں جم کر رہ گئے ہیں اور میں سوچتا ہوں ہماری تمام فتوحات عورت کی محتاج ہیں اور زندگی کی تمام مشکلات پر ہم عورت کی وجہ سے قابو پا سکتے ہیں۔ اس کا ایک یاد کیا ہوا بول ایک بات زندگی کے میدان میں سرشار رکھتی ہے اور ہم رکاوٹوں کی پرواکئے بغیر تیزی سے بڑھتے ہیں۔(۱)

ہمارے سماج میں عورت پر ہر سطح پر ظلم ہوا ہے وہ کبھی گھر کے باہر بے رحم سماج کا شکار بنی ہے تو کبھی گھر میں ساس شوہر نند، جیسے قریبی رشتوں کے ظلم کا شکار ہوئی ہے۔ غرض عورت کے اس مظلومیت کو ہر دور میں ناولوں کا موضوع بنایا گیا ہے جب کسی لڑکی کو بیاہ دیا جاتا ہے تو سسرال میں اس کے لئے ہر شخص اجنبی ہوتا ہے۔ لڑکی اپنے سسرال کی چاہے کتنی ہی اچھی خدمات کرے لیکن گھر میں کسی نہ کسی کو اس سے شکایت ضرور رہتی ہے۔

ہمارے سماج میں یہ روایت آج بھی موجود ہے کہ جس عورت کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے اس کو منحوس سمجھا جاتا ہے جو کہ ایک طرح سے اس بیوہ عورت پر ظلم ہے۔ غرض ناول تلاش بہاراں سے ایک اقتباس دیکھئے جس میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے:

ایک برسات میں بھیا بیمار پڑے اور پھر مر گئے۔ یہ بات اتنی دور زمانوں کی اور تلخ معلوم ہوتی ہیں۔ میں تو انہیں دہراتے بھی ڈرتی

---

(۱) تلاش بہاراں ۔ از جمیلہ ہاشمی ۔ ص 487

> ہوں۔ بھابھی کی چوڑیاں ماں نے اپنے ہاتھوں توڑ ڈالیں۔ مانگ کا سیندور دھودیا۔ ایک ماتم کا سا سماں سارے گھر پر چھایا رہتا شنو بھابھی کا آنچل پکڑ کر ہنستا تو وہ اس ڈر سے کہ کہیں ماں دیکھ نہ لیں اسے پیار سے بھی نہ دیکھتیں۔ مایوسی اور خاموشی نے بھابھی کو بے حد کمزور کر دیا۔ شنو بھی گھلنے لگا اور پھر شنو بھی مرگیا۔ بھابھی پر اس کے بعد سارا دن گالیوں کی بوچھاڑ پڑتی اسے ایک کونے میں پڑا رہنے کو کہا جاتا۔ کوئی اس سے ہنس کر نہ بولتا۔ وہ منحوس تھی اور اس کے سائے سے پرہیز کیا جانے لگا مجھے یاد ہے ماں مجھے بھابھی سے بولنے نہیں دیتی تھیں۔ وہ بڑی بڑی آنکھیں جن میں بے کسی تھی وہ سوکھے بال جو کھوپڑی سے چپک گئے تھے۔ کھال لٹک گئی تھی اور یہ دھتکاری ہوئی ششما بھابھی جب تلیا میں ڈوب مریں تو لوگوں نے ان اس پر انگلیاں اٹھائیں۔ طرح طرح کی باتیں کیں۔ ماں باپ تک زندہ رہیں۔ ششما بھابھی کو کوسی رہیں مجھے کوئی بتائے ان کا قصور کتنا تھا؟ کون خود سے چاہتا ہے کہ اپنے گھر میں آگ لگائے؟ بھیا کو بخار نے مارا تھا۔ بھابھی نے تو نہیں۔ شنو کو بیماری نے مارا تھا بھابھی تو نہیں چاہتی تھی کہ اس کا چمپا کے پھول کی طرح کا بچہ اس سے جدا ہو جائے۔ کون اپنے سے برباد ہوتا ہے۔ پر دنیا کتنی ظالم ہے۔ ماں کا بھی قصور نہیں ہمارے ہاں کے رواج ہی ایسے ہیں۔ جب بھی میں یاد کرتی ہوں میرا دل پھٹنے لگتا ہے۔ کنول تھک کر کرسی کی پشت سے سر لگا کر چپ ہوگئی۔(۱)

شوہر کے انتقال کے بعد عورت کے اوپر ہونے والے ظلم و ستم کی عکاسی ہمیں راجندر سنگھ بیدی کے ناول ''ایک چادر میلی سی'' میں بھی ملتی ہے۔ جب رانو کا شوہر تلوکا کے انتقال کر جاتا ہے تو رانو کی

---

(۱) تلاش بہاراں، جمیلہ ہاشمی۔

ساس جنداں ہر دن رانو پر ایسے ظلم کرتی ہے جیسے شوہر کے انتقال کے بعد اس گھر میں رانو کو رہنے کا کوئی حق نہیں۔اقتباس دیکھئے:

منگل نے جنداں کے ہاتھ روکتے ہوئے کہا" تائی!......کیوں تو تو روز اس گریب کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہو؟ کیوں روز مارتی، دھکے دیتی ہو، آخر کہاں جائے گی بے چاری؟"

رانو جسے اپنے شوہر کے مرنے پر رونا نہ آیا تھا، ایک دم بلک اٹھی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے آنسوؤں کے سیلاب میں کچھ یوں ڈوب گئی کہ لڑ ھکنے جوگی بھی نہ رہی وہ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی میں کیوں جاؤں؟......کیا نہیں کیا میں نے اس گھر کے لیے؟ بیٹے نہیں جنے کہ بیٹی نہیں جنی؟"

منگل بولا......"قصور بھابھی کا نہیں مرا ہے"

"تیرا خواہ مخواہ ہی؟" جنداں کڑکی......

جو عورت اپنے بچوں کی نہیں وہ اور کسی کی ہوگی؟" اور پھر رانو کی طرف منہ کرتے، ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ بولی" گرو کے واسطے بھگوان کے واسطے، دیوی ماں کے واسطے تو اب جا......وفان ہو جا جو اندھا کانا ملتا ہے کرے۔یہاں سے مرے......"

رانو اٹھی، مڑتی ہوئی اس نے جنداں کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو......تو تو جننی ہے ماں!......جگت ماتا ہے، تو تو مجھے مت دھتکار جیسے تیسے بھی ہے مجھے رکھ لے۔میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔اور اس ڈر سے وہ سب کے حصے کا کھا گئی تھی۔اب اسکی سمجھ میں نہیں آرہا تھا ......اس گھر میں رہے بھی تو کیسے؟ بچے اب پل چکے تھے بڑے ہو چکے تھے اور قاعدے سے اب وہ تکو کے تھے، اس کے تھوڑے ہی تھے؟

ساس، سسر، گاؤں میں پنچایت کے لوگ لے جانے بھی دیتے وہ ان کو
لے کر کہاں جاتی؟ خود بھیک مانگتی؟ ان سے بھیک منگواتی؟ پھر......
بنتا، سنیتا اور بڑی، ہر ایک سے وہ ایک ہی سا پیار کرتی تھی"۔(۱)

تلوکے کی موت کے بعد رانو کی ساس جنداں اسے اپنے اوپر ایک بوجھ سمجھتی ہے وہ اس لئے کہ رانو اور اس کے بچوں کو اپنی غریبی اور بھوک میں شریک کرنے کے لیے راضی نہیں ہے:

جنداں رات کو چوبیس گھنٹے چپکا کرتی تھی، رانو کو تو دیکھتے ہی بڑھیا
کے بدن کے سارے ٹکڑے ہو جاتے اور وہ رانو پر اپنی گالیوں کی
چھوجوں کے چھاج خالی کر دیتی، انڈ یئے! ڈائنے! چڑیلے! میرے
بیٹے کو کھا گئی اور اب ہم سب کو کھانے کے لیے منہ پھاڑے ہوئے ہے؟
چلی جا، جدھر منہ کرنا ہے کر لے اب اس گھر میں کوئی جگہ نہیں تیرے
لیے"۔(۲)

رانو پر اس ساس کے ظلم وستم کو دیکھ کر رانو کی ایک ہمدرد جنوں اس کو کہتی ہے کہ اگر تجھے یہاں رہنا ہے اور اپنے بچوں کی دو وقت کی روٹی دینا ہے ہو تو اپنے دیور منگل سے شادی کر لے۔ ورنہ تیری یہ ساس تجھے یہاں رہنے نہیں دے گی۔ یہ بات سن کر رانو حیرت میں پڑ جاتی ہے۔ پہلے پہل وہ تو اس رشتہ کو قبول نہیں کرتی لیکن افلاس، عزت و ناموس کے خطرے اور عدم تحفظ کے بڑھتے ہوئے سایہ سے مجبور ہو کر رانو اپنے دیور منگل سے شادی کرنے پر رضامند ہو جاتی ہے۔ غرض راجندر سنگھ بیدی نے رانو کی اس مجبوری اور بے بسی کو بڑے کرب کے ساتھ بیان کیا:

جنداں نے اپنے دوپٹے کے پلو سے چابیاں کھول کر رانو کو دے
دیں بھنڈارے کی طرف جانے کے بجائے رانو برآمدے کی طرف لپکی

---

(۱) ایک چادر میلی سی۔ راجندر سنگھ بیدی۔ ص 37

(۲) ایک چادر میلی سی۔ راجندر سنگھ بیدی۔ ص 30

جہاں بچے آدھے ننگے، آدھے ڈھکے وے سو رہے تھے۔رانی نے باری باری سب کا منہ چوما اور ان کے بازوؤں ٹانگوں میں اڑی ہوئی چادریں کھینچ کھینچ کر ان کے جسموں کو ڈھانپا۔گلابی سی سردی سے ہاتھ رانو میں دیئے۔سکڑے ہوئے بچے ایک تسکین کے احساس سے سیدھے ہونا شروع ہوئے لیکن جب رانی بڑی کے پاس پہنچی تو وہ جاگ رہی تھی۔اس سے پہلے کہ رانو اس کے سر پیار سے ہاتھ پھیرتی، بڑی نے اپنے بڑے بڑے ناخنوں سے ماں کا منہ نوچ لیا اور بولی ''جا تو...... اسی سے منہ کالا کروا'' رانو پر پہلے کیا کم گذری تھی کہ اس پر بیٹی نے بھی منہ نوچ لیا! وہ تو بڑی کو یہ بھی نہ کہہ سکتی تھی...... بیٹی! تیرے ہی لئے تو میں نے یہ سب کیا ہے اور تو اور، تو بھی؟ لیکن اس کے پاس یہ سوچنے کی فرصت ہی کہاں تھی؟ وہ تو یہ بھی نہ سوچ سکتی تھی اس کی بیٹی، اس کی اپنی، جسے اس نے مہینے پیٹ میں رکھا، ہزار اذیتیں سہہ کر آخر ایک دن جانکا ہی کے عالم میں اس دنیا میں لائی بے بسی اور میلے سے دھوتی روتی ہوئی پالا بڑا کیا اور اب بڑی ہو کر اس نے منہ نہیں نوچا...... پھول برسائے ہیں! رانی ایک کنہ اور خالی ذہین کے ساتھ اندر ہلدی لینے کے لیے چلی گئی، جسے نکال کر اس میں تیل ڈال کر، تو نے یہ پکایا اور پھر، منگل کی چوٹوں پر باندھنے کے لیے لے چلی...... اندر پہنچی تو منگل وہاں نہ تھا شاید، جب رانو اپنی ساس کے پاس تھی، وہ کہیں نکل گیا تھا۔رانو دوڑ کر باہر دروازے تک گئی...... منگل کا کہیں سایہ تک نظر نہ آیا۔البتہ ڈبو پاس آکر دم ہلانے، چوں چوں کرنے لگا اور اگلے پنجے اٹھا اٹھا کر رانو تو یہ رکھنے، جیسے کہہ رہا ہو...... میں جانتا ہوں رانی! تیرے ساتھ کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہو جائے گا۔آخر سب ٹھیک ہو جائے گا۔(۱)

---

(۱) ایک چادر میلی سی۔راجیندر سنگھ بیدری، ص 75

جسم فروشی وفحاشی کا مسئلہ:

جسم فروشی مردار اقتدار پر مبنی سماج کی وہ لعنت ہے جو ہر دور اور ہر دیار میں موجود رہی ہے طوائف کو نذیر احمد مرزا رسوا، منشی پریم چند، قاضی عبدالغفار وغیرہ نے اپنے ناولوں میں ایک اہم موضوع بنایا تھا غرض 1960ء کے بعد عصمت چغتائی قرۃ العین حیدر، علیم مسرور اور کرشن چندر وغیرہ نے اس قابل توجہ سمجھا اور طوائف کی زندگی کے باطنی حقائق اور تلخیوں کو اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ جسم فروشی کے تعلق سے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک عورت کب اپنا جسم فروش کرنے تیار ہوتی ہے اس کی کئی وجوہات ہیں کبھی عورت اپنی بے بسی و مجبوری کی حالات میں اس جسم فروشی کی لعنت کا شکار ہو جاتی ہے تو کبھی بے رحم سماج اس کو طوائف بنے پر مجبور کرتا ہے اس جسم فروشی وفحاشی کے مسئلہ کے ذمہ دار صرف عورت ہی نہیں بلکہ مرد بھی اور سماج و معاشرہ بھی۔ اس حقیقت کو کرشن چندر نے اپنے ناول ''ایک عورت ہزار دیوانے'' کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ ناول کی ہیروئن لاچی کو جب اس کے ماں باپ ساڑھے تین سو روپیے میں اپنے خانہ بدوش قبیلہ کے سردار دمارو کو بیچ دیتے ہیں لیکن ولڑکی ہرگز اپنی عزت بیچنا نہیں چاہتی اور کسی طرح سے اس دمارو کے ساڑھے تین سو روپئے واپس لوٹانا چاہتی ہے لیکن جب بھی وہ مدد کے لیے کسی کے پاس جاتی ہے تو لوگ پیسوں کے عوض میں اس کی عزت مانگتے ہیں:

> پبلک ٹیلی فون کے قریب رک کر اس کے دل میں ایک لمحے کے لیے خیال آیا۔ کہ وہ کیوں نہ بوتھ کے اندر جا کر خدا کو ٹیلی فون کرے اور اس سے ساڑھے تین سو روپے مانگ لے۔ کیا خدا تک یہ ٹیلی فون نہیں پہنچتا۔ کیوں نہیں پہنچتا......؟ آخر کیوں خدا اسے کہیں سے ساڑھے تین سو روپے نہیں دیتا؟ کوئی اتنی بڑی رقم تو ہے نہیں۔ آخر کیوں! اس دنیا

میں کوئی ایک لڑکی کی عزت لئے بغیر اسے ساڑھے تین سو روپے دینے
کے لیے تیار نہیں ہے؟(۱)

لاچی کا تعلق ایک خانہ بدوش قبیلہ سے ہے جن کے ہاں جسم فروشی کوئی غلط کام نہیں لیکن لاچی ایک ایسی لڑکی ہے جو کسی بھی صورت میں اپنی عزت بیچنا نہیں چاہتی لیکن اس کے ماں اور باپ ہر دن اس کو اپنی عزت بیچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ناول سے ایک اقتباس دیکھئے:

ماسن کی بیوی نے بالکل طعنہ دیا تھا۔وہ ادھیڑ ہوگئی تھی پھر بھی اتنی خوبصورت تھی کہ اگر دل لگا کر شکار کرتی تو آٹھ دس روپے اینٹھنا اس کے لئے کچھ مشکل نہ تھا لیکن اب اس کا جی نہ چاہتا تھا۔جب گھر میں جوان بیٹی موجود ہو تو کسی ماں کا جی خود دھندہ کرنے کو چاہئے گا؟ سوچنے کی بات ہے کسی انسان کا دل آرام کرنے کو نہیں چاہتا۔

ماسن یہ سن کر چپ تو ہوگیا۔لیکن اس کے سینے میں آگ بھڑک رہی تھی اس آگ پر تیل چھڑکتے ہوئے دمارو نے کہا۔

''جوان عورت تو سونے کی کان ہوتی ہے اور پھر لاچی ایسی خوبصورت لڑکی''!

لاچی نے فوراً کہا۔

''تم مجھے کوئلوں کی کان سمجھ لو یا پتھر کی کان لیکن میں دھندہ نہیں کروں گی''۔(۲)

اس طرح آگے ناول میں ایک جگہ کرشن چندر نے خانہ بدوش قبیلہ میں جسم فروشی کی صورتحال کی تصویر کشی ان لفظوں میں کی ہے:

---

(۱)ایک عورت ہزار دیوانے ،کرشن چندر،ص 56

(۲)ایک عورت ہزار دیوانے ۔کرشن چندر۔ص 23

> دوسری خانہ بدوش لڑکیوں سے کتنا الگ رہے جو اپنے قبیلے میں رہتی ہیں۔خیمہ خیمہ،شہر درشہر،اور گاؤں گاؤں گھومتی ہیں جن کا ایک زندگی کا خاوند ہوتا ہے اور ایک رات یا ایک گھڑی کا خاوند بھی ہوتا ہے اور دونوں خاوندوں میں کوئی چپقلش نہیں ہوتی ۔ بلکہ پہلا خاوند اپنی خوشی سے اپنی بیوی کو سجا کر باہر بھیج دیتا ہے جہاں وہ ایک رات یا اک گھڑی گذار کر آتی ہے اور اس طرح آتی ہے جیسے وہ اپنا جسم نہیں ایک عینک ایک چھلا بیچ کے آئی ہے اور آتے ہی اپنی ساری کمائی اپنے شوہر کے قدموں میں ڈال دیتی ہے اور اس کے گلے سے لپٹ جاتی ہے۔میرا جسم،عینک چھلا کیوں نہیں ہے''۔(۱)

فحاشی وجسم فروشی کے موضوع پر عصمت چغتائی کا ناول ''معصومہ'' بھی ایک اہم ناول ہے۔اس ناول میں ایک متوسط گھرانے کی لڑکی کے افلاس سے مجبور ہو کر کال گرل بننے کی داستان ہے۔معصومہ، متوسط حیدر آباد کے وقت باپ کے کراچی فرار ہوجانے کے بعد بے سہارا ہو جاتی ہے۔اس کی ماں چونکہ شروع سے نوابی ٹھاٹ اور آرام دہ زندگی گذارنے کی عادت تھی۔میڈل کلاس کی عورتوں کی طرح محنت ومزدوری کر کے گذر بسر کر سکتی تھی۔ چنانچہ وہ معصومہ اور دو چھوٹے بچوں کو لے کر بمبئی آجاتی ہے جہاں معصومہ اپنے گھر کی معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی ماں کے ذریعہ نیلوفر بن جاتی ہے۔ پہلے معصومہ کال گرل بن کر سیٹھ احمد بھائی کے ساتھ رہنے لگتی ہے اس کے بعد سیٹھ سورج مل کی رکھیل بن جاتی ہے۔معصومہ کی اس زندگی سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ معاشی حالات زندگی اور سماج کی تبدیلی میں مرکز اور محور کی حیثیت رکھتے ہیں۔معصومہ کی ماں کا تعلق رئیس گھرانے سے تھا۔ جہاں اس نے نوابوں کے سارے عیش دیکھے تھے۔اگر وہ چاہتیں تو محنت کشی کی زندگی گذار کر اپنے بچوں کو سماج

---

(۱) ایک عورت ہزار دیوانے۔کرشن چندر،ص 36

میں عزت کی زندگی دے سکتی تھی۔ جیسا کہ متوسط طبقے کی عورتیں مصیبت میں کرتی ہیں لیکن بیگم صاحب محنت کرنے کے لیے تیار نہ تھیں:

جاگیرداری نظام کی تمام لعنتیں سونی پڑی تھی فاقوں اور غربت نے انہیں رگوں میں پھر زندہ کریا۔ اگر بیگم درمیانہ طبقے کی کمزوریوں میں جکڑی ہوتیں تو بجائے بیٹی کا سودا کرنے کے سلائی کرکے پیٹ پالتیں۔ لڑکی کو کسی اسکول میں چھوٹی موٹی نوکری مل جاتی۔ روکھی سوکھی میں گذر کرتیں تو زیور ہی کئی سال ساتھ دے جاتا۔ مگر تنگی ترشی کی نہ تو انہیں عادت تھی اور نہ ہی کبھی کسی کو کرتے دیکھا''۔(۱)

معصومہ کے جسم فروش بننے میں اس زوال آمادہ نوابی معاشرے کا بہت بڑا ہاتھ تھا جو عیاشی اور بوالہوسی کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا اور جہاں یہ سب کچھ مذہب اور شرافت کی آڑ میں فروغ پارہا تھا:

ملع وہ ماحول تھا جس میں بیگم پلی تھیں روزے بھی تھے، نمازیں بھی تھیں، حج اور زکوٰۃ۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ چھپ کر رنڈی بازی اور حرام کاری تھی۔ دنیا کی نظر سے چھپا کر جو عیب کئے جائیں اس سے اور کوئی نہیں مگر اولاد تو واقف رہتی ہی ہے۔ حضور اعلیٰ کی کتنی بیویاں، باندیاں، داشتائیں، تھیں۔ کیا سب کو خوش رکھنا ان کے بس کی بات تھی؟ مگر سب ہی زندہ تھیں اور انسان تھیں۔ صاحب زادیوں کی بھی شادیاں نہیں ہوتیں۔ کیا وہ سب کے سب کنواری تھیں؟ جو اس بڑھاپے میں سال میں کتنے ہی بچے ہوتے تھے، کیا ان کی ماؤں کے علاوہ کسی دوسرے کو ان کے باپوں کا پتہ نہیں معلوم تھا؟(۲)

---

(۱)معصومہ، عصمت چغتائی۔ص54

(۲)معصومہ۔عصمت چغتائی۔

غرض بیگم صاحب حالات کے جبر اور تنگدستی کا شکار ہو کر اپنی بیٹی معصومہ ''عرف نیلوفر'' کو بمبئی کے سیٹھوں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں کا کھلونا بنا دیتی ہے:

نیلوفر کو بیگم نے جنم دیا تھا۔ ابھی چند سال پہلے تک کبھی کبھی اپنے ہاتھوں سے نہلا بھی دیا کرتی تھیں۔ مگر اس وقت اس کی ننگی جوانی کو مکلیجے بستر پر مچلتا دیکھ کر تھرا اٹھیں، جیسے خود انہیں لے جا کر کسی نے چورا ہے پر ننگا کر دیا ہے۔ قسمت نے دھکے ضرور دیئے تھے۔ مگر ان میں اب بھی شرم و حیا موجود تھی۔ احسان صاحب تو خیر غیر تھے۔ انھوں نے نواب صاحب کے سامنے جوانی کے دنوں میں بھی کمرے میں بجلی روشنی نہ کرنے دی۔ اور نیلوفر کا دھندا تو تھا ہی تاریکی کا۔ سو کینڈل پاور بلب کے نیچے اس کا دھکتا ہوا پنڈا انہیں جلا کر راکھ بنا رہا تھا''۔(۱)

چنانچہ معصومہ ان معزز اور دولتمند افراد کی جنسی تجربوں اور ہوس کا نشانہ بنتی ہے وہ اس جسم فروشی کی لعنت سے نکلنا چاہتی ہے لیکن اس کے معاشی حالات اور چھوٹی بہن کی شادی کی ذمہ داری اور بھائی کے اعلیٰ تعلیم کی ذمہ داری اس کو اس جال سے نکلنے نہیں دیتی۔ غرض وہ پیسہ کمانے کی ایک ایسی مشین بن جاتی ہے جو سونے اور چاندی کے سکوں کے عوض ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگوں کی زندگی رنگین بناتی ہے۔ معصومہ کو جسم فروش بنانے میں اس سرمایہ دارانہ نظام کا ہاتھ ہے جو دولت اور اقتدار کے حصول کے لیے کسی بھی نیک چلن لڑکی کو طوائف بنا سکتا ہے اور کسی بھی ماں کو دلالہ بننے پر مجبور کر سکتا ہے۔ راجہ صاحب سورج مل اور احمد بھائی جیسے لوگ اس ہوس پرست سماج میں معززین کا رتبہ حاصل کئے ہوئے ہیں لیکن معصومہ بدکار اور بدکردار کہلاتی ہے کیونکہ وہ کمزور اور مجبور ہے۔

فحاشی اور جسم فروشی کے مسئلہ پر ڈاکٹر علیم مسرور کا ناول ''بہت دیر کردی'' بھی قابل ذکر ہے جس

(۱) معصومہ۔ عصمت چغتائی۔ ص 40

میں مصنف نے فحاشی اور جسم فروشی کے مسئلہ پر بہت باریک بینی سے روشنی ڈالی ہے اس ناول کی ہیروئن، سلطانہ جو ایک پیشہ ورانہ طوائف ہے اس کے علاوہ اس ناول میں ایک کردار ''رینو'' ہے جو بھارت میں فحاشی اور عصمت فروشی کا مسئلہ پر ریسرچ کر رہی ہے۔اور اس کام میں وہ کائنات نامی لڑکی کی مدد لیتی ہے۔ چنانچہ مصنف نے رینو اور کائنات کے آپسی بحث ومباحثے کے ذریعہ اس فحاشی اور جسم فروشی کے مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

ہمارے معاشرے میں بعض اوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ طوائف ایک سماجی ضرورت ہے۔مصنف نے ناول کے دو مرکزی کردار داؤد اور سلطانہ کی گفتگو کے ذریعہ اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

> ''مرد جیسا چاہے طوائف ویسی ہو سکتی ہے۔قیمت دینے والا ہو!''
> ''لیکن میں نے تمہیں کیا دیا ہے؟''
> ''مجھے تو ملیگا، کہیں سے ملے! تم طوائفوں کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''
> ''سنا ہے!''
> ''کیا سنا ہے؟''
> ''سماج کی ٹھکرائی ہوئی بے بس عورت ہوتی ہے!''
> ''لوگ یہی کہتے ہیں لیکن یہ جھوٹ ہے۔
> طوائف سماج کی بہت بڑی ضرورت ہے ورنہ وہ اسے پیدا ہی کیوں کرتا، جیسے ہوٹل، گھر میں کھانا کھانے والوں کو کیا ہوٹل کی ضرورت نہیں پڑتی، اب کوئی بمبئی آئے جس کا یہاں کوئی نہ ہو تو وہ کیا کرے گا۔کہاں کھائے گا؟ (ا)

(ا) بہت دیر کردی۔علیم مسرور۔ص 109

ہمارے معاشرے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ فحاشی کے جرائم صرف طوائفوں کے اڈوں پر ہی ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ اگر ہم اس فحاشی کے جرائم کا ذرا باریک بینی سے مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے آس پاس ایسے کئی مقامات ہیں جہاں پر فحاشی کے جرائم موجود ہیں چنانچہ مصنف نے ناول کے مختلف کرداروں کی آپسی بحث کے ذریعہ ہمارے معاشرے میں فحاشی کے جرائم پائے جانے والے مقامات کی نشاندہی یوں کی ہے:

> ایک صاحبہ ہیں جن کا نام رینو ہے وہ بھارت میں فحاشی اور عصمت فروشی پر ریسرچ کر رہی ہیں۔ وہ اردو نہیں جانتیں، اس سلسلہ میں اردو کی کچھ کتابوں سے ان کے نوٹس تیار کرانے میں اگر تمہاری سہیلی یہ کام کردے تو اس کا معاوضہ مل جائے گا۔ اس کے کام آئے گا!''
>
> ''بھارت میں فحاشی پر ریسرچ''۔ سلطانہ نے حیرت سے سوال کیا۔
>
> ''ہاں'' داؤد نے کہا
>
> ''بھارت تو بہت بڑا ملک ہے میں تو کہتی ہوں بمبئی کی ایک چال میں فحاشی پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے''۔ سلطانہ نے کہا ''تم اپنا ریسرچ رہنے دو۔ رینو کو کام کرنے دو! داؤد نے اسے روکنا چاہا
>
> ''بولنے دو نا بھابھی کو۔ ہاں بھابھی بولو بمبئی کی ایک چال میں پھر؟'' داؤد نے کہا
>
> ''پھر اتنی ساری چالیں۔ مکان، بلڈنگ، دفتر، کلب، ہوٹل فلمی ادارے، اسپتال، اسکول، کالج، فٹ پاتھ، کوچے، بازار، تفریح گاہیں، ملیں، کارخانے فارس روڈ، پلے ہاؤس، کہاں کہاں فحاشی کے جراثیم نہیں ہیں۔ میرے خیال میں عورت اور مرد کے پیچھے ایک نئی ضرورت اسے فروغ دے رہی ہے۔ سلطانہ نے کہا۔

''پھر تو رینویا کائنات بیچاری کتابوں کے چند صفحے پڑھ کر کیا سمجھ
پائیں گی''۔
طاہر نے کہا۔
''اس کا مطلب یہ ہے کہ رینو کو ریسرچ کے لئے ایک بھاری نسل کی
ضرورت پڑے گی!
بدرالدین نے کہا
ضرور۔ایسی نسل جو اپنے ہاتھ میں قلم لے کر پیدا ہو اور زندگی بھر
گھسیٹتی رہے۔(۱)

سماج میں فحاشی کے جرائم کی ذمہ دار ہمیشہ صرف عورت کو سمجھا گیا ہے اور یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ صرف مرد کی جنسی تسکین کے لیے پیدا کر دی گئی ہے اس لئے مرد ہمیشہ اس عورت کو مشین کی طرح استعمال کرتا رہا ہے، ناول سے ایک اقتباس دیکھیے جس میں ناول نگار نے رینو اور کائنات کی گفتگو کے ذریعہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ فحاشی کے جرائم کی ذمہ دار عورت کو قرار دے کر کس طرح اس کو ذلیل کیا جاتا ہے:

رینو یکس پر اتنی ساری کتابیں اور رسالے۔کیا تم کو اس سبجکٹ سے
خاص دلچسپی ہے؟
یہ سب کتابیں میں نے اپنی تھیس کے سلسلہ میں اکٹھا کی ہیں!
''آپ کی تھیس کا سبجکٹ کیا ہے؟
یہ تمہیں قاسم نے بتایا نہیں؟
بس یہی کہا ہے کہ اردو کتابوں سے کچھ نوٹ تیار کرانے ہیں؟
میرا سبجکٹ ہے''بھارت میں عصمت فروشی!''

---

(۱) بہت دیر کر دی۔علیم مسرور۔ص 128

''کیوں؟ یہ سبجکٹ کسی مرد نے نہیں لیا''۔

''میں نے خود کیا ہے، سمجھنا چاہتی ہوں کہ اس معاملے میں عورتیں ہی زیادہ ذلیل کیوں ہیں؟

یہ تو سیدھی سی بات ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان کوئی تیسری مخلوق نہیں جو اس کا فیصلہ کرے!

تم نے اس سبجکٹ پر کوئی اسٹڈی پہلے کی ہے؟

میں نے اس کے بارے میں سوچا ہے۔ کتابیں نہیں پڑھی ہیں۔ کالج ہوسٹل میں رہنے والی کچھ شہوت پسند Phmphomenic لڑکیوں کے پاس سیکس کی کتابیں رہتی تھیں۔ انھیں کہیں کہیں سے دیکھنے کا موقع ملا ہو۔

ان کتابوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟

میں نے بس یہ اندازہ کیا ہے کہ مرد کچھ یوں سمجھتے ہیں کہ عورت آسمان سے اسپورٹ کی ہوئی کوئی مشین ہے جس کے بنانے والے اس کی کوئی گائیڈ بک نہیں بھیجی ہے۔ اس لئے بہت سے عقلمندوں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے اسے مشین کے استعمال کے طریقے بتائے ہیں''۔(۱)

اس طرح آگے ایک جگہ ناول میں مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عصمت فروشی اور فحاشی کے اس وباءعام میں مرد کی بہ نسبت عورت زیادہ ذلیل ہورہی ہے:

عورت اور مرد کا پہلا تعلق میاں اور بیوی کا تعلق تھا۔ اس رشتے نے بہت جلد تین اور رشتوں کو جنم دیا۔ ماں، بیٹی اور بہن کا رشتہ آج کی دنیا میں جب کہ عورت بازار میں بک رہی ہے۔ عصمت فروشی اور فحاشی کی

(۱) بہت دیر کردی۔ علیم مسرور۔

> وبا عام ہے یہ رشتے اتنے ہی مقدس ہیں۔مثلاً ایک مرد جو دوسری عورت سے ناجائز تعلق رکھتا ہے اوراس پر فخر محسوس کرتا ہے۔آج بھی اپنی ماں، بیٹی، بہن اور بیوی کے لیے کسی غیر مرد کی غلط نگاہ بھی برداشت نہیں کرسکتا''۔(۱)

موجودہ دور میں عصمت فروشی اور فحاشی ہمارے معاشرے کا جز بن گئی ہے پہلے صرف طوائف عورتوں تک ہی یہ فعل محدود تھا لیکن موجودہ دور میں ان عورتوں کو بھی فحاشی کے جرائم میں شمار کیا جارہا ہے جو شریف گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں اور دوستی و محبت کے نام پر اس جرائم سے اپنا رشتہ جوڑتی ہیں جس کی طرف ناول میں واضح انداز میں اشارہ کیا گیا ہے:

> اٹھارہویں صدی سے لے کر اب تک عورت اور مرد کا ناجائز اختلاط تہذیب کا اتنا بڑا جز بن گیا ہے کہ عصمت فروشی بازاری عورتوں کے اعداد وشمار ہی پر مختصر نہیں رہ گئی بلکہ ان عورتوں کا بھی شمار ضروری ہوگیا جو شریف گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں اور دوستی، تواضع اور محبت کے لیے ایسے عمل کا ارتکاب کرتی ہیں یا کسب معاش کے لیے پارٹ ٹائم مردوں کی خدمت میں رہتی ہیں حالانکہ انھیں فاحشہ کہہ دیا جائے تو سوسائٹی کی نظر میں کہنے والا ہی بڑا گنہگار ہوگا۔(۲)

ناول نگار نے ہمارے معاشرے میں بڑھتے ہوئے اس فحاشی کے مسئلہ کی ایک وجوہات یہ بتائی ہے کہ فحش لٹریچر اور عریاں فلمیں جس سے نابالغ بچوں کے ذہن پر بہت برا اثر پڑتا ہے اور قبل از وقت یہ بچے جنسی لذتوں کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔اقتباس دیکھئے:

> فحش لٹریچر، عریاں فلمیں اور حسن وعشق کے غیر فطری مناظر نے

---

(۱)بہت دیر کر دی۔علیم مسرور۔ ص 225

(۲)بہت دیر کر دی۔علیم مسرور ص 240

بچوں کوقبل از وقت بالغ بنادیا۔ وہ اپنی شادی کی عمر سے بہت پہلے جنسی
لذتوں کی تلاش میں نکل پڑے اور تمدن کی بنیاد میں گھن لگ گیا۔(۱)

ناول نگار نے فحاشی کے اس بڑھتے ہوئے جرائم کی دوسری وجہ خواتین کا فیشن اور ان کی آرائش و زیبائش بتائی ہے۔سوسائٹی میں ہر عورت یہ چاہتی ہے کہ وہ دوسری عورت سے زیادہ پر کشش لگے نتیجہ میں مردوں کے جذبات مشتعل ہوتے ہیں اور اس طرح سے خودبخو دفحاشی کے یہ جرائم پھیلنے شروع ہوتے ہیں:

فیشن اور آرائش کی جدید ترین مصنوعات کو سرمایہ کے لالچ میں اس
قدر فروغ دیا گیا ہے کہ وہ ہر گھر کے بجٹ کا لازمی جز و ہو گیا۔اس سے
عورتوں کی دلنوازی اور کشش غیر فطری حد تک بڑھی،سوسائٹی میں ایک
عورت کو دوسری سے زیادہ پر کشش بننے کا شوق ہوا جس نے مردوں
کے جذبات میں اس قدر ہیجان برپا کیا کہ انھوں ں نے اپنی لذت یابی
کے لئے عورتوں کو ہوٹلوں،کلبوں،تھیٹر اور رقص گاہوں میں آرٹ اور فن
کے نام پر ممتاز جگہ دی اس نے ان سارے جذبات کو اٹھا کر رکھ دیا جو
عورت اور مرد کے درمیان پاکیزگی، احترام اور تقدس کا درجہ رکھتے
تھے''۔(۲)

مصنف نے ناول میں فحاشی کے اس بڑھتے ہوئے جرائم کی جو دیگر وجوہات بتائی ہے اس میں ایک اہم وجہ نسل انسانی کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے ایجاد کئے گئے وہ طبی طریقے ہیں جس کا نوجوان اور کنوارے لڑکے اور لڑکیاں غلط استعمال کر کے فحاشی کے اس جرائم سے اپنا رشتہ جوڑ رہے ہیں۔اقتباس دیکھیے:

---

(۱)بہت دیر کردی۔علیم مسرور۔ص262

(۲) بہت دیر کردی۔علیم مسرور۔ص262

> عورتوں نے اپنی ذمہ داریوں کو کم کرنے کے لیے ان طبی طریقوں کو جو نسل انسانی کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے ایجاد کیے گئے۔ غلط طور پر استعمال کرنا شروع کیا۔ سوسائٹی میں مردوں اور عورتوں کو ان طریقوں کے استعمال کی آگہی کے لیے ایسی فراخ دلی سے کام لیا گیا کہ نوجوان اور کنوارے لڑکے اور لڑکیاں ان سے اس قدر آشنا ہو گئے کہ ان کے درمیان حمل قرار پا جانے کا خوف، جو انھیں ناجائز جنسی اختلاط سے روکتا رہا، دور ہو گیا اور فحاشی کی بنیاد گہری ہوتی گئی۔(۱)

لڑکے اور لڑکیوں کی آزادی بھی فحاشی کے جرائم کی وجہ ہے اگر ایک لڑکا اور لڑکی آپس میں جنسی تعلقات رکھتے ہیں تو شخصی آزادی کے نام پر انہیں کبھی مجرم نہیں سمجھا جاتا ایسے حالات میں انہیں قانونی سرپرستی حاصل ہوتی ہے:

> کوئی شخص اگر کسی چور سے سازباز کر کے ماں باپ کی دولت چراتا ہے تو قانون اور سماج کی نگاہ میں مجرم ہوتا ہے اور سزا کا مستحق سمجھا جاتا ہے اس کے برعکس اگر کسی کا لڑکا اور کسی کی لڑکی آپس میں جنسی کھیل کھیل کر ماں باپ کی آبرو پر ڈاکہ ڈالتے ہیں تو شخصی آزادی کے نام پر مجرم نہیں سمجھے جاتے ایک طرف قانون ایسے بے راہ رو لڑکے اور لڑکیوں کی سرپرستی کرتا ہے دوسری طرف سماج لڑکی کے والدین کو معطون کرتا ہے اور لڑکے کے والدین کو تمغہ امتیاز دیتا ہے۔(۲)

مصنف نے فحاشی اور جسم فروشی کے مسئلہ کی وجوہات کے ساتھ ساتھ فحاشی اور جسم فروشی کی وجہ سے ہونے والی متعدد بیماریوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ جیسے سوزاک، آتشک، وغیرہ۔ غرض

---

(۱) بہت دیر کردی۔ علیم مسرور۔ ص 261

(۲) بہت دیر کردی۔ علیم مسرور۔ ص 263

اقتباس دیکھئے۔

> یہ امر عالمی طور پر تسلیم شدہ ہے کہ عورت اور مرد کے ناجائز تعلقات نے امراض خبیثہ کو جنم دیا ہے۔سوزاک اور آتشک جب ایک بار کسی کو ہوجاتا ہے تو اس کے بد اثرات نسل در نسل مختلف شکلوں میں نمودار ہوتے رہتے ہیں۔بچوں کی مردہ ولادت یا آغاز حیات میں ان کا مرجانا نوے (90) فیصد آتشک کے بداثرات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ہڈیوں کو گھن کی طرح کھا جانے والے بیشتر امراض کے پیچھے آتشک کے بد اثرات کام کرتے ہیں۔ڈاکٹر ہمین کی تحقیقات کے مطابق جو بچہ نسلی آتشک سے متاثر ہوتا ہے وہ بڑا ہوکر احمق ہوتا ہے اور سوزاک کا نسلی اثر جن بچوں کے ضمیر میں ہوتا ہے وہ شریر، خودغرض اور بے رحم ہوتے ہیں۔ دنیا میں چور ڈاکو اور قاتلوں کی خاص تعداد سوزاک کے نسلی اثر سے پیدا ہوئی ہے اور ہوتی رہے گی ان کے علاوہ عورتوں میں حیض کی تکلیفات، بانجھ پن، ذیابیطس، ٹیومر اور کینسر ایسے امراض کے پیچھے بھی امراض خبیثہ کے دوررس نتائج کام کررہے ہیں۔(۱)

نفسیات اور جنس:

ادب انسانی زندگی کی ایک ایسی تصویر ہے جس میں انسانی جذبات و احساسات کے علاوہ مشاہدات، تجربات اور خیالات کی جھلک بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔

چنانچہ نفسیات اور جنس بھی ہمارے ادب کا ایک اہم موضوع ہے۔ اردو میں منٹو، عزیز احمد، عصمت چغتائی، راجیند رسنگھ بیدی اور قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں نفسیاتی الجھنوں اور جنسی مسائل کو موضوع بنایا ہے یہ حقیقت ہے کہ اردو ادب میں تحت الشعور، جنسی دباؤ اور پابندیوں

(۱) بہت دیر کردی۔علیم مسرور۔ص 264

کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی بیماریوں اور الجھنوں کو نہایت جرأت کے ساتھ زیر بحث لایا گیا۔ اردو ناول نگاری کے شعبہ میں جن ادیبوں نے نفسیات اور اس سے متعلقہ جنسی مسائل کو موضوع بنایا ان میں نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار، سجاد ظہیر، عزیز احمد اور عصمت چغتائی وغیرہ سرفہرست ہیں۔ لیلیٰ کے خطوط، لندن کی ایک رات گریز، اور ٹیڑھی لکیر وغیرہ وہ اہم ناول ہیں جن میں مختلف کرداروں کی نفسیاتی زندگی اور جنسی مسائل کو معیاری ادبی شکل میں سامنے لایا گیا۔ غرض 60 کے بعد جن اردو ناول نگاروں نے نفسیات اور جنس کو موضوع بنایا۔ ان میں عصمت چغتائی، بیدی، جمیلہ ہاشمی، علیم مسرور اور احسان الحق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

راجیندر سنگھ بیدی کا ناول ''ایک چادر میلی سی'' ایک بیوہ عورت رانو کی نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کرتا ہے جو اقتصادی حالات اور سماجی پابندیوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے نوجوان دیور منگل کے ساتھ ازدواجی رشتے میں منسلک ہونا پڑتا ہے۔ رانو خود ایک غریب گھر کی بیٹی تھی اور اس کی شادی اپنے ہی طبقے کے یکہ بان تلوکے سے ہوئی تھی۔

تلوکے چودھری مہربان داس کو اس کی جنسی ہوس کے لیے دھوکہ سے معصوم لڑکیوں کو اس کے یہاں لے جایا کرتا ہے ایک دن ایسے ہی دھوکہ سے ایک بارہ تیرہ برس کی خوبصورت نازک لڑکی کو مہربان داس کی جنسی ہوس کا نشانہ بناتا ہے جیسے ہی اس کے بھائی کو یہ بات معلوم ہوتی ہے وہ تلوکے کو پکڑ کر قتل کر دیتا ہے۔ تلوکے کی وفات کے بعد رانو اور اس کے بچوں کی ذمہ داری تلوکے کا بھائی منگل پر آجاتی ہے۔ منگل اپنی ذمہ داری کو جان کر تلوکے کا یکہ سنبھال لیتا ہے۔

منگل نوجوان ہونے کی بنا پر لاابالی اور غیر سنجیدہ تھا پھر رانی کے ساتھ کسی ایسے رشتے میں منسلک نہ تھا جو اسے ادھر ادھر بھٹکنے اور چھپ چھپ کر سلامتی سے عشق کرنے سے روک سکتا۔ اگرچہ اس نے

گھر کے اخراجات سنبھال لیے تھے لیکن رانو کے لئے خصوصاً تیزی سے جوان ہوتی ہوئی بیٹی کے مستقبل کا سوال نہایت پریشان کن تھا اس صورتحال میں ایک راستہ نظر آتا ہے یعنی منگل اور رانو کا ازدواجی بندھن گاؤں والے چاہتے تھے کہ منگل رانو کے سر پر چادر ڈال کر اسے اپنا لے تاکہ رانو کا احساس عدم تحفظ دور ہو جائے، لیکن رانو کے لئے منگل سے اپنی عمر کے تفاوت کو نظر انداز کرنا آسان نہ تھا کیونکہ منگل رانو کو ماں کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے جوتے ہوئے دیور سے جنسی رشتہ قائم رنا رانو کے لیے آسان نہ تھا۔ لیکن اقتصادی حالات کا دباؤ بالآخر رانو کو یہ زہر پینے پر مجبور کر دیتا ہے۔

منگل سماجی طور پر رانو کو اپنانے کے باوجود رانو کو ذہنی و جسمانی طور پر اپنانے کے لیے راضی نہیں ہوتا لیکن بالآخر ایک دن شراب کے توسط سے دونوں اپنے رشتہ کی اصل معنویت کو سمجھ پاتے ہیں اور یہ دونوں کے درمیان کی نفسیاتی الجھن ختم ہوتی ہے:

> پھر جیسا کہ رانو نے سوچا تھا۔ منگل نے اس کے ہاتھ جھٹکنے شروع کر دیئے بیچ میں بڑی آ گئی اور دونوں کو ایک دوسرے کے اتنا کے اتنا قریب پا کر ٹھٹک گئی...... رانو پھر بوتل پر جھپٹنے لگی اور منگل اسے دھکیلنے لگا۔ اس کے سخت اور کھردرے ہاتھ رانو کے بدن کے ہر حصے کو لگ رہے تھے۔ بیچ میں اس نے کچھ رکھ رکھاؤ کیا بھی لیکن چادر کا بیچ نامہ تھا جو رانو کا بدن توڑ رہا تھا مروڑ رہا تھا۔ وہ بار بار ایک دم بوتل سے منہ لگا کر پیتے ہوئے ہانپتے کانپتے کہہ رہا تھا ''میں اپنے بھائی کی طرح نامرد نہیں جو ایک عورت کے سامنے ہتھیار ڈال دے گا'' منگل نے اس چھپٹا جھپٹی میں ایک تہائی بوتل خالی کر دی۔ رانی کچھ اور لیکی منگل نے اب کے اسے نیچے فرش پر گرا دیا اور پھر جوش کے عالم میں اسے زدوکوب کرنے لگا بالکل ایسے ہی جیسے رانو نے سوچا تھا...... رانو کی سانس دھونکنی کی طرح

چلنے لگی۔ اس کے اعضا میں ایک ایسی تڑپ پیدا ہوگئی جسے زیر کرنا مشکل ہوگیا...... پگڑی پھاڑ کر اس نے رانو کے زخم پونچھنے شروع کر دیئے اور پھر کپڑے کوٹھی میں رکھ کر اس پر سانس کی دھونکنی چلانے لگا۔ رانو کے بدن پہ جہاں جہاں سوجن تھی لگانے لگا...... رانی کو آرام آرہا تھا خط آرہا تھا اور منگل کو رونا، اور اس نے رونے میں کفارے کی تسکین روتے روتے اس نے رانی کے پاؤں پکڑ لیے اب وہ اسے اوپر کھینچ رہی تھی اس کا بدن سہلا رہی تھی'۔(۱)

چنانچہ شراب اور پھر جنس کے توسط سے رانو اور منگل کا نیا رشتہ مستحکم ہوتا ہے۔ رانو اس رشتہ کو قائم کرنے کے لیے منگل کے ہاتھوں مار بھی کھائی، منگل کے زخموں پر ماںتا کا مرہم بھی لگایا ایک پختہ، آزمودہ طوائف کی طرح اپنے نئے شوہر کو شراب پلا کر اس کے جنسی جذبات کو بیدار بھی کیا اور خود کو سجا سنوار کر منگل کو اپنی طرف مائل ہونے پر مجبور بھی کیا۔ غرض بیدی نے اس کہانی کے مرکزی کردار رانو کی نفسیاتی کشمکش اور جذباتی تغیرات کو اس چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ وہ کہانی نچلے طبقے کی ہندوستانی عورت کی نفسیاتی الجھن کی کہانی بن گئی۔

جنسی ونفسیاتی موضوع کو عصمت چغتائی نے بھی اپنے ناولوں میں ایک اہم موضوع بنایا ہے اس سلسلہ میں ان کا ایک مختصر ''معصومہ'' قابل ذکر ہے۔ اس ناول میں عصمت چغتائی نے ایک شریف خاندان کی مڈل کلاس اخلاقیات کی پروردہ نوجوان لڑکی کے طوائف بننے کی داستان ہے معصومہ کا باپ مستوط حیدرآباد کے زمانے میں کراچی منتقل ہوتا ہے وہاں جا کر ایک انیس سالہ لڑکی سے شادی رچالی تھی۔ بوڑھے شوہر کی ہوس رانی اور جوان بیٹوں کے بے حسی نے بیگم کے اندر ایسی کڑواہٹ پیدا کر دی کہ انہوں نے معصومہ کو فروخت کر کے ضروریات زندگی مہیا کرنے کا فیصلہ کر ڈالا بمبئی میں ان کے ایک

---

(۱) ایک چادر میلی سی، راجیند رسنگھ بیدی، ص 706,107

پرانے شناسا نے ان کو کرائے کا کمرہ دلوانے، بچوں کے اسکول میں داخل کرانے اور باذوق رئیسوں سے متعارف کرانے میں ایک منجھے ہوئے دلال کا فریضہ انجام دیا اور یوں معصومہ کی زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھلتی چلی گئی۔

بمبئی میں معصومہ کے اولین شناسا ادھیڑ عمر کے سیٹھ احمد بھائی تھے جو معصومہ کو دیکھتے ہی ہوا س کھو بیٹھتے ہیں۔شروع میں معصومہ احمد بھائی کو طرح طرح سے پریشان کرتی ہے لیکن احمد بھائی کے فراہم کردہ عیش، رہائش کے بوجھ تلے احمد بھائی سے زیادہ دن دور نہیں رہ سکتی اور ایک دن احمد بھائی معصومہ کو نیلوفر بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن معصومہ بہت آسانی سے کال گرل نہیں بنتی۔اسے جب بچپن کی سہلیاں نوعمر کے خواب نوجوان محبت کی خواہش اور خوش حال گھرانے کا تحفظ اور بے فکری یاد جب آتی ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ سامنے آنے والے ہر فرد اور ہر شئے کو تہس نہس کر ڈالے:

> اف کیا دن تھے وہ بھی! کیا سر جوڑ کر کوئیوں سے باتیں ہوا کرتی تھیں! زندگی کی باتیں، پیار اور چھیڑ چھاڑ کی باتیں کنوارے خوابوں کی دھڑکتی ہوئی باتیں جن میں ابٹن کی خوشبو تھی، مہندی کا رچاؤ تھا اور سہاگ پڑے کی مہک تھی۔اور پھر وہ ان چپ چاپ گونگی شہنائیوں کے سروں میں کھو جاتی، جواب کبھی نہیں بجیں گی، پھر وہ چونک پڑتی احمد بھائی کے لال میں لٹیرے ہوئے ہونٹ اس کی کمزور کنواری ہستی کو جھنجھوڑ ڈالتے اور وہ بڑی بے دردی سے جو چیز ہاتھ آجاتی کھینچ مارتی وہ بڑی مرکھنی ہو گئی تھی۔(۱)

معصومہ اس طرح کے تشدد کے ذریعہ ان غیر مرئی سماجی قوتوں سے اپنی آرزوؤں کی شکست اور اپنے جنسی و جذباتی استحصال کا انتقال لینا چاہتی ہے۔جنہوں نے اس کو اپنے باپ کی عمر کے بھدے

(۱) معصومہ۔عصمت چغتائی۔ص 37

اورنیم خواندہ سیٹھوں کے بستر گرم کرنے پر مجبور کیا تھا۔

علیم مسرور کا ناول ''بہت دیر کردی'' بھی ایک مرد اور عورت کے جذباتی رشتوں سے پیدا شدہ الجھنوں کا احاطہ کرتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار اور بمبئی میں کرائے پر مکان حاصل کرنے کے لیے کریم دادا نامی کی مدد سے ایک خوبصورت طوائف سلطانہ کو عارضی طور پر بیوی کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھ لیتا ہے۔ ظاہری طور پر شوہر و بیوی کی طرح رہنے اور حقیقی طور پر ایک دوسرے سے فاصلہ برقرار رکھنے سے دونوں کے درمیان تناؤ سے پر تعلقات پیدا ہوتے ہیں جس سے نئی نئی طرح کی نفسیاتی اور ذہنی الجھنیں جنم لیتی ہیں۔

سلطانہ ایک خاندانی طوائف ہے جو کریم دادا کے دباؤ میں آ کر داود کے ساتھ کچھ مدت گذارنے پر راضی ہو جاتی ہے، داود متوسط طبقے کی پابند اخلاقیات کا پروردہ نوجوان ہے جو عورت کو پسند کرتا ہے، اس کی قربت حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن ناجائز جنسی تعلق قائم کرنا اس کی اخلاق اور ضمیر کے خلاف ہے لیکن سلطانہ کے قرب اور انس سے اس کے دل میں جو ہیجان پیدا ہو رہا تھا اس پر قابو پانا اس کے لئے مشکل عمل ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اسے سب کچھ دینے کو تیار تھی لیکن داؤد کچھ بھی نہ لینے کی کوشش میں تھکتا جا رہا تھا:

> سلطانہ نے چائے کا پانی اسٹو پر چڑھا کر آئینے میں اپنے کو درست
> کیا اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔ سوچا داؤد کو جگا دے۔ 9 بج رہے تھے وہ بے خبر
> سو رہا تھا۔ اس نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ نہیں چونکا چند لمحے
> انتظار کر کے اس نے اس کے گالوں کو تھپتھایا۔ داؤد کی نیند کچھ ہلکی
> ہوگئی۔ لیکن اس نے جاگنے کے بجائے دوسری طرف کروٹ لے لی
> سلطانہ نے داؤد کی کمر کے سہارے اس پر جھک کر اپنا منہ اس کے

سامنے کرتے ہوئے کہا ''اب اٹھئے بھی۔9 بج رہے ہیں'' داؤد نے آنکھ کھولنے کی کوشش کی تو سلطانہ نے اس کا منہ اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا

''نیند نہیں کھلتی کیا؟''

سلطانہ کو اس قدر قریب محسوس کر کے اس کی آنکھ سے رات کی جگائی کا سارا خمار غائب ہوگیا۔اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اٹھ نہ سکا۔وہ سلطانہ کے بوجھ سے دبا ہوا تھا اور اپنی رگوں میں دوڑتی ہوئی سنسنی کے احساس سے نڈھال ہو رہا تھا۔سلطانہ اس پر اس طرح لدی رہی۔بولی نہیں اٹھو گے کیا؟

تم ہٹو بھی یہ کہتے ہوئے داود کو ایسی انگڑائی آئی کہ اس کی ساری رگیں ٹوٹ کر رہ گئیں۔پھر بھی سلطانہ نہیں ہٹی۔بولی ''میں بہت بھاری ہوں کیا؟''

وہ اس وقت اسے اتنی بھاری لگ رہی تھی کہ اسے ڈر تھا کہیں اس کا سارا وجود ہی کچل کر نہ رہ جائے''۔(۱)

جنسی حواس کے موضوع پر احسان الحق کا ایک ناول ''کالا شہر گورے لوگ'' بھی قابل ذکر ہے جس میں انہوں نے مشرقی و مغربی دونوں معاشرے میں تقابل کر کے اس جنسی ہواس کے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ناول سے ایک اقتباس دیکھئے جس میں مغربی معاشرہ میں لڑکیوں کے جنسی حواس کا شکار ہونے کی صورت حال پر روشنی ڈالی ہے۔

آنند نے خاموشی توڑی ''مجھے کیلر اور ڈاکٹر وارڈ سے ہمدردی ہے۔

یہ اسکینڈل دراصل انگلینڈ کے اعلیٰ طبقے کی اخلاقیات کا جنازہ ہے۔یہ

---

(۱)بہت دیر کر دی۔علیم مسرور۔ص 106,107

سماج کی خرابی ہے جہاں کیلر جیسی لڑکیوں کو پندرہ سال کی عمر میں جنسی تجربے ہو جاتے ہیں اور پھر 21 سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ اختلاط کی اکسپرٹ بن جاتی ہیں۔ یوروپین سماج کی یہ خرابی ہے کہ یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کو کم سنی میں جنسی تجربہ ہو جاتا ہے اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہاں کی 80 فیصد عورتوں کی شادی اس وقت ہوتی ہے جب وہ حاملہ ہو چکی ہوتی ہیں''۔(۱)

ہمارے معاشرے میں جنسی حواس ایک ایسی بیماری بن گئی ہے جو دیمک کی طرح ہماری نوجوان نسل کی نشو و نما کو چاٹے جا رہی ہے جنسی حواس کی یہ صورت حال صرف ایک ملک یا ایک مخصوص طبقہ تک محدود نہیں ہے بلکہ موجودہ دور میں جنسی حواس کا مسئلہ عالمی سطح کا مسئلہ بن گیا ہے ناول سے ایک اقتباس دیکھئے جس میں مصنف نے دو کرداروں کی آپسی گفتگو کے ذریعہ اس جنسی بھوک کی صورت حال کا جائزہ لیا ہے:

''اور خالد صاحب آپ یقین جانیے یہی روایات ہیں جو آپ کے سارے ملک میں جنسی بھوک کو متعدی بیماری کی طرح پھیلائے ہوئے ہیں۔

خالد'' جنسی بھوک کے لیے ملک اور قوم کی قید نہیں لگانا چاہیے ہر شئے ہر جگہ ملتی ہے''۔آنند'' لیکن تمہارے یہاں جنسی بھوک طاعون بن چکی ہے دیمک ہے دیمک جو نوجوانوں کی نشو و نما کو چاٹے لے رہی ہے۔آج صبح ہی کی بات ہے۔کوئی آٹھ بجے ہوں گے میرے پاس ایک ٹیلی فون آیا۔آواز نئی تھی اس لیے میں پہچان نہ سکا، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک پولیس کانسٹیبل نجی حیثیت سے بول رہا ہے۔اس نے ٹیلی

---

(۱) کالا شہر گورے لوگ۔احسان الحق۔ص 117

فون ڈائرکٹری اٹھا کر ہندوستانیوں کے نام تلاش کرنا شروع کیا تو میرا نام سامنے آگیا معاملہ یہ تھا کہ ایک صاحبزادے اکزیبیشن ہال کے کیو میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے آگے ایک لڑکی کھری ہوئی تھی۔ اور صاحبزادے باربار کسی نہ کسی بہانے اس سے ٹکرا جاتے تھے۔ ایک دفعہ دو دفعہ تین دفعہ تو اُس لڑکی نے گھور کر خفگی سے دیکھا بھی لیکن ان کے اعصاب پر تو عورت سوار تھی تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے انتہائی نامعقول حرکت کی۔ یعنی آہستہ آہستہ اس کے قریب کھسکتے گئے۔ اور پھر ایک دم اس کی پشت سے چپک کر اسے اپنی بانہوں کی گرفت میں لے لیا۔ وہ بے چاری لڑکی بری زور سے چیخی، لیکن لڑکے کی گرفت سخت ہوتی چلی گئی۔ پھر اس کے منہ سے آوازیں نکلنا شروع ہوگئیں، لوگوں نے اسے چھڑانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے، اور جب اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو وہ ہانپ رہا تھا۔ پولیس والے نے جب لڑکے کو پکڑا تو اس کے سارے کپڑے خراب ہو چکے تھے"۔

خالد: "یہ تو پاگل پن ہے"۔

آنند: "بالکل ٹھیک ہے ایک سماج کیلر کو پیدا کرتا ہے اور دوسرا سماج سیکس کے بھوکے پاگلوں کو جنم دیتا ہے"۔ [1]

آخر میں ناول نگار نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ اس جنسی حواس کی بیماری کو کوئی بھی نہیں روک سکتا، سوائے مذہب کے، اگر ہمارے اندر مذہب کی قدر اور خوف خدا دِل میں ہو تو ہم اس بیماری کا شکار کبھی نہیں ہو سکتے۔ اقتباس دیکھیے:

"جین بہت دیر سے خاموش بیٹھی سیکس پر دیئے جانے والے وعظ کو سن رہی تھی کہنے لگی، "سیکس ایک نجی مسئلہ ہے۔ اس کا تانا بانا صرف دو

---

[1] ۔ کالا شہر گورے لوگ۔ احسان الحق۔ ص: 125

انسانوں کے گرد لپٹا ہوتا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اگر وہ دو انسان بالغ ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے"۔

مونا سے ضبط نہ ہو سکا۔ "لیکن جین اس کی ہمیں کوئی نہ کوئی حد تو مقرر کرنا ہوگی۔ ورنہ بے راہ روی اتنی زیادہ پھیل جائے گی کہ پھر اس کا تدارک قابو سے باہر ہو جائے گا اور پھر یہ مسئلہ نجی مسئلہ نہیں رہے گا۔ سماجی مسئلہ بن جائے گا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جنسی آگ کو نہ ماں باپ روک سکتے ہیں اور نہ قانون۔ اس کا علاج صرف ایک ہے اور وہ ہے مذہب ...... مذہب کی قدریں اگر تمہارے اندر کوٹ کوٹ کر بھر دی جائیں تو پھر تم کو گناہ سے ڈر لگے گا۔ اس وقت ڈر لگے گا جس وقت تنہائی میں تم گناہ کرنے جا رہی ہوگی خدا کا خوف اگر دل میں ہوگا تو پھر بھٹکنے کے امکانات کم ہو جائیں گے"۔ [1]

نسلی مسائل:

1960ء کے بعد اردو میں چند ایسے ناول بھی لکھے گئے جن میں نسلی تعصب کو موضوع بنایا گیا جیسے عزیز احمد کا ناول "تیری دلبری کا بھرم" قرۃ العین حیدر کا ناولٹ "چائے کے باغ" حیات اللہ انصاری کا ناول "مدار" اور احسان الحق کا ناول "کالا شہر گورے لوگ" وغیرہ؛

یہاں ہمارے مطالعہ میں اس موضوع پر صرف "احسان الحق" کا ناول "کالا شہر گورے لوگ" ہے جس میں انہوں نے ایک ہندوستانی کردار خالد جو قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن میں مقیم ہے جہاں اس کو کالے اور گورے کے نسلی امتیاز کی وجہ سے کئی دشواریاں کا سامنا کرنا پڑتا ہے چنانچہ احسان الحق نے بڑے مؤثر انداز میں اس نسلی امتیاز کے مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

---

[1] ۔ کالا شہر گورے لوگ۔ احسان الحق۔ ص: 127

خالد کے لیےلندن میں سب سے پہلے جو مسئلہ کھڑا ہواوہ رہنے کے لیے مکان پہلے پہل وہ ایک لیڈی کے گھر میں رہنے لگتا ہے،لیکن اس لینڈ لیڈی کو خالد کا ہندوستانی کلچر پسند نہیں آتا مثلاً خالد پتلون کی جگہ پاجامہ پہن کر کمرے کے باہر نکلتا اور وہ رات میں کبھی گاؤن نہیں پہنتا وغیرہ وغیرہ چنانچہ خالد کی ان عادتوں سے بیزار ہو کر ایک دن لینڈ لیڈی خالد کو مکان خالی کرنے کے لیے ایک ہفتہ کا وقت دیتی ہے خالد پریشان ہو کر اپنے دوست ڈِک کو فون کر کے اپنی تمام حالات سناتا ہے خالد اس لیے پریشان ہے کہ لندن میں کسی کالے آدمی کو کمرہ ملنا اتنا آسان نہیں تھا۔اقتباس دیکھیے :

''اب تو ڈک کو ٹیلیفون کرنا اور ضروری ہو گیا تھا۔اس نے ایک پبلک فون اٹھایا۔چار پینی ڈال کر نمبر ملایا تو ٹیلی فون پر ڈک کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو ڈک......تم نے فون کیا تھا؟''

''ہاں تمہیں ایک دعوت دینا تھی''۔

''لیکن ڈِک میں صرف ایسی دعوت میں جا سکتا ہوں جہاں اپنا بوریا بستر ساتھ لے جا سکوں مجھے مسز تھامس نے نوٹس دے دیا ہے کیونکہ میں سلیپنگ سوٹ پر گاؤن نہیں پہنتا ہوں۔اور بحیثیت مجموعی بدتمیز آدمی ہوں''۔

ڈک:''اس میں تو کوئی شبہ نہیں خالد،لیکن میں تم سے زیادہ بدتمیز سفید چمڑی والوں سے مل چکا ہوں۔ویسے تم فکر نہ کرو میں تمہارے لیے جگہ کا انتظام کر دوں گا۔لینڈ لیڈی نے کتنے دنوں کا نوٹس دیا ہے''۔

خالد:''میں اپنے گھر کے مہذب لوگوں کو سات دن اور پریشان کر سکتا ہوں''۔

ڈک:'' سات دن میں تو اوپر والے نے ساری دنیا کی تخلیق کی

تھی"۔

خالد: "کائنات کی تخلیق اتنا مشکل کام نہیں تھا جتنا کہ ایک کالے
آدمی کو کمرہ تلاش کرنا ہے"۔ ۱

لندن میں کالے لوگوں کیلیے روزگار حاصل کرنا بھی ایک اہم مسئلہ ہے جب خالد کو جیسے تیسے رہنے کے لیے مکان ملتا ہے تو روزگار کی تلاش میں لندن شہر کے صنعتی اداروں کے چکر کاٹنے لگتا ہے۔لیکن ہر جگہ اس سے یہی کہا جاتا تھا کہ آپ اپنا پتہ چھوڑ جائے جیسے ہی نوکری کا انتظام ہو جائے گا ہم آپ کا اطلاع دے دیں گے:

"کالے لوگوں کے لیے سفید کالر کی نوکری کچھ عجیب سا لگتا ہے
انگریزوں کو اسی لیے ہر دفتر میں خالد سے ہی کہا گیا کہ آپ اپنا پتا چھوڑ
جایئے ہم جلد ہی کوئی انتظام کر دیں گے دکانوں کے کاونٹر پر بھی دودھ ملی
کافی کے رنگ کے لوگ سجتے نہیں اس لیے وہاں کام ملنے کا سوال ہی
نہیں پیدا ہوتا۔خالد نے فیکٹریوں کا رخ کیا تو پتا چلا کہ تقریباً تمام
جگہوں پر اس کے پہنچنے سے صرف پندرہ منٹ پہلے کسی کا تقرر ہو چکا
ہے۔

اب خالد کا آخری سہارا بس آنند تھا۔جو پچھلے ان گنت برسوں سے
لندن میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ماں باپ نے بیٹے کو بڑے
چاؤ اور ارمانوں سے لندن بھیجا تھا۔لیکن بیٹا بیچ راستے میں بہک گیا پھر
اتنے سے موڑ آ گئے، کہ اصلی راستے کا پتا نہ چل سکا"۔ (۲)

اسی طرح آگے مصنف نے ایک واقعہ کے ذریعہ لندن میں موجود اس کالے اور گورے کے نسلی

۱۔کالا شہر گورے لوگ۔احسان الحق۔ص: 57

(۲) کالا شہر گورے لوگ۔احسان الحق۔ص: 14-13

امتیاز کی شدت کو بیان کیا ناول میں ایک ''جان'' نامی کردار ہے جس کی بیٹی ہیلن کو ایک ہندوستانی یعنی کالے آدمی سے پیار ہو جاتا ہے لیکن ''جان'' اس کالے داماد کو قبول کرنے پر ہرگز راضی نہیں ہوتا بالآخر ایک دن ایک حادثہ میں اس کالے لڑکے کی موت ہو جاتی ہے اور اس صدمہ کو ہیلن برداشت نہیں کرتی اور وہ خود بھی خودکشی کر کے موت کو گلے لگا لیتی ہے، اقتباس دیکھئے:

''جان: ''خلاد مجھے تمہارے دیش کے ہر لڑکے سے پیار ہے ملک کوئی بھی ہو آنکھ کوئی بھی ہو، آنکھوں کی نمی ایک ہوتی ہے دل کے دھڑکنے کی آواز ایک ہوتی ہے، خالد یہ بات میں نے بہت بڑی قربانی دے کر سیکھی ہے، مجھے کالے رنگ سے نفرت نہیں تھی۔ لیکن میں محبت بھی نہیں کرتا تھا۔ اس رنگ سے ایک بے تعلقی تھی جس کو ایک ہندوستانی لڑکے نے تعلق سے بدل دیا۔ ہیلن کو جانے کیسے اس لڑکے سے عشق ہو گیا۔ میں سب کچھ برداشت کرنے کے لیے تیار تھا لیکن اپنی لڑکی کی شادی ایک ہندوستانی سے کر دینا۔ میری طبیعت نے کبھی گوارا نہیں کیا۔ کالے داماد کو گھر لانا میں اس تصور ہی سے کانپ اٹھتا تھا۔

میں ایک دیوار کی طرح ہیلن کے سامنے کھڑا ہو گیا، وہ بچی تھی اس نے بغاوت کرنا چاہی تو میں نے قانون کا سہارا لے کر بغاوت کو کچل دیا۔ ماں باپ سے آزادی ۲۱ سال کی عمر میں ملتی ہے۔ وہ صرف ۱۹ سال کی تھی پھر وہ دونوں یہاں سے بھاگ کر اسکاٹ لینڈ چلے گئے۔ کیونکہ وہاں کا قانون کم عمری میں آزادانہ شادی کی اجازت دیتا ہے مجھے اس بات کا علم ہو گیا۔ میں اسی رات اپنی کار سے ان کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔

جان ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس نے پھولوں کو ترتیب

سے رکھا۔اور پھر کہنے لگا،کاش ان کے تعاقب میں نہ نکلتا۔وہاں میں
نے پولیس کی مدد سے دوکانوں کا پتہ لگالیا۔ہوٹل پر جب پولیس نے
چھاپا مارا تو ہیلن زاروقطار رورہی تھی۔اور کرشن کو اس طرح پکڑے تھی
جیسے دنیا کی کوئی طاقت اُسے الگ نہیں کرسکتی۔لڑکے پر جھوٹے
الزامات لگا کر میں نے اسے قید کرادیا۔ہیلن تڑپتی رہی۔لیکن میرا کچھ
نہ کرسکی۔میں یہی سوچتا رہا کہ بچی ہے ٹھیک ہوجائے گی۔خالد اس
نے مجھے اس لیے زندگی بھر معاف نہ کیا۔مرتے وقت تک میں اس کی
نگاہوں میں مجرم تھا بلکہ شاید قاتل بھی تھا"۔ [1]

غریبی و مفلسی:

غریبی و مفلسی اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ابتداء ہی سے اہم موضوع رہا ہے ہر دور میں اس موضوع پر ہمارے اردو کے ناول نگاروں نے قلم اٹھایا ہے۔کہیں غریبی و مفلسی کے وجوہات بیان کیے گئے ہیں تو کہیں غریبی و مفلسی کی وجہ سے انسان کتنا مجبور ہوجاتا ہے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

غریبی و مفلسی میں ہمشہ محنت کش طبقہ و متوسط طبقہ ہی گھیرا ہوتا ہے بعض اوقات محنت کرنیوالا شخص دن بھر جان توڑ کر محنت کرنے کے بعد بھی اس کی کمائی سے وہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے دو وقت کا کھانا بھی مہیا نہیں کرسکتا۔چنانچہ ناول "ایک چادر میلی سی" سے ایک اقتباس دیکھیے جس میں منگل دن بھر یکہ چلانے کے بعد بھی اس کے پاس اتنے پیسے نہیں رہتے کہ وہ گھر میں کم از کم تیل ہی لے آئے:

"شام کو منگل گھر پہنچا تو اپنے اس چھوٹے سے دمشق کی قحط سالی
دیکھ کر سارا عشق بھول گیا۔صبح سے کھانا نہ پکا تھا۔بڑی نے کچھ چاول
اُبالے تھے لیکن بھوکی رانو نے انہیں طباق پہ ڈالا اور بنا نمک مرچ کے

---

[1] ۔کالا شہر گورے لوگ۔احسان الحق۔ص 75,76

کھا گئی، سوکھے ہی نکل گئی۔ ساس سسر تو ایک طرف، اس نے اپنے
بچوں کو بھی نہ پوچھا اور اب جنداں اسے دھکے دے دے کر باہر نکال
رہی تھی .... اور رانی پتھر پٹی مار کھا رہی تھی۔ وہ چاہتی تو ایک ہی
ہاتھ سے بوڑھی جنداں کے جسم کا رشتہ اس کی روح سے علٰحدہ کر دیتی وہ
چپ تھی اور ایک انجانے ڈر سے کانپے جارہی تھی...... منگل اس منظر کو
دیکھ کر ایک مجرمانہ احساس سے یکائن کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ آج اس نے
صرف تیرہ چودہ آنے بنائے تھے جو گھر کے نون تیل کے لیے کافی نہ تھے
''۔ [1]

غریبی و مفلسی میں انسان کو زندگی ایک بوجھ دکھائی دیتی ہے انسان غریبی و مفلسی سے تنگ آ کر اپنی ذمہ داریوں سے فرار ہونا چاہتا ہے چنانچہ ناول ایوان غزل سے اک اقتباس دیکھئے جس میں ہمایوں اپنی غریبی سے تنگ آ کر ہر دن اپنی بیوی اور بچوں پر ظلم کرتا ہے:

''اب صبح کے وقت گھر میں بڑا ہنگامہ مچنے لگا یوں تو یہ انتظامی اماں
کے وقت سے ہی اسی گھر کی روایت بن چکی تھی۔ یہاں سایا کا راج تھا
اور بتول اسپتال میں پڑی رہتی تھی۔ کبھی ٹھیک ہو کر آتی ہمایوں پھر اس کا
کوئی کل پرزہ توڑ کے میکے بھوا دیتا تھا۔ باپ کے مرتے ہی جب ہمایوں
''الف لیلٰی'' سے نکالا گیا تو واحد حسین نے اپنے اثر و رسوخ سے کام
لے کر اسے کسی دفتر میں اہلکار کروایا تھا۔ رفتہ رفتہ ہمایوں کو احساس ہوا
کہ زندگی زہر کا گھونٹ ہے اور بیوی سب سے بڑی بلا ہے، بچوں کا پالنا
اور گھر کی ذمہ داری کی خاطر اپنے اوپر ہر عیش کو حرام کر ڈالنا۔ اس سے
بڑی سزا اور کیا ہوگی۔

---

[1]۔ ایک چادر میلی سی۔ راجندر سنگھ بیدی۔ ص:36

''الف لیلیٰ'' سے نکلنے کے بعد ہی اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے
کہ کسی طرح مار پیٹ کے ہمیشہ کے لیے بتول اور بچوں سے چھٹکارا
پالے۔مگر بتول تو اس کے گلے کا ہار بن چکی تھی ۔چاہے کتنی ہی لاتیں مار
دیا ٹھوکریں لگاؤ وہ قدموں میں لوٹے جاتی جب حکم دو فوراً اپنے باپ
سے سو دو سو روپے لا دیتی ۔بچوں سے ہمایوں کو اب کوئی دلچسپی نہیں تھی
خصوصاً غزل سے تو انتہائی نفرت تھی جیسے''الف لیلیٰ'] کا جادوئی چراغ
چرانے والی یہی مکار چڑیل تھی جس نے ہمایوں کو محل سے نکال کر
جھونپڑی میں لا پھینکا تھا''۔ (۱)

غریبی و مفلسی میں جہاں انسان اپنی ذمہ داریوں سے فرار ہونا چاہتا ہے وہیں وہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے خود کو بھی فروخت کرتا ہے غرض ناول ''تلاش بہاراں'' سے ایک اقتباس دیکھئے جس میں ایک غریب کنتی نامی عورت اپنے بیٹے کو پڑھائی کا خرچ بھیجنے کے لیے خود کو گاؤں کے ایک مہاجن کو فروخت کرتی ہے:

''اس شام کنتی پہلی بار خالی ہاتھوں کوئی شئے گروی رکھنے کے لیے
نہیں صرف قرض مانگنے مہاجن کے ہاں گئی۔
گھونگھٹ کی اوٹ سے اُس نے دیکھا مہاجن کے چہرے پر بڑی
ہی پاپی مسکان تھی اُس نے کہا''کنتی رانی'' روپے تو یوں ہی نہیں ہیں
وینا سے انوپ ہو گیا ہے تم کو خالی ہاتھوں میں کیا دے سکتا ہوں کچھ لاؤ تو
بات ہے''۔
اور کنتی نے کہا تھا۔''سیٹھ جی میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔میں تو
ہر شئے آپ کے پاس گروی رکھ چکی۔اب میرے پاس کچھ نہیں ہے اور

---

(۱) ایوان غزل ۔جیلانی بانو۔ص:7

کرن کوخرچ کی ضرورت ہے تھوڑے دنوں میں کرن بابو بن جائے گا، پھر آپ کے روپے واپس کردوں گی''۔ سیٹھ نے اِدھراُدھر دیکھ کر کہا تھا۔ ''تمہارے پاس اب بھی بہت کچھ ہے کُنتی رانی تمہیں پتہ نہیں ہے۔ صرف تمہارے پاس تمہاری مدُھر مسکان ہے''۔

اور کُنتی تڑپ کر یوں پیچھے ہٹی تھی جیسے اُسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ اُسے اپنی بھی سُدھ نہ رہی بے خیالی میں اُسے گھونگھٹ کا بھی خیال نہ رہا مہاجن ہنس رہا تھا کنتی واپس چلی گئی۔

اُس دن وہ سارا وقت کانپتی روتی تانبے کی طرح کیا سمان کو دیکھتی اور ہاتھ ملتی رہی۔ اس کی قسمت میں یہ بھی بدا تھا۔ اُسے بھگوان کو پکارنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ بس وہ کانپتی روتی اور ہاتھ ملتی رہی اُسے رہ رہ کر مہاجن کے لفظ یاد آتے۔ اور پھر اس بخار کی سی کیفیت پر ایک اور خیال چھا گیا۔ کرن شہر میں بھوکا پھرتا ہوگا۔ کرن کے پاس روپے نہیں ہوں گے تو وہ کس سے مانگے گا۔ اپنے بچے کا سوکھا ہوا زرد چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ جو کہتا ماں دیکھو تو سہی تم نے مجھے روپے نہ بھیجے گاؤں میں کسی کے پاس زہر منگانے کے لیے بھی پیسے نہ تھے پجاری جی اس کا سوال سن کر ہنس پڑے بولے کُنتی رانی کیا سوال ہے روپے کہاں سے آسکتے ہیں، سمجھتی ہو کتنا قحط ہے اب تو کوئی مندر میں بھگوان کے سامنے بھی دان نہیں رکھتا ہر طرف بھوک برستی ہے۔ ایسے میں تم کو روپوں کی ضرورت کیسے آپڑی۔ کرن لڑکا ہے اپنا کام کسی نہ کسی طرح خود چلالے گا۔ تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔

اور پھر ہر طرف سے مایوس ہو کر کُنتی نے کہا مہاجن نے تو کہا تھا میرے پاس میرا اپنا آپ تو ہے۔ میری مدھر مسکان۔ اور جیسے کسی نے

اُسے نئی ہمت دے دی ہو۔ وہ اٹھی اس شام اپنی پٹاری کھول کر اُس نے برسوں کی پرانی لالی اپنی ہونٹوں پر ملی اپنے گالوں میں تھوڑا سا رنگ لگایا۔ آنکھوں میں برسوں پہلے کا سوکھا کاجل ڈالا وہ گجرا کئی بار اُس کے آنسوؤں سے ڈھل ڈھل گیا مگر اُس نے اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح تسلی دی۔ میں یہ سب کرن کے لیے کر رہی ہوں اپنے بیٹے کیلیے۔ وہ ٹھیک لکھتا ہے مجھے اچھی اور دھرم کی سیوا کی باتیں کیا پتہ ہیں۔ میرا بیٹا جب بڑا آدمی بن جائے گا تو ''وہ آگے کچھ سوچ ہی نہ سکتی تھی۔ کرن بڑا آدمی بن جائے گا پر ایسے گھور پاپ کے بعد وہ اس کی ماں کہلانے کے قابل کیسے رہے گی۔ اور کاجل نئے سرے سے اس کی آنکھوں سے چہرے پر پھیل گیا۔

رات ہو گئی وہ اپنے لالی والے ہونٹوں کاٹتی آنسوؤں کو آنکھوں میں واپس لڑکی تیزی سے مہاجن کی حویلی کی طرف جا رہی تھی۔ مہاجن نے پھر کہا'' کیا لائی ہو کنتی رانی۔ روپے تو یوں ہی نہیں ملتے اور پھر آج کل تو روپے الوپ ہو گیا ہے'' اور کنتی نے لالٹین کی روشنی میں اپنا گھونگھٹ ہٹا دیا''۔ [1]

اسی طرح ایک اقتباس ناول ''ایک چادر میلی سی'' سے ملاحظہ کیجئے جس میں رانو کی ساس جنداں اپنی پوتی کا سودا کر رہی ہے اس لیے کہ اب رانو کی بیٹی شادی کے لائق ہو گئی ہے اور ان کی معاشی حالات ایسی نہیں کہ وہ اس لڑکی کا بیاہ کر دے:

''ہزار روپے سے آتے آتے ساڑھے پانچ سو پر فیصلہ ہوا۔ اس پر جنداں کو سوچنے کا موقع دے کر، اپنی تسلی تشفی کرتے ہوئے وہ لوگ چلے

---

[1] تلاش بہاراں۔ جمیلہ ہاشمی۔ ص: 514,15,16

گئے۔ جرافہ نے موقع بھی ایسا تلاش کیا تھا جب کہ رانو گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ کپاس چننے گئی تھی۔ جنداں اب سوچ رہی تھی...... یہ رقم ان لوگوں سے لے گی کیسے؟ لڑکی انہیں دے گی کیسے؟ رانو سے تو پوچھنا ہی پڑے گا، لیکن اسے تو وہ اپنے دل سے اپنے گھر سے ہمیشہ کے لیے بے گانہ کر چکی تھی۔ پوتی بہو سے ہوتی ہے، جب بہو ہی نہیں تو پھر پوتی کیسی؟۔

اور پھر ایک لمبی سی، گھٹتی ہوئی ''کھبر دار'' کہتے، ہاتھ لپکاتے ہوئے رانو اندر چلی گئی، آخر...... وہی جھانگا، وہی رونا......! ہائے اب میں بیٹی کو بکتے دیکھوں گی؟ میں تو صرف کچھ لے کے نہیں آئی تھی تو یہ دُردشا ہوئی ...... یہ تو بک جائے گی......! اور وہ بات بات پہ اس کی ہڈیاں توڑیں گے، نوچ نوچ کے کھائیں گے۔ کہیں گے تجھے ایسے ہی تو نہیں خرید کے لائے ہیں دام دیے ہیں............ تلو کے مرحوم کے زمانے میں آخری یہی حربہ تھا رانی کا............ ''دیا تو نہیں دیا............ لیا تو کچھ نہیں؟۔ بیاہ کرلائے ہو خرید کے تو نہیں لائے؟'' اور یہ بیٹی میری بک جائے گی............؟'' گھر میں کھانے کو کچھ نہیں۔ بیاہ ہوگا بھی تو کیسے ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا۔ آج مہربان داس چودھری ہوتا، ایک ہی رات میں بیٹی کا جہیز تیار کر لیتی اور پھر اسے اپنے سامنے طولیاں بجاتی، ناچتی گاتی ہوئی برات، سہرے باندھے ہوئے لڑکے کے حوالے کر دیتی اور جب ڈولی اٹھتی تو دور کھڑی دیکھتی، روتی، دیکھتی...... لیکن کبھی نہ کہتی...... بیٹی! تیرے سہاگ کے لیے رات ایک ماں نے اپنا سہاگ لٹا دیا............؟''

پھر............! پانچ ساڑے پانچ سو ملیں گے تو یہ چھاچھاں مجھے کچھ

دے گی تھوڑے ہی ....؟ آخر ...... بیچنا ہی ہے تو ایک ہی بار
ساڑھے پانچ سو میں کیوں، کیوں نہ میں اسے لے کر شہر نکل جاؤں اور
تھوڑا تھوڑا کر کے بیچوں؟ لاہور میں سینکڑوں ہزاروں بانولوگ پھرتے
ہیں جو کچھ دیر کے دل بہلا دینے کے لیے پندرہ پندرہ بیس بیس روپے
دے جاتے ہیں کھانے کو چنگی چوکھی ملے گی، پہننے کو ریشم ...... کھین
کھاب .... تھوڑے ہی دنوں میں روپوں اور کپڑوں سے صندوق
بھر جائیں گے...... جب ہی رنا ٹے کے ایک تھپڑ کی آواز سنائی دی جو
رانو نے خود ہی اپنے منہ پر مارا دیا تھا...... اور اب ہمیشہ کی طرح ایک
ان جانے خوف سے کانپنے لگی تھی''۔ [1]

غرض غریبی اور مفلسی ایک ایسی بیماری ہے کہ اس میں اکثر بیشتر طبقات گھیرے ہوئے ہیں۔ بعض حالتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص غریبی و مفلسی کو دور کرنے کے لیے اپنی عمر کے اس حصہ میں بھی کام کرتا ہے جہاں اس کے لیے کچھ کرنا بھی دشوار ہے اقتباس دیکھئے:

''میری کلینک میں نرس ہیں۔ وہ ایک آبائیں ہیں۔ کئی ان میں
بوڑھی ہیں۔ بیمار بھی رہتی ہیں۔ ارے بھائی بیٹے بیٹیاں بہو دیں سب
ہیں۔ مگر یہ بیچاری عورتیں کام کرنے پر مجبور ہیں اور وہ لوگ پیسہ الٹا ان
سے اینٹھ لیتے ہیں۔ ایک عورت میرا علاج کرا رہی ہے عمر پینسٹھ ستر سے
کم نہ ہوگی۔ ہاتھ کی ہڈی بھی ٹوٹ چکی ہے۔ کھانسی دمہ کیمریض ہے۔
مگر چار گھروں میں مسالہ، برش جھاڑو کا کام کرتی ہے۔ ایک بیٹی بیا ہنے
کو ہے۔ ایک بیٹا دق میں مبتلا ہے۔ چھوٹا کمار ہا ہے مگر اسے کچھ نہیں دیتا
...... میں علاج کر سکتی ہوں مگر ان دکھوں کا علاج کیا ہے؟''

---

[1] ایک چادر میلی سی۔ راجندر سنگھ بیدی۔ ص: 45,46,47

''سروج بہن اس طبقے کی یہ حالت تو اس غریبی اور مفلسی کی وجہ سے
ہے جو ہمارا مقدر بن گئی ہے۔اب تک ہمارے دیس کی حالت نہیں بدلی
ہے''۔ ۱؎

ہمارے معاشرے میں غریبی و مفلسی بڑھنے کی ایک اہم وجہ بیماری ہے خصوصاً متوسط طبقہ میں موجود دور میں متعدد بیماریاں ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں جن کے علاج کے لیے اس قدر پیسہ خرچ کرنا پڑتا ہے کہ ایک اچھا خوشحال آدمی بھی غریبی و مفلسی میں مبتلا ہو جاتا ہے چنانچہ علیم مسرور کے ناول ''بہت دیر کردی'' سے ایک اقتباس دیکھئے جس میں کائنات کی غریبی کی داستان سنائی گئی ہے:

''ہم لوگ غریب نہیں تھے۔غریب ہو گئے ہیں کائنات کے ابو بہت
شوقین تھے ہم لوگوں کی پرورش دل وجان سے کرتے تھے۔کوئی دوکان
نہیں تھی کمیشن کا کام کرتے تھے اپنی کمائی کا بڑا حصہ ہم لوگوں کی ناز
برداری میں خرچ کر دیتے تھے۔پندرہ بیس ہزار روپیہ جمع بھی کر لیے
تھے، کائنات کی شادی دھوم دھام سے کرنے کا ارمان تھا۔بیٹی پیدا ہوئی
تو بڑی محبت سے اس کا نام کائنات رکھا۔کیا خبر ہم لوگوں کی کل کائنات
یہی ہوگی۔شکر کے مریض تھے اچانک دل کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔
چھ مہینے زندگی اور موت کی کش مکش میں گذارے سارا روپیہ ان کے
علاج کی نذر ہو گیا۔کوئی اور کمانے والا ہوتا تو شاید ابھی جیتے۔اپنی غریبی
کے دکھ میں چل بسے......!'' ''کتنے دن ہوئے؟'' داؤد نے تعزیتی
انداز میں پوچھا۔ایک سال''۔ماں نے کہا۔ان کی آنکھیں بھیگ چکی
تھیں۔کائنات بھی افسردہ تھی۔
ماں نے پھر کہا

۱؎ گوری سوئے سیج پر......صالحہ عابد حسین۔ص 128

''بمبئی میں پیسے کے بغیر ایک دن کاٹنا مشکل ہے ہم لوگوں نے
سال گذار دیا۔ مت پوچھو کیسے گذارا......!'' [1]

غریبی و مفلسی کے بڑھنے کی دوسری اہم وجہ مہنگائی ہے ایک متوسط طبقہ کا آدمی جتنا کماتا ہے اس سے وہ ایک خوش حال زندگی نہیں گذار پا رہا اس کی وجہ مہنگائی ہے غرض صالح عابد حسین اس کی طرف اپنے ناول ''گوری سوئے سیج پر''میں اس طرح اشارہ کیا ہے:

''یہ تو بات نہیں ثریا بھابی۔ آپ دیکھئے مزدوروں کی حالت بہت بدلی ہے۔ مستریوں، کاری گروں کی اجرتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ بہتر کپڑے ہیں۔ سائکلیں ہیں۔ ریڈیو یا ٹرانسسٹر ہیں۔...... تیل کے چولہے ہیں عورتوں کے جسم پر زیور ہیں ان کے پاس اب دو چیزیں ہیں جن کا محنت کش طبقہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا......!''

مگر یہ چیزیں سب کے پاس نہیں ہیں۔ بڑے شہروں کو چھوڑ دو گاؤں اور قصبوں میں ان کی حالت اتنی اچھی نہیں ہے، سروج بہن...... اور اس کا سبب ہے۔ مہنگائی کمر توڑ مہنگائی۔ جتنی آمدنی ہوتی ہے۔ سب کھانے میں خرچ ہو جاتی ہے۔ پھر بھی پیٹ بھر نہیں ملتا۔ بیماریاں، ناقص غذائیں اوپر سے اور تباہ کر رہی ہیں......''۔(۲)

مادیت پرستی اور بے اعتنائی:۔

موجودہ معاشرے میں اکثر و بیشتر لوگ مادیت پرستی کا شکار ہو گئے ہیں انہیں نہ تو عزت کی فکر ہے نہ ہی رشتے ناتوں کے ٹوٹنے کا ڈر ہے انسان صرف اور صرف پیسہ کے لیے جینا چاہتا ہے پیسے کے لیے کبھی کبھی یہ انسان اپنوں کا بھی استعمال کرتا ہے چنانچہ اردو ناول میں سماج کی ان بگڑتی ہوئی قدروں کو

---

(۱)۔ بہت دیر کر دی۔ علیم مسرور۔ ص:83

(۲) گوری سوئے سیج پر۔ صالحہ عابد حسین۔ ص:128

بھی موضوع بنایا ہے۔غرض ناول ایوان غزل سے ایک اقتباس دیکھئے جس واحد حسین کا بیٹا پیسہ کمانے کی خاطر اپنی بھانجی چاند کا استعمال کرتا ہے اور اُس کی زندگی کے بارے میں کبھی نہیں سوچتا:

''اصل میں چاند کے بگڑنے میں اس کا بھی کیا قصور ہے وقت پر اس
کی شادی ہو جاتی تو آج کیوں یہ دن آتا۔لیکن راشد کو چاند سے اتنے
کام لینے تھے شادی کیسے کرتے......!'' [1]

ہمارے معاشرے میں پھیلے اس مادیت پرستی اور بے اعتنائی کو''صالحہ عابد حسین نے اپنے ناول''گوری سوئے سیج پر''میں بڑے کرب کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس ناول میں دو مرکزی کردار، سہیل، اور ان کی بیوی، مہرو اور ان کی اولادیں خورشید، شاہین، تنویر، عالیہ، غزالی ہیں۔ دولڑکیاں خورشید اور عالیہ، دونوں کی شادی ہوتی ہے اور وہ اپنے سسرال چلی جاتی ہیں۔ بیٹے شاہین، غزالی اور تنویر، پیسے کمانے کے خاطر ملک چھوڑ کر پردیس جا بستے ہیں اور اس طرح سے سہیل اور ان کی بیوی، اپنے آبائی مکان میں اکیلے رہنے لگتے ہیں یہ حالات ہمارے معاشرے میں اکثر و بیشتر گھروں کی ہے کہ نوجوان پیسے کمانے کے لیے اپنے بوڑھے ماں باپ کو ان کے حال پر تنہا چھوڑ جاتے ہیں، ناول سے ایک اقتباس دیکھئے:

''ماں کہتی ہیں وہ سہیل انکل سے دس بارہ سال چھوٹی ہیں مگر ان
سے زیادہ بوڑھی لگتی تھیں۔ان کے اندر جیسے گھن لگ گیا تھا۔پچھلی بیماری
میں جب میں آکر ان کے پاس رہی تھی.......... ہائے ثریا بھابی کیسا وہ
ایک ایک کا نام لے کر بے ہوشی میں پکارتی تھیں۔ہاتھ سے ٹٹولتی تھیں،
......تنو......غزالی......بھیا......آگئے......شاہین......خورشید......مگر کوئی
بھی کمبخت نہیں آیا......!!بس سنا ہے بعد میں خورشید آئی تھی وہ بھی چند
دن کے لیے''۔

---

[1] ۔ایوان غزل۔جیلانی بانو۔ص:146

سروج ہمارے ہاں بھی بڈھوں کا مسئلہ بڑھتا جا رہا ہے۔اگرچہ ابھی
دیہات اور چھوٹے شہروں میں یہ مرض زیادہ نہیں ......مگر نوجوانوں کو
باہر جا کر کمانے کی دھن رہتی ہے۔چاہے وہ ہندوستان کے بڑے شہر
ہوں یا دوسرے ملکوں میں جانا ہو......''۔ [1]

سہیل میاں اپنے بیٹے تنویر کو بزنس کرنے کے لیے آموں کا باغ بیچ کر پیسہ دیتا اور تنویر یہ کہہ کر اپنے باپ سے پیسہ لیتا ہے کہ بزنس جمتے ہی وہ سب روپیہ واپس کر دے گا یا ماہانہ مقررہ رقم بھیجے گا۔لیکن برسوں بعد صرف پانچ ہزار روپے یہ کہہ کر بھیج دیتا ہے کہ بڈھے آدمیوں کا خرچ ہی کیا ہوتا ہے چنانچہ اولاد کی اس بے اعتنائی کو صالحہ عابد حسین نے بڑے کرب کے ساتھ بیان کیا ہے:

''آہ............اف......وہ یہ سب کیوں بھول گیا؟ جب برسوں بعد
اس نے پانچ ہزار روپے بھیجے اور ابا میاں نے واپس کر دیئے کہ یہ بھی تم
ہی رکھ لو تو وہ یہ کیوں نہ سمجھا کہ یہ بات انہیں ناگوار گذری ہے......وہ
پچاس ہزار نہ ہی تیس ہزار پچیس ہزار کچھ تو واپس کرتا۔یا ماہانہ خرچ ہی
دیتا۔دو سو روپے تو بھیجنا شروع کیے تھے۔مگر اماں کی خفگی کا خط آیا۔تو
وہاں عیش کر رہا ہے اور ہمیں دو سو روپے بھیجتا ہے! یاد رکھ ہم تیرے محتاج
نہیں۔اب بھی چار کو کھلا کر کھا سکتے ہیں۔نازنین نے اس کے غصے میں
تیل ڈالا تھا۔اور اسے سمجھایا تھا کہ ان کے پاس اپنے خرچ کو بہت ہے
......پھر بھی وہ کچھ دن تک بھیجتا رہا مگر جب اسے معلوم ہوا کہ اس کے
بھیجے ڈرافٹ کیش کرائے ہی نہیں جاتے تو وہ روٹھ گیا......وہ سمجھتا تھا کہ ابا
میاں کو اس کی پروا نہ رہی خرچ کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے۔بڈھے
آدمیوں کا خرچ ہی کیا ہوتا ہے؟ اور مجھے اپنے بچوں کو اونچی تعلیم دینی

---

[1] ۔کوری سوئے سیج پر۔صالحہ عابد حسین۔ص:126

ہے باہر کے ملکوں سے وہ اعلیٰ ڈگریاں لیں گے۔انہیں سیٹل کرنا
ہے......"۔ [1]

جب سہیل میاں بیمار ہوتے ہیں تو ان کی لڑکی شاہین ان سے ملنے آ کر گھر کے بجائے ہوٹل میں ٹھہرتی ہےاور جب ماں کوفالج اثر ہوتا ہےتو سُن ٹال دیتی ہے":

"مگر......اب پیسہ کی چمک دمک نے......میاں کی دولت نے......
عیش وآرام کی زندگی نے میری لاڈلی کو کیسابدل دیااللہ میاں............
یہ......یہ وہی شاہین ہے؟ یقین نہیں آتا......دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے
......یہ تو کبھی سوچا بھی نہ تھا......ہائے میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے کس سے دل
کا درد کہوں پہلے تین کا دکھ تھا۔اب چوتھی کی بے وفائی............بے محبتی
نے تو اندر والے کو گھن لگا دیا۔ !اس کے ابو بیمار پڑے مجھے موت نظر
آرہی تھی !اور وہ آئی تو ہوٹل میں رہی.........بیگموں کی شان سے
کھڑی کھڑی آتی اور دیکھ کر چلی جاتی......اور محبت اور ماَمتا کا بدلہ
روپے سے کرنا چاہتی تھی......ہائے شاہین......میرے لیے تو یہ بھی نہ کیا
......جس کی ماں فالج میں پڑی ہو......اور بیٹی سن کر ٹال جائے۔نہ جنتی
ایسی اولاد ......کاش بے اولاد ہی ہوتی تو صبر تو ہوتا......دوسرے رحم کھا
کر خدمت کر دیتے۔(۲)

ایک دفعہ خورشیدا اپنے بھائی غزالی اور دوسرے بھائیوں کو ماں باپ کی اطاعت اور خدمت کرنے کا مشورہ دیتی ہے تو دیکھئے جواب میں بھائیوں نے کس طرح کی بےاعتنائی ظاہر کرتے ہیں:

"بھیا۔ماں باپ کی اطاعت اور خدمت کا یہی وقت ہےاب یہ کچھ
عرصے کے مہمان ہیں۔ہوسکتا ہے تم ان سے خفا ہوگمان کا غصہ، خفگی یاد

---

[1] کوری سوئے سیج پر۔صالحہ عابد حسین۔ص:125

(۲) کوری سوئے سیج پر......صالحہ عابد حسین۔ص:156

کرنے کی جگہ ان کی خدمت ان کی محبت ان کا ایثار وقربانی یاد کرو۔ یہ وقت ان کو سہارا دینے کا ہے مدد کرنے کا ہے۔خدمت کرنے کا ہے وہ تو ایک اچھے نوکر تک نہیں رکھ سکتے ،تم لوگ ،ماشاءاللہ ہزاروں کمارہے ہو تمہاری اولادیں لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پارہی ہیں عیش سے رہتے ہو! کس کی بدولت؟ انہیں ماں باپ کی جوتیوں کا تو صدقہ ہے............"

اور بھی یاد نہیں کیا کیا لکھا تھا۔اسے اُمید تھی کہ جواب نہ آئے مگر بھائی خود آئیں گے اماں اور ابا میاں کے پاس ،مگر کچھ بھی نہ ہوا۔تنویر بھیا نے اکھڑا اکھڑا جواب دیا" باجی تمہارا نصیحت نامہ ملا۔اماں کی بیماری کی خبر سے بہت قلق ہوا مگر ہمیں تو ادھر ادھر سے خبر ملی۔ابا میاں نے کچھ بھی نہیں لکھا۔روپیہ تو کئی بار میں نے بھیجا تھا مگر ابا میاں نے واپس کردیا۔اب میں ان کو پچاس ساٹھ ہزار روپیہ تو بھیج نہیں سکتا۔ اتنے کی ان کو ضرورت بھی کیا ہے آخر میرے بچے ہیں ،دو جوان ہیں ان کی تعلیم کا بہت خرچ ہے چھوٹے بچوں کا خرچ بھی ہے اور پھر ان کا مستقبل بھی ہمیں بنانا ہے بزنس کوئی خاص نہیں......خدا جانے کیوں سب کو یہ خیال ہوجاتا ہے کہ جو باہر جاتا ہے وہ لکھ پتی ہوجاتا ہے۔ کہاں سے اتنا روپیہ لاؤں کہ ہزار دو ہزار ہر مہینے ان کو بھیجوں؟ مگر تمہارے کہنے کے مطابق سوڈالر ابھی روانہ کردیے ہیں۔میں یا نازنین ابھی نہیں آسکتے۔ہمارا بزنس یہاں یہاں منتقل ہونے والا ہے۔شاید مجھے حیدرآباد کی شاخ میں بھیجا جائے گا۔اس وقت ضرور ابا میاں اور اماں کے پاس جانے کی کوشش کروں گا۔ابا اور اماں کی خیریت تم مجھے لکھ دیا کرنا......اور تو کسی سے اُمید نہیں..........."اف بھیا......تمہیں اپنی

اولاد کی فکر ہے۔بیوی کی خوشنودی کی تو سدا ہی فکر رہی۔سسرال والوں
کا کتنا خیال ہے......اور ابا میاں کی بیماری کے لیے سو ڈالر ساڑھے آٹھ
سو روپے بھیجے ہیں......شرم آنی چاہیے"۔ لے

آخر کار ایک دن سہیل میاں کی بیوی مہرو کا انتقال ہوتا ہے ان کے ایک دوست اختر علی کی کا بیٹا ناز ش،غزالی کو اس کی اطلاع دیتا ہے تو جواب میں غزالی کہتا ہے کہ میں اب اس وقت نہیں آ سکتا تم سب کو میری مجبوری بتا دینا میں آؤں گا لیکن کچھ عرصے کے بعد:

"ہو۔ہو از اسپیکنگ......"
"غزالی میں ناز ش بول رہا ہوں۔دلی سے"
"ماؤ......ناز ش......کہو کیسے یاد آ گئی۔خیریت ہے"
"نہیں"......اور اس کی آواز بھرا گئی۔
"کیا ہے۔کیا بات ہے پاپا کیسے ہیں؟"
غزالی کے لہجے میں تشویش تھی۔
"تمہاری ماں آج اس دنیا سے چل بسیں"۔
تمہاری جدائی کا داغ دل پر لئے"۔
دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی۔جب غزالی بولا تو اس کی آواز
آنسوؤں سے بھیگی محسوس ہو رہی تھی۔"پاپا کا کیا حال ہے"۔
"کیا حال پوچھتے ہو۔اب آؤ گے تو دیکھ لینا۔آ رہے ہو نا......"کسی
نے کچھ پوچھا۔غزالی کا جواب اس نے سنا۔"ممی......ممی کی ڈتھ
ہو گئی"۔تم آ جاؤ غزالی ہم پرسوں تک انتظار کر لیں گے"۔
"کل......نہیں......کل کیسے چل سکتا ہوں امپوسبل" کوشش کر کے۔
اماں کی زندگی میں تو مل نہ سکا۔اب ان کو مردہ نہیں......ناز ش نہیں......"

لے۔گوری سوئے سیج پر۔صالحہ عابد حسین۔ص:77

''اپنے پاپا کا تو خیال کرو غزالی......''

میں آؤں گا......آؤں گا پاپا کے پاس...... یہاں کے کاموں سے نبٹ لوں بہت ضروری کام پھیلے ہیں۔ تم پاپا سے کہہ دینا۔ اس وقت آنے سے مجبور ہوں میرے پور پاپا۔ میں سچ مچ ان کی طرف سے پریشان ہوں۔

نازش۔ ممبئی پر وہ خدا تھے۔ نازش کے منہ سے مایوسی میں نکلا۔

تو تم نہیں آؤ گے۔ اپنی ماں سے ملنے''۔

''ماں اب کہاں ہیں؟ کاش...... کاش''

وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔

ہاں کہو غزالی کاش...... کیا......''

''نہیں کچھ نہیں'' ایک اوہ کے ساتھ غزالی نے کہا'' پاپا اور باقی سب لوگوں کو میری مجبوری بتا دینا...... مگر میں آؤں گا نازش...... کچھ عرصہ بعد نازش نے ریسور پٹخ دیا۔(۱)

مادیت پرستی اور اولاد کی خودغرضی و بے اعتنائی کو' جمیلہ ہاشمی نے بھی اپنے ناول ''تلاش بہاراں'' میں پیش کیا ہے:

میں کچھ بھی بھولنا نہیں چاہتی میں کسی چیز سے انکار نہیں کرنا چاہتی میں اکیلے درخت کی طرح صحراؤں کے سینے پر پھیلنے کے حق میں نہیں ہوں مگر میں تو ایک الگ ہستی چاہتی ہوں۔ عورت کی یہ ذلالت مجھ سے سہی نہیں جاتی کرشنا''۔ اس کی آواز میں دکھ ہوتا ہے۔''تم اس عورت کے غرور کو کس چیز سے شکست دو گی جو کل کلبلاتے کپڑوں سے تنگ آ کر مرگئی اور پھر بھی اس کی آنکھوں میں اولاد کی بے اعتنائی کے باوجود ایک

---

(۱) گوری سوئے سیج پر۔ صالحہ عابد حسین۔ ص 72۔

غرور تھا۔ کیا تم اس غرور کو درخت کی وارفتگی سمجھتی ہو؟''

کنول اداس ہوگئی۔

''کون عورت؟'' میں نے ان کی لمبی بحث سے تنگ آ کر پوچھا

''نیرا سے پوچھو بھیا'' کرشنا نے کہا

''مجھ میں تو کچھ بتانے کی ہمت نہیں''

قریب بیٹھی تیزی سے سلائیاں چلاتی ہوئی نیرا نے سر اٹھا کر کہا ''قریب کے گھر میں کوئی سپرنٹنڈنٹ رہتے ہیں ان کی بوڑھی ماں کل مرگئی بھیا اس کے جسم میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ اتنی دور سے بو آیا کرتی تھی کمرے کے باہر کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ رات کو اکثر روتی اور کراہتی رہتی۔ میں ہی ایک دو بار جا کر حال پوچھ آئی۔ بہوئیں تین جوان بیٹے تینوں بڑے بڑے افسر کسی نے علاج نہیں کروایا۔ بہوئیں اپنی اولاد میں مگن رہتیں۔ کوئی نوکر بھی بڑھیا کے پاس نہیں جاتا تھا۔ وہ بے چاری مرگئی''۔ و نیرا پھر تیزی سے اپنی سلائیاں چلانے لگی۔

میں ان جانے ہی اپنے دل میں سردی کی ایک رو سے کانپ گیا۔ ساری عمر انسانی کیڑوں نے عورت کے سینے سے زندگی کی قوت اور حسن چاٹا اور مرتے سمے ننھے ننھے کلبلاتے کیروں نے اس مہم میں سڑاند پیدا کردی جس میں کچھ باقی نہ رہا تھا۔ جب طاقت اور خون باقی نہیں رہتا تو جسم میں بو پیدا ہو جاتی ہے کیا اس عورت کے دل میں مرتے سمے یہ غرور تھا کہ اس کے بیٹے خوش رو بلند اور باوقار ہیں۔ اس کی اولاد خود دو بیلوں کی طرح بڑھ اور پھیل رہی ہے۔ کیا اس کے ناسور میں سرسراتے کیڑوں نے اسے کبھی یہ احساس نہیں دلایا کہ اس کے وجود سے باہر قہقہے لگاتے ہنستے اور دوڑتے ہوئے بچے بھی کیڑے ہیں جو اس

کے وجود کا سارا حسن اس کی راتوں کی نیندیں اس کے چہرے کی ساری تازگی چاٹ کر بڑھے اور پروان چڑھے ہیں میں خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔(۱)

(۱) تلاش بہاراں، جمیلہ ہاشمی، ص 214

باب چہارم

اختتامیہ

اختتامیہ

ادب بنیادی طور پر اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا اظہار ہوتا ہے۔اس لئے ماہرین کا خیال ہے کہ ادب اپنی بنیادی حیثیت میں انفرادی نہیں بلکہ سماجی عمل ہے کیونکہ ادیب سماج کا ایک فرد ہوتا ہے اور اپنا موضوع و مواد بھی وہ سماج ہی سے حاصل کرتا ہے۔کوئی ادیب اپنے عہد اور ماحول سے بے نیاز ہوکر اعلیٰ ادب تخلیق نہیں کرسکتا۔چنانچہ ہر ادبی تخلیق کسی نہ کسی صورت میں اپنے عہد کے سماج اور سماجی مسائل کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ادب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم کسی قوم یا ملک کی اجتماعی زندگی میں پیدا ہونے والے تغیرات و انقلابات کا عکس صاف دیکھ سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب سیاسی، سماجی اور معاشی حالات بدلتے ہیں تو ادب بھی اس سے متاثر ہوتا ہے۔

اردو ادب کی دیگر اصناف کی طرح اردو ناول بھی اپنے ابتدائی وارتقائی زمانے سے لے کر موجودہ دور تک اپنے عہد کے سیاسی، سماجی و معاشی مسائل کی عکاسی کرتا رہا ہے۔اردو میں ناول نگاری کی روایت انگریزی زبان سے آئی۔1857ء کی پہلی جنگ آزادی کی شکست کے بعد ہندوستان مکمل طور پر انگریزوں کے زیر اقتدار آ گیا۔اس کے نتیجہ میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی حالات میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ان بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ سماج میں کچھ اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں اور ہندوستانی معیشت نے صنعتی دور میں قدم رکھا،غرض ان تمام تبدیلیوں سے اردو ادب بھی متاثر ہوا چنانچہ سرسید اور ان کے رفقاء نے اردو ادب کو نوابوں کے درباروں اور خانقاہوں سے نکال کر جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا اور اس کا رشتہ عوام کی زندگی اور ان کے سماجی مسائل سے

جوڑا، اسی زمانے میں داستان کی جگہ ناول کی صنف نے لے لی اور دیکھتے ہی دیکھتے ناول کو اردو ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل ہوگیا۔ اردو کے ابتدائی دور کے ناولوں کا مزاج اور مذاق انگریزی کے ناولوں کی طرح اصلاحی اور تاریخی رہا لیکن بعد میں اس کی روایت میں کافی توسیع ہوئی اور اس میں بہت سے تجربات کئے گئے۔

اردو کے پہلے ناول نگار نذیر احمد ہیں۔ ان کے تمام ناول عصری مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ نذیر احمد کا اصل مقصد مسلمانوں کی اصلاح تھا۔ ان کے ابتدائی ناولوں میں مراۃ العروس، اور بنات النعش، کا موضوع لڑکیوں کی تعلیم وتربیت ہے۔ نذیر احمد لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کو اس لئے ضروری سمجھتے تھے کہ آنے والی نسل انھیں کے آغوش میں پروان چڑھتی ہے۔ غرض نذیر احمد کے تمام ناول اصلاح کے اردگرد نظر آتے ہیں۔ ان کے چند ناول ایسے بھی ہیں جو گھر کی چار دیواری اور امور خانہ داری کے مسائل پیش کرتے ہیں یا کسی سماجی برائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جیسے ان کا ایک مشہور ناول ''ایامی'' جس میں انھوں نے سماج کی ایک بڑی خرابی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بیوہ کی دوبارہ شادی نہ ہونا ایک لڑکی کی ترقی یافتہ سوچ اور جدید ماحول سے اسے کس طرح روشناس کرایا جائے۔ مسلم گھرانوں میں مغربی تہذیب کس طرح داخل ہورہی ہے وغیرہ۔ نذیر احمد کا سب سے اہم ناول ''ابن الوقت'' ہے جس میں انھوں نے مشرقی اور مغربی تہذیب وتمدن کی کشمکش کو پیش کیا ہے، اور مغرب کی اندھی تقلید پر طنز کیا ہے۔ نذیر احمد کے تمام ناول ان کے سماجی شعور اور بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ مسلم معاشرے کو نئی جہت عطا کی۔ اسے فرسودہ رسم ورواج سے اجتناب کا درس دیا اور جدید فکرونظر سے روشناس کروایا۔ نذیر احمد کے موضوعات گھر اور گھر کی چار دیواری میں ضرور ہے مگر ان تحریروں نے زندگی کے دوسرے حقائق سے بھی آنکھیں چار کیں اور فکشن کو رومانی اور داستانی ماحول

سے نکال کر صداقت اور حقیقت سے روشناس کیا۔

نذیر احمد کے بعد اردو کے دوسرے اہم ناول نگار رتن ناتھ سرشار ہیں سرشار کے ناولوں کا پس منظر سلطنت اودھ کے خاتمے کے بعد کا لکھنو ہے جس میں نوابی عہد کی تہذیب وتمدن کے اثرات ابھی باقی ہیں۔ نذیر احمد کی طرح سرشار کے یہاں بھی اصلاحی جذبہ کارفرما ہے۔ ان کا ایک اہم ناول ''فسانہ آزاد'' ہے جس میں انھوں نے ایک طرف اس عہد کے لکھنوی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے تو دوسری طرف عورتوں کی تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور سماج کے فرسودہ روایتوں کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ ''جام سرشار''، ''سیر کہسار'' اور دیگر ناولوں میں انھوں نے نوابوں اور امراء کی عیش کوشی اور شراب نوشی کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور اسی کو لکھنوی تہذیب وتمدن کے زوال کا سبب قرار دیا ہے۔

سرشآر کے بعد لکھنوی تہذیب و معاشرت اور سماجی مسائل پر قلم اٹھانے والے قابل ذکر ناول نگار عبدالحلیم شرؔر ہیں انھوں نے زیادہ تر تاریخی ناول لکھے ہیں لیکن ان کے چند ناول ایسے بھی ہیں جو سماجی ناول کے زمرے میں آتے ہیں جیسے ''بدرالنساء کی مصیبت'' اور ''آغا صادق کی شادی'' وغیرہ میں انھوں نے پردے کے خراب نتائج دکھاتے ہوئے مسلم عورتوں کو یہ درس دیا ہے کہ وہ گھر کی چار دیواری سے باہر نکلیں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ شرؔر لکھنوی فرسودہ تہذیب کو بھی اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے اور معاشرہ پر چھائی ہوئی توہم پرستی، کم علمی، فرسودہ روایات وغیرہ کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔

سجاد حسین انجم نے ''نشتر'' میں طوائف کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ انجم کے خیال میں سماجی اور معاشی حالات کے دباؤ کے تحت ایک عورت طوائف بننے پر مجبور ہوتی ہے۔ قاری سرفراز حسین عزمی کے ناولوں کا موضوع بھی طوائف ہے۔ ان کا نمائندہ ناول ''شاہد رعنا'' ہے۔ انھوں نے اس ناول میں طوائفوں کی زندگی کی عکاسی اس انداز میں کی ہے کہ ان سے نفرت اور بیزاری کی بجائے ہمدردی کا

جذبہ پیدا ہوتا ہے۔منشی سجاد حسین نے اپنے ناول ''کایا پلٹ'' میں جاگیردارانہ نظام، کسانوں اور مزدوروں کے استحصال اور ''میٹھی چھری'' میں جاگیرداروں اور زمینداروں کی عیش وعشرت میں ڈوبی ہوئی زندگی کی عکاسی کی ہے۔

اردو ناول کی تاریخ میں مرزا محمد ہادی رسوؔا کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔انھوں نے اردو ناول کو ایک نیا موڑ دیا اور اپنے ناولوں کے ذریعہ لکھنو کے زوال پذیر معاشرے کا آئینہ دکھایا ہے، جیسے ناول ''افشائے راز'' کے ذریعہ لکھنو کی معاشی زبوں حالی کا نقشہ پیش کیا ہے۔معاشرتی اعتبار سے ان کا ناول ''امراؤ جان اداؔ'' بے حد مقبول ہوا۔جس میں انھوں نے طوائفوں کی زندگی کے حالات کی مدد سے وہ پورے سماجی حالات کو پیش کیا ہے اور لکھنوی معاشرے کے زوال کی داستان بھی بیان کی ہے۔رسوا نے ''شریف زادہ'' کے ذریعہ اس زوال پذیر معاشرے کو اصلاح کی راہ دکھائی اور سائنس وٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنے اور صنعت وحرفت کو اپنانے پر زور دیا ہے۔غرض رسوا کے تمام ناولوں کے ذریعہ بالعموم اردو ناول کے سفر میں ایک نئی لہر دوڑی ہے۔

نذیر احمد، سرشارؔ، شررؔ، رسوؔا کے ناولوں کے ذریعہ اردو ناول کا ارتقائی سفر بیسویں صدی میں داخل ہوا۔بیسویں صدی کی ابتداء میں پریم چند اردو ناول کے افق پر ہر درخشاں کی طرح نمودار ہوئے اور ان کے ساتھ اردو ناول نگاری ایک نئے اور تابناک دور میں داخل ہوئی، پریم چند ادب برائے زندگی کے علمبردار تھے اور ادب اور سماج کے رشتے پر ان کی گہری نظر تھی چنانچہ انھوں نے اردو ناول کا رشتہ سماج کے کمزور اور مظلوم طبقوں سے جوڑا۔پریم چند اپنے ناولوں کا مواد اپنے گرد وپیش کی زندگی سے حاصل کرتے ہیں اور اپنے عہد کے سماجی مسائل کی بنیاد پر ان کی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔

پریم چند نے ناول ''اسرار معابدہ'' کے ذریعہ مہنتوں اور پجاریوں کی سیہ کاریوں کا پردہ فاش کیا

ہے تو ''ہم خرما و ہم ثواب'' کے ذریعہ مذہب کے فرسودہ تصورات اور غلط قسم کے رسم و رواج کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ بیواؤں کے مسئلہ کی طرف بھی خاص طور پر توجہ دلائی ''جلوہ ایثار'' میں کم عمر کی شادی، بے جوڑ شادی اور توہم پرستی جیسی سماجی خرابیوں کے خلاف آواز بلند کی ''بازار حسن'' میں انھوں نے طوائفوں کے مسئلہ کو موضوع بنا کر رشوت، جہیز اور مذہب کے نام پر استحصال جیسی سماجی خرابیوں پر سخت تنقید کی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا اور اس کے ساتھ ہی اردو ناول بھی اپنے عہد کا نگار خانہ بن کر سامنے آیا۔ چنانچہ اس دور میں پریم چند کے فکر و نظر میں کافی وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی۔ گاندھی جی کے خیالات اور نظریات سے متاثر ہوئے اس سے پہلے پریم چند صرف سماجی مسائل کی عکاسی پر اکتفا کرتے تھے اور سیاسی مباحث سے گریز کرتے تھے لیکن اس دور میں انھوں نے سماجی مسائل کو سیاسی تناظر میں دیکھنا شروع کیا۔ غرض ناول ''گوشۂ عافیت'' میں انھوں نے کسانوں کے بنیادی مسائل پر توجہ کی اور گاؤں کی معاشرت اور کسانوں کی سماجی پستی اور معاشی بدحالی کو اس عہد کے سیاسی حالات کے پس منظر میں پیش کیا۔ اسی طرح ناول ''چوگان ہستی'' میں انھوں نے گاؤں اور شہر کی زندگی پر سرمایہ دارانہ نظام اور صنعتی عہد کے مضر اثرات کی عکاسی کی ہے۔ ناول ''نرملا'' کے ذریعہ بے جوڑ شادیوں کے مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور ''پردہ مجاز'' میں کسانوں کے استحصال اور ظلم و ستم کے خلاف ان کے اتحاد اور اجتماع کو موضوع بنایا۔ پریم چند کا ایک مشہور ناول ''غبن'' ہے جو ایک گھریلو سماجی ناول ہے جس میں زیورات کے شوق کے خراب نتائج بیان کئے گئے ہیں۔

پریم چند کا پورا سرمایہ ان کے گہرے سماجی نظریات اور سیاسی شعور سے بھرپور ہے۔ جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ پر امن اصلاحی کوششوں کے ذریعہ سماج کو نہیں بدلا جا سکتا۔ لہٰذا ایسی صورت میں

پریم چند نے ''میدان عمل'' اور ''گئو دان'' کے ذریعہ جبر واستحصال کے خلاف جدوجہد کرنے کی راہ دکھائی اور موجودہ نظام حیات کو ہر ممکن طریقے سے بدلنے کی تلقین کی۔ ''میدان عمل'' میں انھوں نے جبر واستحصال کے خلاف کسانوں اور مزدوروں کو جدوجہد کرنے کی طرف راغب کیا ''گئو دان'' میں کسانوں اور مزدوروں کی زندگی کے ہر پہلو پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ناول ''گئو دان'' انسان دوستی اور اشتراکیت کی بہترین مثال ہے۔

اردو ناول کی تاریخ میں قاضی عبدالغفار کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنے ناول ''لیلیٰ کے خطوط'' کے ذریعہ عورتوں پر ہونے والے ظلم وستم کی داستان بیان کی ہے۔ اسی طرح ناول ''مجنوں کی ڈائری'' میں انھوں نے ہندوستانی نوجوانوں کے سماجی، تہذیبی اور اخلاقی زوال کی داستان بیان کی ہے۔

پریم چند کے بعد اردو ناول نگاری میں جو نئی پود سامنے آئی وہ ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھتی ہے۔ دراصل بیسویں صدی کے ربع اول سے ہی بعض ناول نگاروں میں مذہبی وسماجی روایتوں سے بے اطمینانی کے آثار ملنے شروع ہوئے تھے جو ربع ثانی میں زیادہ نمایاں شکل اختیار کر لیے۔ چنانچہ ان حالات میں یعنی 1936 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ ترقی پسند تحریک کا مقصد جبر و استبداد، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، انفرادی اجارہ داریوں کا خاتمہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جنگ تھا۔ اس طرح سے ترقی پسند تحریک کے ذریعہ روایت سے بغاوت کی بنیاد پڑی۔ ادب محض لذتیت اور تفریح کا ذریعہ نہ رہا۔ اور ایسے ادب کو ترجیح دی جانے لگی جو عوام کے فلاح و بہبود کے لیے ہو۔ یہ ایک اعلیٰ سماجی مقصد تھا جس کے رشتے امن پسندی اور انسان دوستی سے ملتے ہیں۔ اس تحریک کے زیر اثر لکھنے والوں نے ماضی کے کلچر اور انسانی تہذیب کی بہترین روایات کو سماج کے تاریخی پس منظر میں

آگے بڑھایا۔

ان نظریات اور خیالات کی روشنی میں ''گئودان'' کے بعد جو اہم ناول لکھے گئے ان میں سجاد ظہیر کا ناول ''لندن کی ایک رات'' عزیز احمد کا ''گریز'' عصمت چغتائی کا ''ٹیڑھی لکیر'' کرشن چندر کا ''شکست'' وغیرہ اہم ہیں۔ ان سبھی ناول نگاروں نے حقیقت نگاری سے کام لیا۔ سجاد ظہیر کا ناول ''لندن کی ایک رات'' نوجوان طبقہ کے ذہنی انتشار کی عکاسی کرتا ہے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ساری دنیا میں پھیل گیا تھا۔ اس طرح سے انھوں نے اپنے عہد کی پوری سیاست کو سمو دیا ہے۔ سجاد ظہیر کے بعد عصمت چغتائی ترقی پسند ناول نگاروں میں اس حیثیت سے انفرادیت کی حامل ہے کہ انھوں نے مسلم متوسط گھرانوں کی پردہ نشین لڑکیوں کی نفسیاتی الجھنوں سے پیدا ہونے والے مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ عصمت نے اپنے ناولوں میں خاص طور پر جس پہلو پر زور دیا ہے وہ جنس ہے لیکن جنسی معاملات کے بیان میں کہیں پر بھی لذتیت کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ متوسط گھرانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کی گھٹی ہوئی نفسیاتی کیفیت کو پیش کرے تاکہ پردہ کے پیچھے پیدا ہونے والے تمام جرائم منظر عام پر آسکیں اور پڑھنے والا سبق حاصل کرے۔

کرشن چندر نے اپنے ناولوں میں سماج میں تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں اور نوجوانوں کے ذہنوں پر ہونے والے نئے اثرات کو موضوع بنایا ناول ''شکست'' کے ذریعہ کرشن چندر نے ایک طرف اس دور کی زندگی کے کرب کو پیش کیا ہے تو دوسری طرف طبقاتی کشمکش اور جاگیردارانہ استحصال کی مخالفت و بغاوت بھی کی ہے۔

اسی طرح عزیز احمد نے بھی جاگیردارانہ اور متوسط طبقہ و سماج میں انسان کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا۔ ان کے ناولوں میں ''مرمر اور خون''، ''گریز'' اور ''آگ'' اہم ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں

کی مدد سے اپنے عہد کی تہذیب وتمدن اور تاریخ کو پیش کیا ہے اور دولت مندوں جاگیرداروں کی گھناؤنی زندگی کا بیان بھی ہمیں ان کے ناولوں میں ملتا ہے۔غرض عزیز احمد نئے نئے موضوعات کو لے کر اردو ناول نگاری میں اور ترقی پسند حقیقت نگاری کے حوالے سے اپنے ہم عصر ناول نگاروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں چنانچہ سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور عزیز احمد وغیرہ نے اردو ناول کے دامن کو بے حد وسیع کیا۔ سجاد ظہیر کی علمیت، کرشن چندر کی بے باکی و حقیقت نگاری اور عصمت کے ناولوں میں عورتوں کی سچی تصویریوں نے اردو ناول کی کایا پلٹ دی۔

ترقی پسند تحریک کے ان نمائندہ ناول نگاروں کے علاوہ تقسیم سے پہلے چند ایسے ناول نگار بھی ہیں جنہوں نے عصری مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا جیسے، صالحہ عابد حسین، اے آر خاتون، فاطمہ مبین اور حمیدہ سلطانہ وغیرہ اہم ہیں۔ عصمت چغتائی کے بعد عام گھریلو زندگی کی مصوری کرنے میں جو کامیابی صالحہ عابد حسین کو حاصل ہوئی ہے اس کی مثال مشکل سے ہی دوسری خاتون ناول نگاروں کے یہاں مل سکتی ہے وہ صرف گھریلو فضا ہی کو پیش نہیں کرتیں بلکہ معاشرے اور زندگی کے پیچیدہ مسائل اور سیاسی اثرات وغیرہ کو بھی اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔

1947ء میں ہندوستان نے آزادی حاصل کر لی لیکن ہزار ہا برس کی تہذیبی روایات کو خون سے نہلا کر اور مشترکہ کلچر کے تصورات کو دفن کر کے ہندوستان کے باشندوں کو اسے حاصل کرنا پڑا۔ دو قومی نظریوں کے تحت ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا جہاں 1947ء کا سال ہندوستان کے لئے فخر و سربلندی کا ہے وہیں انتہائی شرمناک بھی ہے۔ اس تقسیم کو لے کر سارے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے اور ہندوستان کے تمام شہری ہندو مسلمان عیسائی اور سکھ الگ الگ خانوں میں بٹ گئے انسان کوئی نہ رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو 1857ء سے کہیں زیادہ مصائب کا

سامنا 1947ء اوراس کے بعد کے چند برسوں میں کرنا پڑا۔ آزادی کے بعد سارے ملک میں ریاستوں، جاگیروں، زمینداروں کا خاتمہ ہوا جس کے نتیجہ میں سارا جاگیردارانہ طبقہ اور متوسط طبقہ اس کی زد میں آگیا کیونکہ متوسط طبقے اور غریب طبقوں کی معاشی زندگی خاصی بڑی حد تک ان والیان ریاست جاگیرداروں اور زمینداروں کے ساتھ وابستہ تھی۔ اس لئے اس تباہی کی زد میں بہت سے لوگ آ گئے۔ غرض اسی قسم حال کا سرکاری ملازم پیشہ، تاجر اور صنعت کاروں کا بھی ہوا۔ جہاں تک غریب اور محنت کش طبقوں کی زندگی کا سوال ہے، اس پر ملک کی تقسیم کا اثر ایک لحاظ سے زیادہ پڑا۔ ان میں بہت سے خاندان بٹ گئے بھائی بھائی سے، باپ بیٹے سے، ماں بیٹی سے اور کہیں کہیں بیوی میاں سے بچھڑ گئی۔ معاشی بدحالی کی وجہ سے عام طور پر وہ ایک دوسرے کے شادی بیاہ، موت وزندگی میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ غرض دونوں مما لک میں بہت عرصہ تک مایوسی اور افسردگی کی فضاء چھائی رہی۔ اخلاقی قدروں میں کمی آ گئی۔ لوگوں کے درمیان جذباتی خلفشار و اتحاد، محبت و خلوص، مروت و شرافت اور مشترکہ تہذیب کے مٹنے کا احساس شدید صورت میں ظاہر ہوا۔

تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والی اس صورت حال سے متاثر ہو کر اس دور میں جس تیزی سے اردو میں ناول لکھے گئے شاید ہی پہلے کبھی لکھے گئے ہوں۔ اس دور میں لکھے گئے تقریباً تمام ناول جہاں ایک طرف قارئین کو گہرے شعور اور تجربات سے روشناس کراتے ہیں وہیں دوسری طرف بھٹکے ہوئے ذہنوں کو تفریح کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔ تقسیم کے بعد فسادات کے واقعات کو صرف مقبول ناول نگار ہی موضوع نہیں بنائے بلکہ دیگر ناول نگار بھی اپنے ناولوں میں اس تقسیم کے المیہ کو اور اس کے نتیجہ سے پیدا ہونے والے دیگر مسائل کو بھی خاص موضوع کے تحت برتا جیسے، ایم اسلم کا ''رقص ابلیس'' رشید اختر کا ناول ''15 اگست''، قیسی رامپوری کا ''خون'' بے آبرو، فردوس، رئیس احمد کا ناول ''مجاہد''

وغیرہ تقسیم کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے خوں چکاں حالات کو پیش کرتے ہیں لیکن ان حالات پر سب سے پہلے قلم اٹھانے والے ''رامانند ساگر'' ہیں۔ انھوں نے تقسیم ہند کے موضوع پر ناول ''اور انسان مر گیا'' کے ذریعہ لوگوں کے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ان تمام ناول نگاروں کے علاوہ تقسیم کے بعد تین ناول نگار ایسے ہیں جو اس موضوع پر قلم اٹھا کر بہت مقبول ہوئے۔ قرۃ العین حیدر نے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' لکھا ''عزیز احمد'' نے ''ایسی بلندی ایسی پستی'' اور احسن فاروقی نے ''شام اودھ'' ان تینوں ناولوں کے ذریعہ مجموعی طور پر ایک دور اور ایک تہذیب کے ختم ہونے کا بھرپور جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ بظاہر ان تینوں ناولوں میں راست طور پر فسادات یا ہندوستان کی تقسیم کو موضوع نہیں بنایا گیا لیکن یہ ناول فکر انگیز طریقے سے ہندوستان کے معاشرے کی تبدیلی اور اس کے نتائج کو پیش کرتے ہیں، معاشرے کی یہ بدلتی ہوئی صورت حال اقتصادی، سماجی اور سیاسی نظام کو متاثر کر رہی تھی چنانچہ ان تینوں ناول نگار نے اپنے گذرے ہوئے کل کے روشن اور تاریخ دونوں پہلوؤں کو سامنے لاتے ہوئے اپنے عہد کا جائزہ لیا۔

قرۃ العین کا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' جو اپنے فنی لوازم کے ساتھ ناول نگاری میں ایک نئی تکنیک شعور کی رو کا اضافہ کرتا ہے۔ اس ناول میں اودھ کی دم توڑتی ہوئی مشترکہ تہذیب بھی ہے اور آزادی حاصل کرنے کی تڑپ اور جدوجہد بھی ہے یہ ناول جہاں فرقہ پرستی کی مخالفت کرتا ہے وہیں طبقاتی کشمکش کا احساس بھی دلاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر اپنے ناول ''میرے بھی صنم خانے کے بعد'' سفینۂ غم دل، اور آگ کا دریا، لکھا ان تینوں ناولوں کا موضوع ایک ہی ہے لیکن انھوں نے اس موضوع کو جس فنی مہارت اور خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اسکی دوسری مثال اردو ناول نگاری میں کم ہی ملتی ہے۔

تقسیم کے بعد ابھرنے والے حالات واقعات کو قرۃ العین حیدر کے بعد عزیز احمد نے ناول ''ایسی

بلندی ایسی پستی''میں موضوع بنایا ہے۔ناول کی پوری فضا حیدرآباد کی زندگی ہے۔ جس میں انھوں نے حیدرآباد کی تہذیب اوراس کی تبدیلیوں کوپیش کیا ہےلیکن اس ناول کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ناول سے صرف ایک تہذیب، ایک تمدن اوراس تمدن وتہذیب کے پروردہ انسانوں ہی سے واقفیت نہیں ہوتی بلکہ پوری انسانیت سے واقفیت بڑھ جاتی ہے۔ویسے یہ ناول ایسے وقت میں لکھا گیا جب ہندوستان آزادی کے بعد نئے مسائل سے دوچار ہورہا تھا۔ہندوستان کے شمالی حصوں میں تقسیم ہند کے اثرات سے عام زندگیوں میں انتشار سا آ گیا تھااور ہر جگہ تہذیب اور انسانیت کا خون ہورہا تھا لیکن حیدرآباد میں یہاں کے امرااورعوام ملک کے سیاسی حالات سے اتنے باخبر نہیں تھے جیسے حیدرآباد شہر کے کشن پلی اور فرخندہ نگر کی عوام مغرب کے پس منظر میں حیدرآباد کی سماجی زندگی اور مغربی اثرات میں پرورش پانے والی تہذیب اور سماجی زندگی کو کرداروں کے حرکات وعمل سے بڑے فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔

احسن فاروقی کا ناول ''شام اودھ'' بھی قرۃ العین حیدر کے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' کی طرح اودھ کی ڈوبتی ہوئی تہذیب اورزوال آمادہ قدروں کوموضوع بنایا گیا ہے۔جس پر ہمدردیوں اور حسرتوں کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔

1947ء کے بعد بیشتر ناول ایک طرف ماضی اور خاص طور پرزوال آمادہ جاگیردارانہ نظام اور انگریزی سامراجیت کے عہد کا احاطہ کرتے ہیں تو دوسری طرف تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد معاشرے میں ابھرنے والے اہم عصری مسائل پیش کرتے ہیں۔تقسیم کے بعد قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، احسن فاروقی کے علاوہ اور بھی کئی اہم ناول نگار ہیں جن کے ناولوں کا موضوع زیادہ تر تقسیم اور فسادات رہا ہے جیسے علی عباس حسینی، شوکت صدیقی، حیات اللہ انصاری، عبداللہ حسین، قاضی عبدالستار،

انتظار حسین، ممتاز مفتی، جمیلہ ہاشمی، رضیہ سجاد ظہیر، خواجہ عباس، کرشن چندر، اختر اورینوی، اوپندر ناتھ اشک، رضیہ فصیح احمد، صالحہ عابد حسین وغیرہ۔

علی عباس حسینی کا ناول ''شاید کے بہار آئی'' دیہی زندگی سے وابستہ کسانوں اور مزدوروں کی معاشی دقتوں کی عکاسی کرتا ہے ان کا دوسرا اہم ناول ''زیتوں کا بادشاہ حکیم بانا'' جو جاگیردارانہ سوسائٹی میں موجود صورتِ حال کی عکاسی کرتا ہے۔ شوکت صدیقی کا ناول ''خدا کی بستی'' تقسیم ہند کے بعد زندگی کے درہم وبرہم ہوئے نظام پر روشنی ڈالتا اور ان کا دوسرا ناول ''جانگلوس'' پاکستان کے دیہی معاشرے کے مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔ حیات اللہ انصاری کا ناول ''لہو کے پھول'' جس کا شمار تقسیم ہند پر لکھے گئے ضخیم ناولوں میں ہوتا ہے جس میں شمالی ہند کے ۱۹۱۱ء تا ۱۹۵۵ء تک کے سماجی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کی کہانی ملتی ہے، عبداللہ حسین کا ناول ''اُداس نسلیں'' پہلی جنگ عظیم سے لے کر تقسیم ہند تک کے حالات پر روشنی ڈالتا ہے اور جاگیردارانہ نظام میں کسانوں اور مزدوروں کی زندگی کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ قاضی عبدالستار'' اپنے ناول، '' شب گزیدہ'' میں طبقاتی کشمکش اور سماجی رسم ورواج مذہبی عقائد کے ساتھ ساتھ جنگ آزادی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کا دوسرا ناول ''پہلا اور آخری خط'' اودھ کی مٹتی ہوئی تہذیب کے ساتھ ساتھ مسلمان تعلقہ داررں کے سیاسی اور سماجی نظم ونسق اور ان کی زندگی پر روشنی ڈالتا ہے۔

تقسیم کے بعد کرشن چندر کے ناول بھی قابل ذکر ہیں ن کے ناولوں میں فرد اور جماعت کے مسائل، جذباتی واخلاقی رشتوں سے پیدا شدہ مسائل ملتے ہیں اس کے علاوہ کشمیری عوام، جاگیرداری اور سرمایہ داری کی لعنتیں، جاگیردارانہ سماج میں پسماندہ عوام کی کشمکش، قدیم ہندوستان میں مروجہ ذات پات کی بندش وغیرہ بھی ان کے ناولوں کے اہم موضوعات ہیں، ان کے ناول جیسے ''جب کھیت جاتے''

ایک گدھے کی سرگذشت، باول پتے وغیرہ مذکورہ بالا تمام مسائل پر مبنی ہیں۔

انتظار حسین نے اپنے ناول ''چاند گہن'' کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کی داستان حیات کا المیہ بیان کیا ہے اور ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ فسادات، قتل و غارت گری، لوٹ مار، وغیرہ کی کرب ناک تصویریں پیش کی ہیں۔ اسی طرح اوپندر ناتھ اشک کا ناول ''گرتی دیواریں'' مردوں کے ظلم اور عورتوں کے استحصال پر روشنی ڈالتا ہے، ممتاز مفتی کا ناول ''ایلی پور کا ایلی'' انسانی زندگی کے جنسی پہلوؤں کے بعض گوشوں کو بڑے لطیف انداز میں پیش کرتا ہے، 1947ء کے بعد خاتون ناول نگاروں میں، جمیلہ ہاشمی، صالحہ عابد حسین، رضیہ فصیح احمد، رضیہ سجاد ظہیر وغیرہ نے خالص سماجی مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا جیسے رضیہ فصیح کے ناول آبلا پا'' انتظار موسم گل'' اک جہاں اور بھی ہے، جس میں خالص سماجی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اسی طرح رضیہ سجاد ظہیر کا ناول ''سمن'' اپنے دور کے حالات لوگوں کی ذہنیت اور معاشرے کی روداد، ہماری ثقافتی زندگی کی پستی و بلندی پر روشنی ڈالتا ہے صالحہ عابد حسین نے اپنے ناول ''قطرے سے گہر ہونے تک'' راہ عمل یادوں کے چراغ، اپنی اپنی صلیب، وغیرہ میں زندگی کے اعلیٰ اقدار کی علم بردار اور زندگی کے کئی مسائل کو نہایت باریک بینی سے پیش کیا ہے اسی طرح اختر اورینوی نے اپنے ناول ''حسرت تعمیر'' کے ذریعہ غریب اور پسماندہ طبقہ کے مسائل پر روشنی ڈالی۔

1960ء تا 1980ء کا عہد اردو ناول نگاری کے لیے روایت اور جدت کی باہمی آمیزش کا دور کہلاتا ہے یہ وہ دور ہے جس میں شکست و ریخت کے بعد تہذیبی، سماجی اور سیاسی سطح پر معاشرے کی نئی تعمیر و تشکیل کی جارہی تھی۔ جہاں پر نفسیاتی سطح پر ماضی کے احتساب اور اس سے پیدا شدہ کرب بھی ملتا ہے، غرض اس عہد میں بھی اردو کے بیشتر نمائندہ ناولوں کے موضوعات بھی تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والے حالات ہی رہے جیسے جاگیردارانہ طبقہ کا زوال اور ان کے مسائل، مشترکہ تہذیب کا زوال،

تحریک آزادی، تقسیم ہند، فسادات، ہجرت، مہاجروں کے مسائل وغیرہ لیکن 1960ء کے بعد لکھنے والے ناول نگاروں نے ان نمائندہ عصری مسائل کے علاوہ، عورتوں کی سماجی حیثیت اوران کے مسائل، جسم فروشی وفحاشی، نفسیات اورجنس، و بے اعتنائی وغیرہ اہم مسائل کوموضوع بنایا۔

1960ء کے بعد ''جیلانی بانو'' جاگیردارانہ طبقہ کے مسائل کوناول ''ایوان غزل'' کے ذریعہ پیش کیا۔ناول ''ایوان غزل'' حیدرآباد کے جاگیر دارانہ وآمرانہ شاہی نظام کے زوال کی کہانی ہے مصنفہ نے اس ناول میں دوسری جنگ عظیم سے لے کر سقوطِ حیدرآباد تک کے دور کوموضوع بنایا ہے، جس میں حیدرآبادی روساء کی عیاشیوں کمزوریوں پر مظالم وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اسی طرح اس عہد میں تحریک آزادی کوموضوع بنا کر ''جمیلہ ہاشمی نے ''تلاش بہاراں'' اورخدیجہ مستور نے ''آنگن'' اورقرۃ العین حیدر نے ''آخر شب کے ہم سفر'' لکھا تحریک آزادی کی جھلک ہمیں ''ایوان غزل'' میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ جمیلہ ہاشمی کا ناول ''تلاش بہاراں'' تقسیم سے پہلے کی اسی مشترکہ تہذیب کی عکاسی کرتا ہے، خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' کا تعلق راست طور پر تحریک آزادی سے نہیں ہے لیکن اس ناول میں جس عہد اور جس معاشرت اور حالات کوموضوع بنایا گیا ہے وہ تحریک آزادی کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ ناول یوپی کے ایک متوسط مسلم گھرانے کے ایک ایسے خاندان کی سرگذشت ہے جو سارے ملک کی سرگذشت معلوم ہوتی ہے کیوں کہ سارے ملک میں وقوع ہورہے واقعات خصوصاً تحریک آزادی اور انگریزوں کے جابرانہ رویئے سے پیدا شدہ مسائل کو بالواسطہ طور پر اس خاندان کے حوالے سے اس ناول میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس ناول کو ہم تحریک آزادی کے پس منظر میں ہندوستان کے مخصوص خطے کی معاشرت اوراس کے مختلف پہلوؤں کا مرقع بھی کہہ سکتے ہیں۔

تحریک آزادی کی جھلک ہمیں اس عہد میں قرۃ العین حیدر کا ناول ''آخری شب کے ہمسفر'' میں

بھی دکھائی دیتی ہے۔ یوں تو ان کے تمام ناولوں میں تحریک آزادی کی جھلک موجود ہے، انہوں نے اپنے ناولوں میں مخصوص طبقاتی نقطہ نظر سے اس تحریک کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے جیسے ''آخر شب کے ہمسفر'' میں انہوں نے تحریک بنگال کے پس منظر میں پیش کیا ہے اسی طرح ''ایوان غزل'' میں بھی تحریک آزادی کی جھلک موجود ہے۔ اس میں جیلانی بانو نے اس تحریک کو حیدرآباد کے مقامی حالات کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور تحریک آزادی کے جلو میں پیدا ہوئی نئی سیاسی بیداری کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔

تحریک آزادی کی طرح اس عہد کے نمائندہ ناولوں کا ایک اہم موضوع تقسیم ملک بھی رہا ہے جیسے ناول ''آخر شب کے ہمسفر'' میں جگہ جگہ ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے تقسیم ہند کے اسباب کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح ناول ''آنگن'' بھی تقسیم پر آ کر ختم ہوتا ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ اُس عہد کے ہندوستان کی دو بڑی سیاسی جماعتوں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ کی کش مکش کے ذریعہ کس طرح تقسیم کے لیے فضا تیار ہو رہی تھی۔ جمیلہ ہاشمی کا ناول ''تلاش بہاراں بھی اس ضمن میں قابل ذکر ہے، جس میں تقسیم ہند کا حادثہ ایک المیہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

تقسیم ہند کے نتیجے میں پھوٹ پڑے فسادات بھی اس عہد کے ناولوں کا موضوع رہے جیسے ناول ''ایوان غزل''، جس میں تقسیم ملک کے وقت پورے ملک میں پھیلے فسادات کی لہر اور اس کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے ناول کا موضوع حیدرآباد تک ہی محدود ہے، لیکن حیدرآباد تقسیم ہند کی وجہ سے پھیلے فسادات سے محفوظ تھا چنانچہ شمال کے صوبوں سے کئی لوگ پناہ لینے کی غرض سے حیدرآباد کا رخ کر رہے تھے اسی طرح سے ''تلاش بہاراں'' اور ''آنگن'' میں بھی فسادات کی جھلک ملتی ہے ''تلاش بہاراں'' کا اختتام ہی فسادات کے المناک واقعات پر ہوتا ہے ناول ''آنگن'' میں تقسیم کے جلو میں آئے۔ فسادات

اور خوں ریزی کا ذکر بے حد کرب کے ساتھ ملتا ہے۔

تقسیم اور فسادات کا فوری نتیجہ ہجرت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ بڑے پیانے پر مسلمانوں نے ہندوستان سے ہجرت کی اور ہندو نے پاکستان سے ہندوستان ہجرت کی، جس سے دونوں ممالک کی معاشرتی زندگی راست طور پر متاثر ہوئی، چنانچہ اس عہد میں اس ہجرت کو لے کر پیدا ہونے والے مسائل کی عکاسی، ''آنگن'' کرتا ہے۔ تقسیم ہند کو لے کر پیدا ہونے والے ان واقعات کے علاوہ اس عہد دیگر نمائندہ مسائل میں کسانوں اور مزدوروں کے مسائل، عورتوں کی سماجی حیثیت اور ان کے مسائل، جسم فروشی وفحاشی، نفسیات اور جنس، نسلی مسائل، غیریبی ومفلسی، مادیت پرستی وبے اعتنائی وغیرہ ہیں کسانوں کے مسائل پر، اس عہد میں ''راجندر سنگھ بیدی'' کا ناول ''ایک چادر میلی سی'' قابل ذکر ہے جس میں دیہی اور قصباتی زندگی کے مسائل کی عکاسی کی گئی ہے اس طرح کسانوں اور محنت کشوں کی بیداری کی جانب ''ایوان غزل'' میں بھی اشارے ملتے ہیں عورتوں کی سماجی حیثیت اوران کے مسائل کو اس عہد میں ''ایوان غزل' 'ایک چادر میلی سی'' ''معصومہ'' ''تلاش بہاراں'' ''آنگن' وغیرہ ناولوں میں ایک اہم موضوع بنایا گیا ہے ''ایوان غزل'' میں جاگیر دارانہ معاشرت اور ماحول میں عورت کی حیثیت اوران کی زندگی کے مسائل کی عکاسی کی گئی، راجندر سنگھ بیدی نے ناول ''ایک چادر میلی سی'' کے ذریعہ عورت کی عظمت کو بیان کیا ہے کہ عورت صدیوں سے مردانہ، ذلت اور محرومی کا شکار ہونے کے باوجود شوہر کی محبت، ممتا ہمدردی اور دردمندی کا پیکر ہے۔ جو اپنا سب کچھ لوٹا کر بھی بیوی، ماں، بننے کی تکلیف کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں کرتی، غرض بیدی نے اس ناول میں ہندوستانی معاشرے میں عورت کی حیثیت اوراس کے مسائل کی طرف جگہ جگہ اشارے کیے ہیں، عورتوں کے استحصال اوران کے مسائل کی عکاسی عصمت چغتائی کے ناول ''معصومہ'' میں بھی ملتی ہے جس میں ''معصومہ'' کی مجبوری کا فائدہ

اٹھا کر مرد اسے اپنے جسم اور پیٹ دونوں کی آگ بجھانے کا ذریعہ بتاتے ہیں ناول ''آنگن'' میں بھی عورتوں کی زندگی کو اور ان کے مسائل کو متحدہ ہندوستان کی زوال آمادہ جاگیردارانہ معاشرے کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔

جسم فروشی وفحاشی کے مسئلے پر بھی اس عہد کے کچھ ناول نگاروں نے سنجیدگی سے روشنی ڈالی ہے، جیسے کرشن چندر ''ایک عورت ہزار دیوانے'' کے ذریعہ ایک خانہ بدوش لڑکی کی زندگی کو بیان کیا ہے جس میں اس کے ماں باپ ہر دن اس کو جسم فروشی پر مجبور کرتے ہیں اسی طرح کرشن چندر خانہ بدوش قبیلہ میں جسم فروشی کے رجحان پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ فحاشی وجسم فروشی کے ضمن میں عصمت چغتائی کا ناول ''معصومہ'' بھی اہم ہے جس میں ایک متوسط گھرانے کی لڑکی غریبی ومفلسی کی وجہ سے کال گرل بن جاتی ہے۔ غرض جسم فروشی کے مسئلہ پر ڈاکٹر علیم مسرور کا ناول ''بہت دیر کردی'' بھی قابل ذکر ہے جس میں مصنف نے اس مسئلہ پر باریک بینی سے روشنی ڈالی ہے۔

نفسیات وجنسی بھی اس عہد کا ایک نمائندہ مسئلہ رہا ہے جس کو عصمت چغتائی، بیدی، جمیلہ ہاشمی، علیم مسرور اور احسان الحق وغیرہ نے اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کا ناول ''ایک چادر میلی سی'' ایک بیوہ عورت رانو کی نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کرتا ہے جو حالات اور سماجی پابندیوں سے مجبور ہو کر اپنے دیور منگ کے ساتھ شادی کرتی ہے لیکن دونوں بھی اپنے اس نئے رشتہ کو ذہنی وجسمانی کسی بھی سطح پر قبول نہیں کرتے لیکن ایک دن شراب اور جنسی کے توسط سے اپنے اس نئے رشتہ کو مستحکم بناتے ہیں۔ اس عہد میں نفسیات اور جنس پر عصمت چغتائی کا ایک ناول ''معصومہ'' بھی اہم ہے جس میں ایک میڈل کلاس کی نوجوان لڑکی معصومہ کے طوائف بننے کی داستان ہے معصومہ اپنے باپ کی عمر کے بھدے اور نیم خواندہ سیٹھوں کے ہاتھوں کا کھلونا بن جاتی ہے جہاں اسے جنسی وجذباتی استحصال کا

سامنا کرنا پڑتا ہےاسی طرح اس موضوع کے سلسلے میں علیم مسرور کا ناول ''بہت دیر کردی'' بھی اہم ہے جس میں ایک مرد اور عورت کے جذباتی رشتوں سے پیدا شدہ جنسی الجھنوں کا احاطہ کیا گیا ہے احسان الحق نے بھی اپنے ناول '' کالا شہر گورے لوگ'' میں مشرقی و مغربی دونوں معاشرے میں تقابل کر اس جنسی حواس کے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

1960ء کے بعد ہمارے کچھ نمائندہ ناول نگاروں نے نسلی مسائل کو بھی اپنے ناولوں میں جگہ دی ہے۔ جیسے عزیز احمد کا ناول ''تیری دلبری کا بھرم'' قرۃ العین حیدر کا ناولٹ ''چائے کے باغ'' حیات اللہ انصاری کا ناول ''مدار'' اور احسان الحق کا ناول '' کالا شہر گورے لوگ'' وغیرہ۔ احسان الحق، ناول کالا شہر گورے لوگ'' میں خالد نامی ایک ہندوستانی کردار کے ذریعہ اس نسلی امتیاز کے مسئلہ پر روشنی ڈالی، خالد جو تعلیم کے سلسلے میں لندن میں مقیم ہے جس کو وہاں پر کالے اور گورے کے اس نسلی امتیاز کی وجہ سے کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اس عہد کے ناولوں میں غریبی و مفلسی بھی ایک اہم موضوع رہا ہے جیسے ''ایک چادر میلی سی'' ایوان غزل، تلاش بہاراں، بہت دیر کردی، گوری سوئے سیج پر، وغیرہ میں پیش کیا گیا ہے۔ ''ایک چادر میلی سی'' دیہی علاقہ کے لوگوں کی غریبی و مفلسی کی عکاسی کرتا ہے یعنی بعض اوقات دن بھر محنت کرنے کے بعد بھی وہ اپنی کمائی سے اپنے افراد خاندان کو دو وقت کا کھانا بھی نہیں دے پاتے۔ ناول ''ایوان غزل'' میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک شخص غریبی و مفلسی سے تنگ آ کر اپنی ذمہ داریوں سے کیسے فرار ہونا چاہتا ہے۔ اسی طرح ناول ''تلاش بہاراں'' میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غریبی و مفلسی میں انسان اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے خود کو بیچ سکتا ہے ناول '' بہت دیر کردی'' میں غریبی و مفلسی کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہوئے موجود معاشرے میں پھیلے متعدد بیماری کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ ناول ''گوری سوئے سیج پر'' میں بھی غریبی و

مفلسی کی وجہ مہنگائی بتائی گئی ہے چنانچہ اس عہد کے ان نمائندہ مسائل میں ایک اہم مسئلہ ''مادیت پرستی و بے اعتنائی ہے''، جس کو جیلانی بانو نے ''ایوان غزل'' اور صالح عابد حسین نے ''گوری سوئے سیج پر'' میں بڑے کرب کے ساتھ بیان کیا ہے۔

☆☆☆

کتابیات

ناول

ادارہ	سن اشاعت	مصنف	کتاب
نوہند پبلیشرز لمٹیڈ بمبئی	1947-48ء	رامانند ساگر	اور انسان مر گیا
9 گولا مارکٹ، دریا گنج، دہلی	1948	عزیز احمد	ایسی بلندی ایسی پستی
مکتبہ جدید لاہور	1959ء	قرۃ العین حیدر	آگ کا دریا
رسالہ بیسوی صدی، دہلی	1960	کرشن چندر	ایک عورت ہزار دیوانے
سرور امین پرنٹرز لاہور	1962ء	عبداللہ حسین	اداس نسلیں
مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی	1962ء	راجیند رسنگھ بیدی	ایک چادر میلی سی
ایڈیشن ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	2004	خدیجہ مستور	آنگن
ایڈیشن ایم آر پبلیکیشنز دہلی	2002ء	جیلانی بانو	ایوان غزل
علوی بک ڈپو، محمد علی روڈ بمبئی	1979ء	قرۃ العین حیدر	آخری شب کے ہمسفر
جے پی پرکاش پانڈے ہولی وارانسی	1981ء	علیم مسرور	بہت دیر کردی

تلاشِ بہاراں	جمیلہ ہاشمی	1981ء	اردو اکیڈمی سندھ کراچی
ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	1944ء	نصرت پبلیشرز
چاند گہن	انتظار حسن	1952ء	سنگ میل پبلیکیشنز لاہور
خدا کی بستی	شوکت صدیقی	1959ء	طارق پبلیشر لکھنو
راہِ عمل	صالحہ عابد حسین	1962ء	مکتبہ جامعہ دہلی
سیاہ سرخ سفید	آمینہ ابوالحسن	1968ء	نیشنل بک ڈپو حیدر آباد
شکست	کرشن چندر	1963ء	عارف پبلشنگ ہاؤس دہلی
غدار	کرشن چندر	1960ء	مشہور بک ڈپو گاندھی نگر دہلی، ۴۔ ایوان پبلشرز، نخاس کہنہ الہ آباد
کالا شہر گورے لوگ	احسان الحق	1978ء	ناو بستان جامعہ نگر دہلی
گئو دان	پریم چند	1939ء	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
گریز	عزیز احمد	1943	مکتبہ جامعہ نئی دہلی
گوری سوئے سیج پر	صالحہ عابد حسین	1977ء	ناولیستان جامعہ نگر دہلی
میرے بھی صنم خانے	قرۃ العین حیدر	1947ء	برقی پریس دہلی
معصومہ	عصمت چغتائی	2002ء	ایڈیشن کتابی دنیا دہلی

تنقیدی کتابیں

کتاب	مصنف	سن اشاعت	ادارہ
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین	2001ء	ایڈیشن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی
اردو میں ترقی پسند تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی	1979	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
اردو ناول سمت ورفتار	ڈاکٹر سید علی حیدر	1979ء	شبستان شاہ گنج الہ آباد
آزادی کے بعد اردو ناول	ڈاکٹر اسلم آزاد	1981ء	نکھار پبلیکیشنز یوپی
ادب اور زندگی	مجنوں گورکھپوری	1965ء	اردو گھر علی گڑھ
اصول سیاست	ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	1988	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر محمد ایمن انصاری	1981	نصرت پبلشرز لکھنو
اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی	ڈاکٹر شکیل احمد	1984ء	گورکھپور
اردو ناول پریم چند کے بعد	ڈاکٹر ہارون ایوب	1978ء	اردو پبلی کیشن لکھنو
اردو ناول نگاری	سہیل احمد بخاری	1960ء	لاہور

اردو فکشن کے ارتقاء میں عصمت چغتائی کا حصہ	ڈاکٹر محمد اشرف		نصرت پبلیشرز، لکھنو
اردو ناول اور تقسیم ہند	عقیل احمد	1987ء	موڈرن پبلیشنگ ہاؤس دہلی
اردو ناول کا نگار خانہ	کے کے کھلر	1983	سیمانت پرکاشن، نئی دہلی
اردو ناول میں خاندانی زندگی	فخر الکریم صدیقی	1984ء	نصرت پبلشرز لکھنو
اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ ،ابتداء سے 1947ء تک	صالحہ زرین	2000ء	سرسوتی پریس، الہ آباد
بیسویں صدی میں اردو ناول	ڈاکٹر یوسف سرمست	1995ء	ترقی اردو بیورو نئی دہلی
برصغیر میں اردو ناول	ڈاکٹر خالد اشرف	1995ء	ایجوکیشنل بک ہاؤس ،علی گڑھ
پریم چند فکروفن	ڈاکٹر قمر رئیس	1963ء	
پریم چند کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر قمر رئیس	1963ء	سرسید بک ڈپو علی گڑھ
پریم چند شخصیت اور کارنامے	قمر رئیس	1983ء	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر	قمر رئیس	2000ء	عاشور کاظمی
ترقی پسند اردو ناول	انور پاشا	1990ء	پیش رو پبلیکیشن دہلی
تنقیدی جائزے	احتشام حسین	1944ء	نفیس اکیڈیمی، حیدرآباد
تنقید اور عملی تنقید	احتشام حسین	1952ء	علی گڑھ
ترقی پسند ادب	عزیز احمد	1945ء	چمن بک ڈپو دہلی
جدید اردو ناول کا فن	سید محمد عقیل	1997ء	نیا سفر پبلکیشن الہ آباد
داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	1980ء	ایجوکیشنل ہاؤس علی گڑھ
رتن ناتھ سرشار حیات اور شخصیت کارنامے	پرم پال اشک	1928ء	
سرشار کی ناول نگاری	ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب	1966ء	انجمن ترقی اور کراچی
سیاست کے بنیادی اصول	ترجمہ تقی حیدر		دارالاشاعت، ترقی، ماسکو
سماج اور تعلیم	عبدالقادر عمادی	1977	
عبدالحلیم شرر بحثیت ناول نگار	علی احمد فاطمی	1986ء	نصرت پبلیکیشر لکھنو
عصمت چغتائی شخصیت اور فن	جگدیش چندر ودھان	1996ء	مہرہ پریس دہلی
قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ	ڈاکٹر ارتضی کریم	1992ء	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

قاضی عبدالغفار ایک ممتاز نثر نگار	خلیق انجم	1996	
کرشن چندر کے ناولوں میں ترقی پسندی	حیات افتخار	1982	سرفراز پریس، لکھنو
لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری کا خصوصی مطالعہ	پروفیسر امیر عارضی	1994	کلکتہ آفسٹ پریس دہلی
مرزا رسوا حیات اور اردو ناول نگاری	ڈاکٹر آدم شیخ	1968ء	نسیم بک ڈپو لکھنو
نذیر احمد شخصیت اور کارنامے	ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی	1976ء	اردو اکیڈمی اتر پردیش، لکھنو
ناول کا فن	ابوالکلام قاسمی	1978ء	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
ناول کیا ہے	نورالحسن ہاشمی	1976ء	نسیم بک ڈپو
ناول کی تاریخ اور تنقید	علی عباس حسینی	1944ء	انڈین بک ڈپو لکھنو
نذیر احمد کی ناول نگاری	ڈاکٹر اشفاق محمد خان	1979ء	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی
ہندوستانی سماج ساخت اور تبدیلی	ضیاءالدین احمد	1998ء	
ہندو پاک میں اردو ناول	ڈاکٹر انوار پاشا	1992ء	پبلیش رو پبلی کیشنز نئی دہلی

انسائیکلوپیڈیا اور لغات

کتاب	مصنف	سن اشاعت	ادارہ
علمی اردو لغت	وارث سرہندی	1983ء	علمی کتاب خانہ، لاہور
اعجاز للغات	بک کارپوریش	2004ء	بک کارپوریشن، دہلی
جامعہ اردو انسائیکلو پیڈیا جلد سوم		2002ء	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی
فرہنگ آصفیہ	خاں صاحب مولوی سید احمد دہلوی (جلد اول)	پہلا ایڈیشن 1974ء	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی
فیروز اللغات	الحاج مولوی فیروز الدین	2006ء	عفیف پرنٹرس دہلی
فرہنگ سیاسات	محمد محمود فیض حسن علی جعفری	1984ء	ترقی اردو بیورو نئی دہلی

☆☆☆